پانی میں گھرا پانی

اور منشا یاد کے دوسرے افسانے

جلد اول

انتخاب : محمد حمید شاہد

ترتیب

پہلی بات

منشا یاد کے یہ پچپن افسانے، عین اس ترتیب میں ہے،جس طرح کہ میرے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک پر محفوظ تھے۔

منشا یاد نے یہ افسانے مختلف اوقات میں مجھے ای میل کیے۔ اپنی حیات کے آخری برسوں میں وہ اپنے افسانوں کو نئے سرے سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ اشاعتی اداروں

سے ان کی کتب کے نئے ایڈیشنز کی بات چیت چل رہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ناشران کو دینے سے پہلے، انہیں ایک بار دیکھ لیا جائے اور جہاں جہاں ممکن ہو رد و بدل بھی کر لیا جائے۔ ایک بار منشا یاد نے اس بارے میں مجھ سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسا کرنے میں کوئی خرابی تو نہ ہو گی۔ مجھے اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ میں نے تو کہہ دیا یہ ان کا حق ہے، ہاں بس ان تبدیلیوں کا اعلان ہر نئے ایڈیشن میں کر دیں تو مناسب ہو گا۔

اپنے افسانوں میں یہ تبدیلیاں وہ اپنے کمپیوٹر پر بیٹھ کر کرتے اور کبھی کبھار،نیا افسانہ مکمل کرنے کے بعد، مجھے ای میل کر دیتے۔ یوں میرے پاس منشا یاد کے افسانوں کی ان پیج نقول کا جو ذخیرہ موجود تھا اسے میں نے آپ کو فراہم کر دیا ہے۔ یہ افسانے اگرچہ ان کی مختلف کتب میں موجود ہیں، تاہم یہ اس محبت اور اس خاص تعلق کی نشانی بھی تو ہیں جو ہم دونوں کے درمیان تھا اور ہمیشہ رہے گا۔

محمد حمید شاہد

یکم جون ۲۰۱۲، اسلام آباد

آدم بو

جب سے ساتھ والے گاؤں میں نوجوان مولوی منظور درس گاہ سے فارغ التحصیل ہو کر آیا ہوا ہے مولوی اللہ رکھا کی راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔

اور اگرچہ ان کے شاگرد، نائب اور خدام ان کی ہمت بڑھاتے اور اس کل کے چھوکرے کا مکو ٹھپ دینے کی یقین دہانیاں کراتے رہتے ہیں لیکن انہیں اپنا ستارہ گردش میں نظر آتا ہے اور اگرچہ مولوی منظور نے ابھی تک ان کے خلاف زبان نہیں کھولی مگر انہیں یقین ہے کہ وہ اس کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے اور مناسب موقع پا کر ضرور ان سے اپنے باپ کا بدلہ لے گا جس کے خلاف انہوں نے فتوٰی دیا اور اسے بڑی مسجد سے بے دخل کرایا تھا۔ ویسے بھی نوجوان مولوی جس قسم کے خیالات کا پرچار کر رہا ہے اور جس طرح عام لوگوں اور کمی کاریوں میں مقبول ہوتا جا رہا ہے وہ ان کے لئے کسی بڑے خطرے کی علامت ہے۔ انہیں اپنے برسوں کے تجربے اور سرکردہ لوگوں سے گہرے تعلقات کی وجہ سے اعتماد ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ سوچ کر ہول آتا ہے کہ پتہ نہیں نوجوان مولوی درسگاہ سے کیا کیا نئی باتیں سیکھ کر اور کس سانچے میں ڈھل کر آ گیا ہو اور اسے جوعلم کا جن چمٹا ہوا ہے وہ کب تک چمٹا رہے اورشنید ہے کہ اب تو اس نے اپنے وعظ میں تاریخ، جغرافیے اور کتنی سائنس کی باتیں شامل کرنا بھی شروع کر دی ہیں۔

مولوی اللہ رکھا کے احباب اور خیر خواہوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ وقتی اور ہنگامی ہے۔ جونہی نوجوان مولوی کے پاؤں زمین پکڑیں گے وہ اپنے آپ میں آ جائے گا۔مگر مولوی اللہ رکھا کی تشفی نہیں ہوتی انہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ خود ایک بار پھر سے پیدا ہو کر اپنے مقابلے پرآ نکلے ہیں اور سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔

برسوں پہلے کی بات ہے۔

مولوی احمد دین کا پہلی بیوی سے ایک ہی لڑکا تھا۔ سوتیلی ماں کی گالیوں اور بدسلوکیوں سے عاجز آ کر وہ قصے کہانیوں میں پناہ لیتا لیکن پھر یہی قصے اور کہانیاں اس کے لئے عذاب الیم بن گئیں۔

گاؤں میں داخل ہونے یا باہر جانے کے لئے ایک ہی بڑا راستہ تھا اس راستے پر ایک بدصورت دیو ہر وقت بیٹھا آدم بو، آدم بو پکارتا رہتا تھا۔ لوگ اسے بڑا ملک کہتے تھے۔ وہ سچ مچ بہت بڑا تھا۔ اس کے سامنے جا کر ہاتھی سکڑ کر چوہے اور چوہے پدی بن جاتے تھے۔ دو تہائی گاؤں کا مالک اور لمبے چوڑے خاندان کا سربراہ۔ دیکھنے میں بھی ہیبت ناک۔ باسی گوشت کا پہاڑ۔۔ اس کی آواز اس کی شکل و صورت کی طرح مکروہ اور خوفناک تھی۔ اس کا جب اور جسے جی چاہتا بلوا لیتا۔غریب کسان، کمی کاری اور ان کے بچے اکثر بیگار میں پکڑے رہتے۔ کسی میں انکار کی جرأت نہیں تھی۔ انکار کی صورت میں وہ نہایت فحش گالیاں دیتا اور جوتے مار مار کر شکل بگاڑ دیتا تھا۔

چوریوں،ڈاکوں، رسہ گیریوں، قتلوں اور مقدموں سے فراغت پا کر اب وہ سارا دن ڈیرے میں بیٹھا حقہ گڑگڑاتا اور کمی کاریوں سے پاؤں دبواتا،مالش کراتا، چلمیں بھرواتا اور پنکھا جھلواتا رہتا تھا۔ اللہ رکھا کے ذمے اس کی تفریح طبع کا کام تھا۔ پتہ نہیں اس کی سمجھ میں کچھ آتا تھا یا نہیں مگر وہ اکثر اس سے سوہنا و زینی کا قصہ سنتا تھا۔ اسے دوسرا کوئی قصہ یا کتاب پسند نہیں تھی اور سوہنا و زینی کا قصہ اس نے اسے اتنی بار سنایا تھا کہ اسے خود زبانی یاد ہو گیا تھا۔ مگر بڑا ملک ہر دفعہ اتنی دلچسپی سے سنتا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار سن رہا ہو۔۔ وہ یہ قصہ سنا سنا کر تنگ آ گیا تھا اور انکار نہ کر سکنے کی اذیت میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ وہ بدبو جو اسے بڑے ملک کے جسم سے آتی تھی اب کتاب کے اوراق اور لفظوں سے بھی آنے لگی۔ قصہ پڑھتے پڑھتے اس کا دماغ بدبو سے بھر جاتا اور اسے متلی آ جاتی، وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف کو بھاگ جاتا، پھر فراغت پا کر دوڑتا ہوا آتا اور ایک کل کی طرح دوبارہ قصہ پڑھنے لگتا۔

کئی بار اس نے انکار کر دینا چاہا مگر بڑے ملک کا پیغام ملتے ہی وہ اپنے یا بڑے ملک کے مر جانے کی دعائیں مانگتا ہوا بھاگم بھاگ اس کے ڈیرے پر پہنچ جاتا اور اس وقت تک گلا پھاڑ پھاڑ کر قصہ گاتا رہتا جب تک کہ بڑا ملک خود ہی جمائیوں کے کئی گڑھے پھاند کر نیند کے کسی اندھے کنوئیں میں نہ گر جاتا۔

اس نے کئی بار اپنے باپ مولوی احمد دین سے اپنی تکلیف اور خوف کا اظہار کیا لیکن وہ بھی بے بس تھا۔اس نے کئی بار سوچا بڑے ملک کو قتل کر کے پھانسی لگ جائے مگر بڑے ملک کے سامنے جا کر اس کی گھگھی بندھ جاتی۔

پھر ایک روز وہ سوتیلی ماں کی بدسلوکیوں اور بڑے ملک کے جسم سے اٹھنے والی سڑاند سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ گیا اور سینکڑوں میل دور ایک دینی مدرسے کے درویش طالب علموں کی صف میں شامل ہو گیا۔

چند سال دینی، اخلاقی اور روحانی تعلیم حاصل کرنے اور درویشانہ زندگی گزارنے کی تربیت حاصل کر کے جب وہ درسگاہ سے نکلا تو اس کے سامنے زندگی کا بے حد وسیع میدان تھا۔ وہ ایک عالم با عمل تھا اور اس کا سینہ محبت،علم اور غمگساری کے جذبات سے لبریز تھا۔۔ وہ گاؤں آیا تو بڑا ملک اپنے ڈیرے میں تخت پوش پر موجود نہیں تھا۔ اس نے صدق دل سے اس کے لیے مغفرت کی دعا کی لیکن وہ گاؤں میں مستقل قیام نہ کر سکا اور دوبارہ عازم سفر ہوا۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا مگر گاؤں کے ان لوگوں کے درمیان،جن کے سامنے وہ بچپن میں ننگا پھرتا رہا تھا اور ان دوستوں اور ہم عمروں میں جن کے ساتھ تالابوں میں نہاتا، کبڈی کھیلتا، بیر توڑتا اور سوتیلی ماں سے مار کھاتا رہا تھا اسے اپنی خود کو منوانے اور اپنا مدعا بیان کرنے میں مشکل پیش آ سکتی تھی اور وہ صرف اپنا مدعا بیان نہیں کرنا چاہتا تھا وہ بہت کچھ بدل دینا،بہت کچھ تہہ و بالا کر دینا چاہتا تھا۔

مولوی اللہ رکھا نے اس نئے گاؤں میں آ کر واقعی بہت کچھ بدل ڈالا تھا۔ ان سے پہلے گاؤں کے نیم خواندہ امام مسجد نماز پڑھانے، بچے کے کان میں اذان دینے، بھیڑ بکری ذبح کرنے اور جنازہ پڑھانے کا معاوضہ لیتے تھے ہر فصل کے موقع پر دوسرے کمی کاریوں کی طرح بوہل میں ان کا بھی حصہ ہوتا۔ عید بقر عید پر وہ مسجد میں کپڑا بچھا دیتے اور عید کی نماز پڑھانے کے عوض لوگوں سے غلہ اور نقدی وصول کرتے۔ نماز پڑھا کر وہ قربانی کے جانوروں کو ذبح کرتے اور پھر چھوٹی اور بڑی کھالوں کے بیوپار میں الجھے رہتے۔ ان کا حکم تھا کہ انڈہ کھانے کے لئے اس پر بھی تکبیر پڑنا ضروری ہے کیونکہ اس میں بھی جان ہوتی ہے لوگ انہیں تین انڈوں پر تکبیر پڑھانے پر ایک انڈہ بطور معاوضہ دیتے کیونکہ صحیح طریقے سے تکبیر تو وہی پڑھ سکتے تھے۔ مگر مولوی اللہ رکھا نے یہاں آ کر ان سب قبیح رسموں اور روایتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ پرانے مولوی صاحب لاکھ چیختے چلاتے رہے اور طرح طرح کے الزامات لگاتے اور کہتے رہے کہ وہ خلاف شرع باتیں بتاتا ہے مگر لوگ شریعت کی ان باتوں کو جلدی اور آسانی سے سمجھ لیتے ہیں جن میں ان کا فائدہ ہو چنانچہ مولوی اللہ رکھا کی کامیابی کی پتنگ اونچی اور اونچی اڑنے لگی اور چھوٹی اور بڑی مسجدوں کے جدی پشتی امام صاحبان گاؤں سے ہجرت کر کے گئے یا انہوں نے اپنا آبائی کام چھوڑ کر کوئی دوسرا کام دھندہ شروع کر دیا۔

مولوی اللہ رکھا نذر نیاز نہیں لیتے تھے۔ بڑے درویش صفت انسان تھے۔ مفت خوری سے سخت پرہیز کرتے اور خود محنت کر کے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ وہ دن بھر اینٹیں ڈھوتے، لائیاں کرتے، مویشی چراتے، بان کی رسیاں اور چارپائیاں بنتے۔۔ اور بغیر کسی فیس یا معاوضے کے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے۔ لوگ ختم پڑھوانے کے لئے حلوے، کھیریں، سیویاں اور پراٹھے لاتے وہ ان کی دل شکنی کے ڈر سے ختم

پڑھ دیتے مگر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے، لوٹا دیتے یا کسی غریب یا بیوہ کے ہاں بھجوا دیتے۔ وہ مسجد کے حجرے میں رہتے تھے۔ خود مسجد میں جھاڑو دیتے، صفائی کراتے، چراغ جلاتے، نمازیوں کے وضو کے لئے حوض میں پانی بھرتے اور نماز کا وقت ہو جاتا تو اذان دیتے۔ لوگ ان کی بے حد عزت کرتے اور ان سے محبت بھی۔ مگر جب وہ منبر پر کھڑے ہوتے تو ان کی آواز سے آس پاس کے گھروں کی دیواریں لرزنے لگتیں۔گنہگاروں اور دوسروں کا حق مارنے والوں کے دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی۔ خدا کے سوا وہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور حق بات ڈنکے کی چوٹ پر کہتے تھے۔

پھر انہوں نے کچھ عرصہ بعد ایک ایسی غریب بیوہ سے نکاح کر لیا جس کو اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق ہو گئی تھی۔ مولوی صاحب سے نکاح کے بعد بی بی جی کے سوئے ہوئے نصیب جاگ اٹھے اور چند ہی برس میں گھر بچوں سے بھر گیا۔

مولوی صاحب ہمیشہ سے روکھی سوکھی کھا کر وقت گزارتے آئے تھے۔ بی بی جی نے بھی ان کا بہت عرصہ تک ساتھ دیا اور عسرت اور فاقوں کی زندگی گزارنے پر بھی خدا کا شکر ادا کرتی رہیں مگر پھر بچوں کی وجہ سے مولوی صاحب سے چوری چھپے کھانے پینے کی کوئی چیز قبول کر لیتیں۔ مولوی صاحب کو پتہ چلا تو شروع شروع میں بہت خفا ہوئے مگر پھر یہ سوچ کہ بچوں کو فاقوں مارنا اور اچھی چیزوں کے لئے ہمیشہ ترساتے رہنا مناسب نہیں،خاموش ہو گئے

پھر ایک بار ذیلدار کا چالیسواں تھا اس کے متمول بیٹوں نے اسے بڑا کیا یعنی چالیسویں کا غیر معمولی اہتمام کیا۔پوری برادری کو کھانے کی دعوت دی اور ختم کے موقع پر مولوی صاحب کے سارے کنبے کے کپڑے اور دنیا جہان کی نعمتیں، پھل اور میوے حاضر کئے۔ مولوی صاحب پریشان ہو گئے۔ ختم پڑھتے ہوئے ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کے پھٹے پرانے کپڑے اور ترسی ہوئی صورتیں گھوم گئیں۔انہوں نے گلو گیر آواز میں کہا۔

’’میں کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ کسی کمی کے ہاتھ سب چیزیں ہمارے گھر پہنچا دی جائیں۔‘‘

اور جس طرح شیر عام طور پر آدمی پر حملہ نہیں کرتا مگر جب ایک بار اس کے منہ کو انسانی خون لگ جائے تو آدم خور ہو جاتا ہے،مولوی اللہ رکھا کے منہ کو بھی جب مفت کا حلوہ مانڈا ایک بار لگ گیا تو پھر لگتا ہی چلا گیا۔ اور آہستہ آہستہ وہ پہلے مولوی صاحب سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے۔

اور اب اتنے برسوں بعد۔۔ مولوی اللہ رکھا کی امامت کا دائرہ اپنی مسجد سے نکل کر آس پاس کے کئی ایک چھوٹے بڑے دیہات کی مسجدوں تک پھیل گیا ہے۔ ان مسجدوں میں ان کے نائب امام آمدنی کے ایک تہائی حصے پر کام کرتے ہیں، وہ خود ہفتے میں ایک دو بار ہر مسجد میں نماز پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ انہوں نے نہایت محنت، ہوشیاری اور اپنے زور خطابت کی وجہ سے ایک ایک کر کے ان مسجدوں پر قبضہ کیا ہے اور

دیہات کے وڈیروں اور زمینداروں میں اپنے اثر و رسوخ اور رموز شریعت سے آگاہی کی بنا پر نیم خواندہ ملاؤں کو بے دخل کیا ہے ان کا شمار علاقے کے اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ ہر کسی کے کام آتے ہیں۔وہ ہاڑی ساؤنی کے کارے پر نہایت تھوڑے منافع پر بڑی بڑی رقمیں قرض دے دیتے ہیں۔فصل، زمین یا مویشی رہن یا زیور گروی رکھنے کے لئے لوگ انہی کے پاس آتے ہیں کہ وہ نہایت دیانتدار اور قابل اعتماد ہیں۔کسانوں اور کمی کاریوں نے ہی نہیں بڑے بڑے زمینداروں نے ان سے منافع پر موٹی موٹی رقمیں لے کر ٹیوب ویل لگوائے اور ٹریکٹر خریدے ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنا بہت بڑا اور محل نما پکا مکان بنا لیا ہے اور اس میں بجلی لگوا لی ہے انہیں کسی سے کچھ مانگنے یا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی لوگ خود ہی ہر چیز میں سے اللہ کا حصہ نکال کر ان کو پہنچا دیتے ہیں۔

وہ بہت اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے مگر جب سے نوجوان مولوی منظور درسگاہ سے لوٹا اور قریب والے گاؤں کی ایک مسجد سنبھال بیٹھا ہے ان کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ مگر انہیں یہ سوچ کر قدر ے اطمینان ہوتا ہے کہ لوگ کئی طرح سے ان کے محتاج ہیں اور پھر مولوی منظور کو ان کی طرح تعویذ گنڈا نہیں آتا بلکہ وہ اسے شرک سمجھتا ہے اور وہ خود محض امام مسجد ہی نہیں آس پاس کے دیہات کے واحد طبیب بھی ہیں اور بعض با اثر لوگوں کے خفیہ نکاحوں اور دوسرے بہت سے اہم رازوں کے امین بھی۔۔!

ہر جمعہ کی شام کو وہ مولوی منظور کے گاؤں سے آنے والی رپورٹ کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں ان کا کوئی خادم یا وفادار مولوی منظور کے جمعے کے وعظ میں شریک ہو جاتا ہے اور تمام حالات سے انہیں باخبر رکھتا ہے۔ مولوی منظور کے مقتدیوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور اب انہیں رمضان شریف کے پہلے جمعے کا انتظار ہے۔ رمضان شریف شروع ہوتے ہی مساجد میں نمازیوں کی تعداد میں ایک دم غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے اور لوگ پند و نصائح اور وعظ و تلقین کی باتوں پر خصوصی توجہ دینے لگتے ہیں۔ اس پورے علاقے میں دو ہی جگہ جمعے کی نماز کے اجتماعات ہوں گے اور نمازیوں کی تعداد سے ان کے اور مولوی منظور کے درمیان ایک طرح کا الیکشن ہو جائے گا۔

رمضان کے پہلے جمعے کی شام کو ان کا ایک خادم پریشان حال لوٹتا ہے تو ان کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ مولوی منظور کے مقتدیوں کی تعداد کسی طرح ان کے اپنے نمازیوں کی تعداد سے کم نہیں ہے۔۔ انہیں اسی بات کا ڈر تھا۔ ان کا رنگ اڑ جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اس رات تراویح کی نماز پڑھاتے ہوئے انہیں ایک عرصہ بعد لقمہ ملتا ہے اور ابھی وہ لقمہ سے سنبھل نہیں پاتے کہ سجدہ سہو پڑ جاتا ہے۔

رات کو وہ تھکے تھکے اور نڈھال سے گھر لوٹتے ہیں اور دالان میں بچھی ہوئی بہت سی چھوٹی بڑی چارپائیوں کے قریب سے گزر کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر آتے ہیں۔ بی بی جی ان کی آہٹ سن کر لمحہ بھر کے لئے جاگتی ہیں پھر مچلی ہو کر مصنوعی خراٹے لینے لگتی ہیں۔ وہ اپنے سرہانے تپائی پر رکھا ٹھنڈے میٹھے دودھ کا

ارک جتنا گلاس اٹھاتے اور مزے لے لے کر گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں۔ لیکن اچانک انہیں ایک جانی پہچانی مگر ناگوار سی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور جی متلانے لگتا ہے۔ وہ دودھ کا گلاس تپائی پر رکھ دیتے ہیں اور ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہیں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مگر بدبو کے بھبکے لپکتے چلے آتے ہیں۔ اچانک انہیں یاد آتا ہے کہ یہ بدبو ویسی ہی ہے جیسی بڑے ملک کے جسم سے اٹھتی تھی۔ وہ قے روکنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر وہ نہیں رکتی۔

* * *

۲(ا+ب)

''کئی روز سے سخت بیمار ہوں، بچنے کی امید کم ہے، مرنے سے پہلے کہا سنا معاف کرانا چاہتی ہوں، خدا کے واسطے مایوس نہ کرنا تھوڑی دیر کے لئے چلے آنا تاکہ میں سکون سے مر سکوں ''

فرزانہ میرے ہاتھ سے خط چھین لیتی ہے اور پڑھ کر تیز لہجے میں پوچھتی ہے۔

''یہ جنت کون ہے؟''

''یہ وہی جنت ہے''۔ میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا ''جس نے مجھے آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان میں فیل کرایا تھا اور سارے گاؤں اور برادری میں بدنام کیا تھا''

فرزانہ کو چپ لگ جاتی ہے۔

مجھے اس کی چپ سے ہول آنے لگتا ہے میرے اندر کوئی دانت پیسنے اور بلند آواز میں گالیاں بکنے لگتا ہے---

فرزانہ مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتی اور کہیں دور سے بولتی محسوس ہوتی ہے۔

''اچھا تو یہ وہی ہے!''

''ہاں وہی کمینی جنت--- حرام--'' مجھے غصہ آ رہا ہے۔

''ایسا نہ کہئے'' فرزانہ میری بات کاٹ کر کہتی ہے ''اس کا آخری وقت ہے''

''آخری وقت ہے تو میں کیا کروں میں پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل جاتا ہوں ''

''رات کو جب میں فلم دیکھ کر گھر لوٹتا ہوں فرزانہ میرے لئے کھانا نکالتے ہوئے کہتی ہے ''آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں ''

''کہو''

''آپ جنت کو دیکھنے گاؤں چلے جائیں ''

''کیوں ؟'' میں چڑ کر کہتا ہوں ''تمہیں کس بات کا شک ہے''

''شک نہیں '' وہ کہتی ہے '' بیچاری کا آخری وقت ہے اور پھر ممکن ہے وہ آپ کو اصل بات بتانا چاہتی ہو۔۔ آپ کو بڑی الجھن دور ہو جائے گی اور آپ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گے''

''اصل بات؟ ہاں۔۔ اگر وہ مجھے اصل بات بتا دے تو میں اسے اب بھی معاف کر سکتا ہوں ''

''مجھے یقین ہے وہ ضرور سچ سچ بتا دے گر آپ جا کر تو دیکھیں ''

فرزانہ کے اصرار اور اس امید پر کہ شاید جنت مجھے اصل بات بتا ہی دے میں ہفتے کے روز گاؤں جانے کے لئے رضا مند ہو جاتا ہوں۔

رات کو سونے کے لئے لیٹتا ہوں تو سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے موتیے کی تازہ پھولوں کی خوشبو اندر آتی ہے پھر ایک سایہ سا کھڑکی کے فرش پر کودتا ہے اور پردوں کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے میں فرزانہ کو آواز دیتا ہوں وہ میرے پہلو میں لیٹی ہے لیکن اسے میری آواز سنائی نہیں دیتی۔۔ کچھ عرصہ سے میرے اور اس کے درمیان اجنبیت کی نظر نہ آنے والے دیوا ر خود بخود کھڑی ہو گئی ہے۔۔ اسی لمحے گاؤں کی ساری عورتیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں اور مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں وہ مجھے مسکرا مسکرا کر حیرت سے دیکھتی اور آپس میں سرگوشیاں کرتی ہیں پھر محبوب سی مسکراہٹ دباتے ہوئے باری مجھ سے پوچھتی ہیں۔

''منڈیا۔۔ تیری عمرکیہہ ے؟''

''وے تو کنے سالان دا ایں ؟''

مجھے پتہ نہیں چلتا انہیں میری عمر کی فکر کیوں لاحق ہو گئی ہے لیکن پھر ماتھے پر تیوریاں کے بل ڈالے آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے۔

''فیل نہ ہوتا تو کیا کرتا۔۔ موت جو گے نے اور گل جو کھلا لیا''

''مجھے یاد ہے کہ میں آٹھویں جماعت کے وظیفے کا امتحان میں فیل ہو گیا ہوں لیکن مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے کیا، کب اور کیسا گل کھلایا ہے۔ میں نے گل ضرور کھلایا ہو گا۔۔ لیکن میں نے سائے کھلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ماسی بختاں کہتی ہے ''بھور کی مالیا۔۔ وہ تو مشکل سے بچی ہے''

''کون؟''

''بڑا بے شرم ہے۔۔ پوچھتا ہے کون؟''

ماسی بختاں ہنس کر چلی جاتی ہے۔

میں نے وظیفے کا امتحان پاس نہیں کیا لیکن میں نے آٹھ جماعتیں پڑھی ہیں ساری بات میری سمجھ میں آ جاتی ہے مجھے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ جنت دو مہینے گھر سے باہر کیوں رہی ہے اور جب لوٹ کر آئی ہے تو اس قدر کمزور اور پیلی نظر کیوں آتی ہے۔

لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کا مجھ سے کیا تعلق؟۔۔ لیکن سنا ہے کچھ لوگوں کو نیند میں جلنے کی بیماری ہوئی ہے کیا پتہ مجھے بھی ہو؟ میں ماموں کے ہاں پڑھنے اور وظیفے کا امتحان پاس کرنے آیا تھا۔ کہتے تھے یہاں پڑھائی اچھی ہے اور پھر ماموں خود سکول ماسٹر تھے ابا کے پاس شاید اپنا سر فخر سے بلند کرنے کے لئے کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ اس لئے ان کا خیال تھا کہ میرا وظیفہ آ گیا تو برادری میں ان کا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔

ماموں کے گھر کے بڑے پسار کے پیچھے دو کوٹھڑیاں تھیں۔ دائیں جانب والی کوٹھڑی میں ممانی اپنی بیٹیوں کے ساتھ اور بائیں جانب والی کوٹھڑی میں ماموں اپنے حقے سمیت ہوتے تھے۔

پسار کی دائیں جانب میری اور بائیں جانب جنت کی چارپائی ہوتی تھی۔ جنت ماموں کی بھتیجی تھی جو اسی گھر میں ل کر جوان ہوئی تھی۔ میری اس کی بے تکلفی نہیں تھی۔ صرف ایک بار میری آنکھ چبھ جانے پر اس نے میری آنکھ میں پھونک مارنا چاہی تو غلطی سے پھونک میرے منہ میں چلی گئی تھی۔

میرے اور جنت کے درمیان بھائیں بھائیں کرتا پسار۔۔ پسار کی دیواروں پر لگی پڑ چھتیاں۔۔ پڑ چھتیوں میں قطار اندر قطار رکھے چینی اور شیشے کے برتن اور دھات کے گلاس۔۔ دیوار سے لگی مٹیاں۔۔ چونکیاں۔۔ لاٹوؤں والی الماریاں اور پرندوں کی تصویروں والا چارٹ۔۔ یا پھر مٹی کے تیل کا وہ دیا جس کی روشنی جنت کی چارپائی تک جاتے جاتے بینائی سے محروم ہو جات تھی۔

ممانی کی کوٹھڑی سے اس کی بیٹیوں کے نیند میں بڑبڑانے کی آوازیں آتی رہتیں۔

’’نی شیدو۔۔ تینوں سپ لڑے‘‘

’’بے بے۔۔ تھوڑا جیہا گڑ دے‘‘

’’ہائے ہائے نی مینوں کھا گئی‘‘

ممانی بار بار انہیں ڈانٹتی پھٹکارتی اور پہلو بدل کر سونے کی ہدایت دے کر خود بھر بڑ بڑاتی سو جاتی۔

ماموں کی کمرے سے باری باری حقہ گڑ گڑانے اور کھانسنے کی آوازیں آتی رہتیں۔

گرمیوں میں دیہات کے لوگ تہمد کو اچھی طرح باندھ کر سوتے مگر سردیوں میں لحافوں کی وجہ سے اس احتیاط کی ضرورت نہ ہوتی۔مگر کھڑکیاں دروازے بند ہوں تو خواہ باہر کتنی ہی سردی پڑ رہی ہو کچی دیواروں والے مکان گرم رہتے ہیں۔ جنت بھی لحاف میں منہ سر ڈھانپ کر سوتی لیکن جب پڑوسیوں کا مرغ آدھی کو دھمی ویلا سمجھ کر اذانیں دینے لگتا تو جنت کو گرمی لگتی اور وہ پاؤں مار مارکر لحاف ایک طرف گرا دیتی۔

مٹی کے تیل کے دئیے کی مدھم سی لو اچانک لٹ لٹ کرنے لگتی اور سرے پسار میں روشنی پھیل جاتی۔

دیوار سے لٹکے ہوئے پرندوں کے چارٹ کا کالا تیتر زور زور سے بولنے لگتا۔

میری پسلی سے ٹیر ٹیر کرتی ٹٹہری نکلتی اور سارے پسار کا ایک چکر لگا کر پڑ چھتی پر جا بیٹھتی۔

مجھے وظیفے کے امتحان کا خیال آتا اور میں کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگتا۔ تاجر خواہ کتنی ہی سستی جنس خریدتا ار کتنی ہی مہنگی فروخت کرتا اسے نفع کر بجائے الٹا نقصان ہوتا۔

نادر شاہ کی فوجیں دلی پر چڑھائی کرتیں اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتیں۔۔۔ یہ ساری اینٹیں ایک ایک کر کے رات بھر میرے سر میں لگتی رہتیں۔

طول بلد اور عرض بلد آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے اور خط استوا خط سرطان کے سینے پر چڑھ بیٹھتا۔

الف اور ب اپنے اپنے مربعے سروں پر اٹھائے پسار کے کچے فرش پر بھنگڑہ ڈالتے اور زاویہ یا قوس کی تنصیف کرتے ہوئے پر کار کی سوئی میری انگلی میں اتر جاتی پھر ایک رات میں نے پہلی بار آتش بازی کا خواب دیکھا۔ شوں شوں کرتی ہوائیاں اوپر جاتیں اور آگ کے پھولوں کا باغ سا کھل جاتا۔

پھر ایک ہوائی جس کے سرے پر گولا سا بندھا ہوا تھا شوں شوں کرتی اوپر ہی اوپر چڑھتی گئی پھر کہیں بہت دور سے پہلے آسمان سے آواز سنائی دیتی ٹھاہ۔۔۔ ٹھاہ!

میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھ کھلی تو میرا لباس پسینے میں تر تھا۔ جسم سیاہ ہو چکا تھا اور سارے پسار میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ہفتے کے رو میں گاؤں جانے کے لئے دفتر سے جلدی آ جاتا ہوں لیکن یہ دیکھ کر کہ فرزانہ کو میرے جانے کی کچھ فکر نہیں، پوچھتا ہوں ’’کیا بات ہے؟‘‘

جواب میں وہ میرے سامنے ابا کا خط رکھ دیتی ہے۔ اباب نے اور باتوں کے علاوہ یہ اطلاع بھی دی ہے کہ میاں الہ بخش کی زوجہ بی بی رضائے الٰہی سے فوت ہو گئی ہے۔

***

آسیب

شروع میں تو کتنا عرصہ ہمیں یقین ہی نہ آیا کہ یہ جو دن رات کی دوڑ دھوپ کے باوجود ہماری پوری نہیں پڑتی اور آئے روز بیماری،لڑائی جھگڑے اور چھوٹے موٹے حادثات کی صورت،کوئی نہ کوئی آفت ہمیں گھیرے رکھتی ہے،اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ہم یہی سمجھتے رہے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔بلکہ امی ابا کا کہنا تھا کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔حالانکہ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ جب اللہ میاں نے گناہوں کی سزا کے لئے اگلی دنیا میں دوزخ کی آگ بھڑکا رکھی ہے تو یہاں کیوں ؟یہ تو دوہری سزا ہو گئی۔ اور یہ جو ہمارے آس پاس کے لوگ مزے کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو کیا انہوں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا اور ان کی رسی کیوں اتنی دراز ہے۔ اور حالانکہ اس بات کے اشارے کہ نظر نہ آنے والی کوئی مخلوق وہاں پہلے سے رہ رہی ہے مکان کی تعمیر کے وقت ہی سے مل رہے تھے۔کبھی رنگ کا ڈبہ،کبھی سیمنٹ کی بوری اور کبھی مستریوں کاریگروں کے اوزار گم ہو جاتے۔کبھی تازہ پلستر پریوں الٹی سیدھی لکیریں ڈال دی جاتیں جیسے رات بھر بھتنے کٹم کاٹا کھیلتے رہے ہوں۔بعض اوقات کوئی فضول سا جملہ بھی لکھ دیا جاتا جس کے ہجوں سے پتہ چلتا پرائمری سکول سے بھاگے ہوئے کسی بچے کی تحریر ہے۔اس لئے ہم اسے مزدوروں اور ملحقہ کچی بستی کے آوارہ لڑکوں کی کاروائی سمجھتے رہے۔بلکہ مکان میں منتقل ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد جب گھر کی عورتیں شکایت کرتیں کہ رات کو گلدان میں سجائے گئے پھول اگلی صبح کو پتی پتی ہوئے پڑے ملتے ہیں،ایک کمرے کی چیز دوسرے اور دوسرے کی تیسرے یا کوڑہ دان میں ملتی ہے اور بچوں کے کھلونے اور وڈیو گیمز توڑ کر پھینک دی جاتی ہیں تو ہم اسے گھر کے بچوں کی شرارت سمجھتے اور انہیں سرزنش کر کے مطمئن ہو جاتے۔وہ زیادہ اصرار کرتیں تو ہم،گھر کے مرد،انہیں ضعیف العقیدہ اور توہم پرست قرار دیتے اور ان کا مذاق اڑاتے۔مگر حیرت ہوتی کہ کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کی ڈگری رکھنے والی بھابی بھی ان کی ہمنوا ہو گئیں کہ گھر پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔چھوٹی بہن روحی نے فلاسفی پڑھی تھی اس نے شروع شروع میں کچھ روز فلسفہ بگھارا پھر وہ بھی چپ ہو گئی۔بلکہ ہر وقت ڈری ڈری رہنے لگی۔بعد میں پتہ چلا وہ میرا سویٹر بن رہی تھی جب آدھا بن چکی تو ایک صبح وہ سارا ادھڑا ہوا ملا۔ بچوں کو ڈانٹا ڈپٹا گیا اور اس نے دوبارہ بننا شروع کیا مگر وہ جتنا ہر روز بنتی وہ اگلے روز ادھڑا ہوا ملتا۔ اور سرہانے رکھ کر سونے سے اسے ڈر لگتا مبادا وہ غیبی ہاتھ جو سویٹر ادھیڑتا تھا اس کا گلا دبا دے۔آخر کار اس نے سویٹر بننا ہی چھوڑ دیا اور میرے لئے بازار سے ریڈی میڈ خرید لائی۔

قریب ہی کچی آبادی تھی اور اگرچہ بلدیہ نے اس کے گرد چار دیواری تعمیر کر رکھی تھی اور آنے جانے کے راستے مقرر کر دئے تھے مگر یہاں کے کھمبیوں کی طرح اگنے والے بچے جہاں سے جی چاہتا دیوار پھلانگ کر آس پاس کی کوٹھیوں بنگلوں میں گھس آتے اور جو چیز ہاتھ لگتی اٹھا لے جاتے اور پھلدار درختوں پر تو بیتالوں کی طرح ایک ساتھ کئی کئی لٹکے نظر آتے۔مگر اس سے محلے کے لوگوں کو کچھ آسانیاں بھی تھیں۔گھر کے کام کاج کے لئے لڑکے ،لڑکیاں اور عورتیں کم معاوضے پر مل جاتیں اور ان کے مردوں کو آسانی سے بیگار میں پکڑا جا سکتا۔ خود ہمارے ہاں اسی آبادی کی ایک بیوہ عورت کام کرتی تھی۔شروع میں وہ رات کو اپنے گھر چلی جاتی تھی مگر جب امی کو پتہ چلا وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ زمین کھود کر بنائے گئے غار نما کمرے میں رہتی ہے جس کے بیٹھ جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے انہوں نے سرونٹ روم کو،جو سٹور کے طور پر استعمال ہو رہا تھا،خالی کر کے رہائش کے لئے دے دیا۔ ابا کا خیال تھا ساری خرابی یہیں سے پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ ساری حرکتیں ملازمہ کی نو دس سالہ بیٹی کرتی تھی جسے پڑھنے اور کھیلنے کی عمر میں سکول چھڑوا کر کام پر لگا دیا گیا تھا۔لیکن وارداتوں کی نوعیت دیکھ کر یقین نہ آتا۔یہ اتنی چھوٹی بچی کے بس کی بات نہ تھی پھر بھی اس کی خوب نگرانی اور باز پرس کی گئی مگر آخر کار اسے بری الذمہ قرار دے دینا پڑا۔اس کی بجائے خواتین کو ملازمہ کا چند ماہ کا بچہ زیادہ پر اسرار اور منحوس معلوم ہوتا تھا جو پیدا ہوتے ہی اپنے باپ کو کھا گیا تھا ورنہ اس زمانے میں صرف بخار سے بھی کوئی مرتا ہے۔یوں بھی وہ عام بچوں کے برعکس بہت کم روتا تھا۔ماں اسے دودھ پلاتی یا بھوکا رکھتی،وہ گھنٹوں چپ چاپ پڑا انگوٹھا چوستا اور کھیلتا رہتا۔میرا اپنا خیال تھا کہ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ تھی۔پیدا کرنے والے کو تو پتہ ہی تھا اسے کس مٹی سے بنانا اور اس میں صبر و شکر کی کتنی مقدار ملانی ہے۔مگر گھر کی عورتوں کو اس سے خوف آتا۔ اور و ہ کبھی دبے اور کبھی واشگاف لفظوں میں اس کا اظہار کرتیں۔ مگر ایک کی تنخواہ میں کام کرنے والی دو،انہیں اور کہاں مل سکتی تھیں،ناچار برداشت کرتی رہیں۔

پھر رفتہ رفتہ پریشان کن واقعات جلدی جلدی اور تواتر سے رونما ہونے لگے۔چھوٹی چھوٹی اور خاص طور پر خوشبودار چیزیں غائب ہونے لگیں۔کبھی ہیر آئل کی شیشی،کبھی شیمپو اور کبھی پاؤڈر کا ڈبہ۔واش ہینڈ بیسن سے صابن کی ٹکیا غائب ہو جاتی اور کسی روشندان یا الماری کے اوپر جہاں کسی کوتاہ قد یا بچے کا ہاتھ نہ پہنچ سکتا ہو پڑی ملتی۔سنگھار میز کی اکثر چیزیں غائب یا خراب کر دی جاتیں۔ لپ سٹک دیواروں پر اور شو پالش آئینوں پر مل دی جاتی۔خوشبودار چیزوں کے ساتھ ہی گھر سے مہر و محبت کی خوشبو بھی اٹھ گئی۔ایک دوسرے پر شک و شبے کا اظہار،الزام تراشیاں اور جھگڑے۔گھر میں ابا جان کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی بیمار رہنے لگا۔ اور سرہانے رکھی دوا کی شیشی یا کیپسولز غائب ہو جاتے۔لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اکثر چیزیں کہیں دوسری جگہ پڑی مل جاتیں۔بعض اوقات گندی اور ناکارہ چیزیں پاک صاف جگہوں اور پاک صاف چیزیں غسل خانے یا گٹر سے برآمد ہوتیں۔لیکن پھر یہی بچگانہ حرکتیں خطرناک صورت اختیار کر گئیں جیسے وہ نامراد

اپنی موجودگی کا بھر پور احساس دلانا چاہتے ہوں۔اب چاقو،بلیڈ اور قینچی وغیرہ کا استعمال ہونے لگا۔خوبصورت اور نئے سل کر آئے ہوئے کپڑے خاص طور پر نشانہ بنتے۔شوخ رنگ کی ٹائیاں،کامدار دوپٹے،شادی کے جوڑے اور تکیوں کے پھولدار غلاف کاٹ کتر دئیے جاتے۔آج اگر منی اپنا فراک چاک ہو جانے پر رو رہی ہے یا روحی اپنے جہیز کے کسی قیمتی جوڑے میں شگاف ڈال دئیے جانے پر آنسو بہا رہی ہے تو کل بھابی اپنی کسی ساڑھی یا دوپٹے پر قینچی چل جانے پر واویلا کر رہی ہیں۔بالآخر گھر کے لوگ ایک دوسرے سے اور دور ہونے لگے۔شائد ان بد ذاتوں اور بد ذوقوں کا مقصد بھی یہی تھابھابی نے ایک روز حساب لگایا کہ روحی کے مشترکہ کھاتے کے جہیز کو چھوڑ کر ان کا نقصان زیادہ ہوا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ ان کے صرف قیمتی اور نئے جوڑوں پر جب کہ ہمارے معمولی اور پرانے کپڑوں پر قینچی چلی۔

در اصل بھائی کی تنخواہ اور میرا کنبہ بڑا تھایہ ان کی دوسری شادی تھی۔پہلی بے اولاد بیوی سے طلاق کے کئی سال بعد وہ مشکل سے دوسری شادی پر رضامند ہوئے تھے۔ اب ان کے دو بچے تھے جن کی عمریں پانچ سال سے کم تھیں۔میرے بچوں کی تعداد ان سے تین گنا تھی۔دو بڑے اور سمجھدار،چار چھوٹے جو پرائمری اور ہائی سکولوں میں پڑھتے تھے۔بھابی کو مشترکہ کھاتے کے مستقل نقصان کا قلق رہتا تھا۔بہانہ ہاتھ آ گیا تو گھر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔والدہ اور روحی ہمارے اور والد صاحب بھائی کے حصے میں آئے۔ اور کچی آبادی کی ماں بیٹی اسی تنخواہ پر دو گھروں کا کام کرتی رہیں

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ بھائی بھابی کے علیحدہ ہو جانے سے اچانک امن اور سکون ہو گیا جس سے ان کے اس شبے کو تقویت ملی کہ میرے بیوی بچے ان کے قیمتی اور شاندار کپڑوں سے جلتے تھے اور موقع پا کر انہیں خراب کر دیتے تھے۔ابا ان کے دسترخوان پر کھاتے تھے قدرتی طور پر وہ بھی ان کی ہمنوائی کرنے لگے۔مجھے خود بھی شک ہو گیا اور میں نے اپنے کنبے کے ہر فرد سے باز پرس کی۔راتوں کو اٹھ اٹھ اور چھپ چھپ کر ان کی جاسوسی کرتا خصوصاً لڑکیوں پر نگاہ رکھتا کہ سائے اور آسیب کی ہر کہانی کا تعلق عام طور پر کسی بالغ یا نابالغ لڑکی یا گھٹن اور ہسٹیریا میں مبتلا عورت ہی سے ہوتا ہے۔طبعاً کمزور ہونے کی وجہ سے وہ عام طور پر ضعیف العقیدہ ہوتی ہیں اور وہ عاشق واشق بھی انہیں پر ہوتے ہیں۔جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بچوں کو پڑھائی سے فرصت نہیں اسی لئے وہ امتحانوں میں اول دوم آتے رہتے ہیں تو میں نے صفائی دینے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ کوئی تیسرا ہے جو بھائیوں میں نفاق ڈال رہا ہے۔غیر برادری کی بھابی نے سمجھ لیا میرا اشارہ ان کی طرف ہے۔اس پر گھر میں خوب ہنگامہ ہوا۔غریب کی تو معافی بھی کوئی قبول نہیں کرتا خواہ وہ سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔مگر اس دوران ایک اچھی بات یہ ہو گئی کہ میرے بڑے بیٹے کو نتیجہ نکلتے ہی کینیڈا کا ویزا مل گیا۔ اور ہمارے بھی دن پھر گئے۔ہماری بات میں بھی وزن پیدا ہو گیا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گھر میں روپے پیسے کی چوریاں ہونے لگیں۔تاہم زیورات عام طور پر مل جاتے۔بھابی کا

نیکلس میری بیوی کے ٹرنک اور اس کی بالی بھابی کی الماری سے ملی۔مگر نقدی غائب ہو جاتی اور اپنے پیچھے لڑائی جھگڑے کا ختم نہ ہونے والا طویل سلسلہ چھوڑ جاتی۔

دونوں گھروں میں کشیدگی کی فضا تھی اور آنا جانا نہیں تھا اس لئے ادھر کی چیز ادھر کرنے والے یا تو بھوت تھے یا کام کرنے والی ماں بیٹی۔جن کا دونوں طرف آنا جانا تھا۔ماں مصیبت زدہ اور جہاں دیدہ تھی اسے روزگار اور پناہ ملی ہوئی تھی وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ اور لڑکی بھی کب،کیوں اور کیسے کر سکتی تھی۔ یوں بھی وہ بہت چھوٹی اور معصوم تھی اور اتنے بہت سے افراد کی مسلسل نگرانی کے بعد کبھی تو پکڑی جاتی۔شائد یہ واقعی کوئی آسیب تھا۔لیکن میرا جی نہ مانتا میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ جن،پریاں،بھوت پریت اور جادو ٹونا انسانی ذہن کے بچپن کی یادگار ہیں۔جب ہر طرف فرضی دیوی دیوتاؤں کی حکومت تھی۔ اور مظاہر فطرت اور شجرو ہجر کو معبود سمجھ کر پرستش شروع کر دی جاتی تھی۔بعد میں یہ ادبی اور اساطیری علامتیں بن گئیں۔شب خون مارنے والے حملہ آوروں،رات کی تاریکی میں لوٹ مار کر کے غائب ہو جانے والے چوروں ڈاکوؤں کو جن بھوت اور عفریت کہا جانے لگا۔ یوں بھی شاعری کو تصوف اور داستانوں کو فوق الفطرت بہت مرغوب ہوتا ہے۔انسان نے مادی اور ذہنی ارتقا ء کی بہت سی منزلیں طے کر لیں،چاند کے غاروں سے مریخ کے صحراؤں تک اور سمندر کی گہرائیوں سے خلاء کی پہنائیوں تک اس نے دوربینوں سے بڑی اور خورد بینوں سے چھوٹی دنیا کے بہت سے گوشے کھنگال ڈالے مگر کسی سائنسدان یا خلا نورد کی جن یا پری سے ملاقات نہ ہوئی۔پھر بھی ان کا خوف اور وسوسہ اس کے ذہن سے نہ نکلا۔ اور نہ ہی مافوق سے اس کی دلچسپی کبھی ختم ہو گی کہ بچپن کی چیزوں سے رغبت انسانی فطرت کا حصہ ہے۔

یہ گھر آسیب زدہ ہے۔یہ خبر اخبار میں شائع ہوئے بغیر رشتے داروں،دوستوں اور جاننے والوں تک پہنچ گئی تھی۔ اور جواب میں طرح طرح کے افسانے سنائے اور مشورے دئیے جاتے۔ہر شخص کے علم میں ایسے کئے واقعات تھے۔کہیں راتوں کو میوزک بجتا تھا۔کہیں پتھروں کی بارش ہوتی تھی۔کسی گھر میں خود بخود آگ بھڑک اٹھتی اور کسی کی دیواروں پر سینکڑوں چھپکلیاں چپکی نظر آتیں۔ان سب واقعات میں مشترک بات یہ تھی کہ بالآخر کسی پیر یا عامل کے وظیفے،تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک نے اس مصیبت سے نجات دلائی۔ناچار ہم نے بھی ایک کے بعد دوسرے عامل،پیر اور پہنچے ہوئے بزرگوں کی تلاش جاری رکھی۔گھر میں آئے روز عجیب و غریب حلیے کا نیم خواندہ قسم کا کوئی عامل یا پیر نظر آتا۔طرح طرح کے ٹونے ٹوٹکے اور وظیفے،دھونیاں،اگر بتیاں اور چراغ۔کلام الہی کے خوف، وظیفوں کی مار اور عاملوں کی ڈانٹ پھٹکار سے وہ عارضی طور پر چلے بھی جاتے اور کچھ دن چین سے گزر جاتے مگر پھر کسی دن اچانک کوئی نیا اور پہلے سے زیادہ شدید واقعہ رونما ہو جاتا۔

گھر کی خواتین کو پہلے ہی شک تھا یہ سب بھائی کی مطلقہ بیوی کروا رہی تھی۔اب عامل لوگوں نے ان کے شک کو یقین میں بدل ڈالا۔گھر کے کونوں کھدروں سے وقتاً فوقتاً تعویذ دھاگے،بالوں کے گچھے یا کچھ نہ کچھ برآمد ہوتا رہتا۔جس کے پیچھے اسی کا ہاتھ سمجھا جاتا حالانکہ وہ بیچاری اپنے بھائی کے پاس پیرس چلی گئی تھی اور کہیں بے بی سٹر کی ملازمت کر کے وقت گزار رہی تھی۔گھر میں صرف ایک میں تھا جو خلاف عقل باتوں کو نہیں مانتا تھا اور اتنے بہت سے واقعات رونما ہونے کے بعد بھی پوری طرح یقین نہیں کرتا تھا کہ نظر نہ آنے والی مخلوق انسانی زندگی میں یوں دخیل اور اثر انداز ہو سکتی ہے۔ گھر اور باہر ا س موضوع پر بحث مباحثے ہوتے رہتے اور میں اکثر ہنستا اور کہتا کہ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو کوئی شریر یا متعصب قسم کا مسلمان یا کافر جن اپنی مرضی سے ہمارا یا پڑوسی ملک کا ایٹم بم بھی اٹھا کر چلا سکتا ہے۔اس پر ابا کہتے دیکھ لینا ایک روز ایسا ہی ہو گا۔

میں ان کے ہونے نا ہونے کے بارے میں بحث مباحثہ بھی بہت کرتا تھا۔ چنانچہ ایک رات بد ذاتوں نے مجھے سوتے میں بستر سے نیچے لڑھکا دیا۔شکر ہے چوٹ زیادہ نہیں آئی۔میں نے بتی جلا کر دیکھا۔وہ دوسری طرف منہ کئے سو رہی تھی۔شرمندگی ذرا کم ہو گئی کہ کسی نے اس حال میں دیکھا نہیں۔مگر ایک نامعلوم سا شبہ رہا کہ شائد ابھی وہ کروٹ بدل کر مسکرائے گی یا بال کھول کر سرخ آنکھوں سے مجھے گھورے گی اور مردانہ آواز میں قہقہے لگانے لگے گی۔مگر جب اس نے کروٹ بدلی نہ قہقہہ لگایا تو میں چپ چاپ بستر پر دراز ہو گیا۔مگر اس ڈر سے بتی نہیں بجھائی کہ پھر نیچے نہ گرا دیا جاؤں۔اس کے بعد میں بھی محتاط ہو گیا اور کھلے بندوں انکار اور مذاق کرنا ترک کر دیا۔

ابا کے ایک دوست بڑے مستند اور مشہور حکیم تھے۔ وہ بھی بھوت پریت کو نہیں مانتے تھے۔مذہبی حوالوں کی اپنے طور پر مختلف توجیہات کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اگر گھر کی کوئی عورت یا بچہ ہسٹیریا میں مبتلا نہیں تھا تو کسی کو نیند میں چلنے کی عادت ضرور تھی اور وہ اسی عالم میں عجیب و غریب حرکتیں کرتا تھا۔چنانچہ ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر ایک دوسرے کی پڑتال کرنے اور جاگنے لگے۔مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

کچھ وقت اسی طرح گزر گیا۔ہم بھی اچھا کھانے اور پہننے لگے۔بیٹے نے اب مجھے کمپیوٹر بھیج دیا تھا اور میں نے اس پر کام کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔چھوٹی چھوٹی ای میلز بھیجتے بھیجتے میری ٹائپنگ کی رفتار بھی بہتر ہو گئی تھی۔لیکن مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ جب میں کمپیوٹر کھولتا ہوں۔کوئی اور بھی میرے پہلو میں آ کر بیٹھ جاتا ہے اور چھیڑ خانی کرتا رہتا ہے۔شروع میں یہی سمجھتا رہا کہ مجھے کمانڈز کا صحیح پتہ نہیں ہے،اس لئے مجھ سے اکثر غلطیاں سر زد ہوتی رہتی ہیں۔لیکن جب اچھی مشق ہو جانے کے بعد بھی کمپیوٹر میری ہدایات کی خلاف ورزیاں کرنے لگتا۔کوئی دوسرا پروگرام کھول دیتا،جام ہو جاتا یا ہر پروگرام کو غیر قانونی قرار دے کر بند کرنے کی دھمکیاں دینے لگتا۔تو میرا ما تھا ٹھنکا۔بعض اوقات انٹر نیٹ کی کوئی

ناپسندیدہ سائٹ کھول دیتا جو ہٹائے نہ ہٹتی۔ایک بار میں نے بیٹے کی ای میل کھولی جس میں نئے سال کی مبارک باد دی گئی تھی۔نئے سال کی خوشی میں خوب آتشبازی ہو رہی تھی۔سکرین پر انار سے چھوٹ رہے تھے۔ہم سب اس منظر سے خوب محظوظ ہوئے مگر ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اس آتشبازی میں سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا۔سارے پروگرامز،میرا قیمتی ڈیٹا، اور ونڈوز۔میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا مگر لگتا تھا کمپیوٹر ایک خالی ڈبے کے سوا کچھ نہیں۔ابا نے سنا تو بولے سچ ہے بنی آدم کو شیطان سے کہیں مفر نہیں۔ وہ آسیب اور وائرس کی صورت کمپیوٹر میں بھی چلا آیا ہے اور قیامت تک ہر جگہ اس کا پیچھا کرتا رہے گا۔

پھر ہمیں تحریری پیغامات آنے لگے۔میز کی دراز میں یا کسی تکئے کے نیچے عام سی سیاہی میں لکھا ہوا رقعہ ملتا۔اتنی خیرات کر دو،صدقہ دو،دیگ پکا کر غریبوں کو کھلاؤ،محلے کے بچوں میں مٹھائی بانٹو،باقاعدگی سے نماز پڑھو وغیرہ۔جب تک ایسی معقول ہدایات ملتی رہیں ہم ان پر عمل کرتے رہے۔ مگر ایک روز ایک عجیب قسم کا حکم ملا۔گھر کے سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں جمع ہو کر باری باری فرش پر ناک رگڑیں۔ورنہ بہت بڑا نقصان ہو گا۔ظاہر ہے ایسی مضحکہ خیز ہدایت پر عمل کرنا ہمارے لئے ممکن نہ تھا۔جس پر وہ واقعی خفا ہو گئے اور اگلے روز استری سٹینڈ پر بند کر کے رکھی ہوئی استری کا سوئچ خود بخود آن ہو گیا اور استری اور سٹینڈ دونوں بھسم ہو گئے۔اس سے اگلے روز رسی پر سوکھنے کے لئے لٹکائے گئے کپڑوں کو آگ لگ گئی اور بھائی کی منی کی نکسیر پھوٹ پڑی۔

اب ہم قدرتی طور پر ہر بات اور ناخوشگوار واقعے کو غیبی طاقتوں سے جوڑنے لگے۔بچوں کے ہوم ورک کے وقت بجلی چلی جاتی۔نہانے یا کھانا پکانے کے وقت واٹر سپلائی بند ہو جاتی یا گھر کے کسی فرد کو چوٹ لگ جاتی تو ہمیں یقین ہو جاتا کہ سب انہی کا کیا دھرا ہے۔بلکہ امی کوتو یقین تھا کہ شہر میں آئے روز ہونے والے حادثات اور تخریب کاری کے واقعات کے پیچھے بھی نگوڑے وہی تھے۔ اور گھر ہی کو نہیں شہر اور ملک کو بھی جھاڑ پھونک کی ضرورت تھی۔

اس بار کسی ایسے عامل کی تلاش،جس کے عمل سے مستقل فائدہ ہو، میرے ذمے لگائی گئی۔میرے لئے یہ ایک مشکل کام تھا،کیوں کہ وہ سب ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے تھے اور ایسی بے سرو پا باتیں کرتے تھے جنہیں عقل سلیم ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا وہ جھوٹ بولتے تھے۔ان کے دعوے اور داستانیں سنی سنائی اور گھڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور فوق الفطرت کے بارے میں ان کا تصور تک درست نہ تھا۔مجھے ان سے ملتے اور اپنی بپتا سناتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہوتی کہ میں بھی عام پڑھے لکھے لوگوں کی طرح اپنے عقائد اور نظریات پر ڈھلمل یقین رکھتا ہوں۔مانتا ہوں نہ انکار کرتا ہوں۔عام آدمیوں کی طرح میرا علم بھی بودا اور مطالعہ ناقص ہے۔ اوہام پرستی ہم سب کو ورثے میں ملی ہے۔ اور ہم کتنا ہی پڑھ لکھ جائیں۔سائنس اور ٹیکنالوجی سے واقف ہو جائیں مافوق الفطرت کے بارے میں ہمیں ان پڑھ عامل اور پیر بیوقوف بنا تے ر ہیں گے۔ لیکن جس طرح

ضرورت کے وقت ہمیں نسبتاً کم پڑھے لکھے مستریوں،کاریگروں اور مکینکوں کے پاس جانا اور ان کی بات ماننا پڑتی ہے،زمین کو گول نہ سمجھنے والے پیش امام کے پیچھے نماز ادا کرنا پڑتی ہے،میں بھی ان سے ملا اور اگرچہ مجھے لگتا وہ اندر ہی اندر خوش ہوتے تھے کہ ایک پڑھے لکھے بابو کو کیسے الو بنا رہے ہیں۔میں نے ان کی بے تکی باتوں پر خاموشی اختیار کی کیوں کہ گھر والوں کا اصرار تھا جلدی کسی کو لاؤ۔کوئی ناقابل برداشت نقصان نہ ہو جائے۔

اور شائد یہ سلسلہ کب تک یوں ہی چلتا رہتا اگر میرا بلیک ریفل والا پارکر بال پوائنٹ گم نہ ہو جاتا۔یا پھر تیسرے چوتھے روز اسی سے لکھا ہوا بھوت کا رقعہ نہ ملتا۔ اس بار اسے قلم تو اچھا مل گیا تھا مگر کاغذ بہت خراب تھا۔کسی پرانی رف کاپی سے پھاڑے ہوئے ورق سے کام چلایا گیا تھا۔میں چونکا کیسا نالائق اور کاہل جن بھوت ہے ہاتھ بڑھا کر چین کے کسی کارخانے سے بہترین کاغذ اور جرمنی کے کسی سٹور سے نیا شیفرڈ قلم حاصل کرنے کی بجائے اپنے ہی گھر میں چوری کرتا ہے۔اب جو غور کیا تو عبارت میں دو ایک ہجوں کی فاش غلطیاں دکھائی دیں۔گھر کے سب چھوٹے بڑوں کی لکھائی کا آسیب کی اس تحریر سے موازنہ کیا گیا تو عقدہ واہو گیا۔بے حد حیرت ہوئی کہ طبقاتی نفرت اور احساس محرومی اتنی کم سن لڑکی کو بھوت بنا سکتا ہے۔ہمارا ارادہ نرمی سے پیش آنے کا تھا مگر اس کی ماں اسے لیکر راتوں رات غائب ہو گئی۔

***

باگھ بگھیلی رات

مولوی صاحب پڑھے لکھے اور عقلمند آدمی تھے۔ نہایت ہوشیاری سے اس مشکل سے نکل گئے۔ انہوں نے کہا۔ ''میں نے حلال ضرور کی تھی مگر مجھے نہیں معلوم کس کی تھی۔ سجاول موچی مجھے بلا کر لے گیا تھا،اسی نے کھال بھی اتاری تھی اسے ہی پتہ ہو گا۔''

حکم ہوا۔ ''سجاول موچی کو حاضر کیا جائے۔''

سجاول موچی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ان کمی کمینوں کے پاؤں تلے زمین ہی کتنی ہوتی ہے۔

پورب والوں نے دھمکی دی۔ ''ٹھیک ٹھیک بات کرنا ورنہ پلٹ کر گاؤں کا رخ نہ کرنا۔''

پچھم والوں نے پیغام بھیج دینا کافی سمجھا۔ ''زیادہ بقراط سقراط بننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ نتیجہ کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔''

سجاول کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے کیا نہ کرے۔ اس نے تاوان کے طور پر اپنی گرہ سے پوری رقم ادا کر دینا چاہی، مگر استغاثہ نے کہا۔ ''ہمیں پیسوں کی ضرورت نہیں۔ یہ شریکے کا معاملہ ہے ہم انہیں اندر کروا کر دم لیں گے۔'' اسے بار بار ایک ہی راستہ سجھائی دیتا۔ گھر کے سامان اور لوگوں کو ساتھ لے کر راتوں رات کہیں ہجرت کر جائے مگر اس طرح اس کے مفرور قرار دئیے جانے کا ڈر تھا۔

میں نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''کتاب میں لکھا ہے۔ سانچ کو آنچ نہیں۔''

اس نے کہا۔ ''تمہارا علم میرے کام نہیں آ سکتا کاکا۔ وہ کتابی باتوں پر عمل نہیں کرنے دیں گے نہ انہوں نے کتابیں پڑھی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''ابا۔۔ اگر تم نے جھوٹی گواہی دی تو تم خدا کو اور میں اپنی سہیلیوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔''

کہنے لگا۔ ''تو نہیں جانتی بیٹی خدا تو پھر معاف کر دیتا ہے مگر یہ ظالم لوگ کبھی معاف نہیں کریں گے۔ مجھ سے صاف سیدھا سچ نہ بلواؤ،درمیان کا کوئی تیسرا راستہ بتاؤ۔''

ہم تینوں سر جوڑ کر بیٹھے مگر ہمیں درمیان کا کوئی تیسرا راستہ سجھائی نہ دیا۔ اسی بحث و تکرار اور شش و پنج میں بہت سے دن گزر گئے اور تاریخ کا دن آ گیا۔

وہ متذبذب سا کسی تیسرے راستے کے بارے میں سوچتا ہوا چلا گیا۔ مگر جب وہ بیان دینے لگا تو اس کے منہ سے وہی کچھ نکلا جو اس نے دیکھا سنا تھا۔

وہ خود بھی حیران تھا کہ کب اور کیسے اس نے سچ کے زہر کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔ باہر آ کر اس نے ان سے معافی مانگنا چاہی مگر انہوں نے بھیڑیوں جیسے منہ پھاڑ کر کہا۔ ''تمہارے اپنے گھر میں بھی بھیڑ ہے۔ اب دیکھتے ہیں تم اسے کیسے بچاتے ہو۔''

وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔اس نے سوچا تھا بہت ہوا تو سیپ بند کر دیں گے یا زیادہ سے زیادہ گاؤں سے نکال دیں گے مگر اس نے یہ کچھ نہیں سوچا تھا۔ یوں یہ کوئی ایسی انہونی یا بعید از قیاس بات بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے برابر کے شریکوں کی بھیڑ دن دیہاڑے ذبح کر کے ہڑپ کر سکتے تھے۔ وہ تو ایک غریب کمی تھا جس کا کوئی جوان بیٹا نہ بھائی۔ اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ بھاگم بھاگ کسی طرح ان سے پہلے گاؤں پہنچ جائے۔

اگلے روز گاؤں میں صبح تو ہوئی مگر ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ لگتا تھا چڑیاں آج گھونسلوں سے باہر نہیں آئیں۔ فاختائیں گھگھو گھوہ الاپنا، بطخیں جوہڑوں میں تیرنا اور کوے منڈیروں پر بیٹھ کر بچھڑے ہوؤں کے سندیسے دینا بھول گئے۔ گلیوں میں اداسی کی دھول اڑنے لگی، درخت سرگوشیاں کرتے، آہیں بھرتے اور گلیوں کے آر پار کی کچی پکی دیواریں ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر بین کرنا چاہتیں۔

ہنس کر بات کرنا اس کی عادت تھی اور اس نے جس کسی سے بھی بات کی تھی وہ سر میں خاک ڈالے گریبان پھاڑے گلیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ تنوروں نے اس روز ادھ جلی روٹیوں کو جنم دیا۔ پنگھٹ کے کنوئیں کی چرخی سے رونے کی سی آواز نکلی اور بوکا اتنا وزنی ہو گیا کہ نکالنا مشکل ہو گیا۔ لگتا تھا پنج پھولاں رانی کے بدن کی روشنی سے محروم ہو کر پوری بستی ویران اور تاریک ہو گئی ہے۔

اس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ ننھیال سے اس کا ماموں آیا اور راتوں رات اسے ساتھ لے گیا کیونکہ ممانی سخت بیمار تھی مگر کسی کو اس بات پر یقین نہ آیا۔ سب جانتے تھے کہ وہ اپنے ماموں زاد سے بیاہ کرنے سے انکار کر چکی تھی اور اس کے ننھیال والے ایک عرصہ سے خفا تھے مگر کسی کو اس بات کی بھی سمجھ

نہیں آتی تھی کہ وہ گئی کس کے ساتھ تھی۔ وہ جس جس کے ساتھ بھاگ سکتی تھی، وہ سب تو ٹھنڈی آہیں بھرتے،گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ اس کی ہمجولیوں میں سے صرف شیدو مہترانی کو جو گھروں میں صفائی کا کام کرنے جاتی تھی معلوم تھا کہ اس کی جون بدل گئی تھی اور کھیتوں کھلیانوں میں ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے، پیڑوں پر پینگیں جھوٹنے اور تتلی کی طرح ہوا کے دوش پر اڑتی پھرنے والی چنچل لڑکی راتوں رات ایک مریل سی بھیڑ میں تبدیل ہو گئی تھی اور خونخوار بھیڑیوں کے خوف سے ایک بڑی حویلی کے چھوٹے سے تاریک کونے میں دبکی ہوئی تھی۔

میں جگہ جگہ گھومتا اور اس کے لئے افواہیں اور خبریں جمع کرتا۔ اس کی خاطر قتل کرنے اور پھانسی چڑھ جانے والوں کی ڈینگیں سنتا۔گاؤں کے لوگوں کی باتیں اور گھبروؤں کی شکلیں دیکھ کر مجھے ہنسی آتی اور یہ سوچ کر میرا سینہ فخر سے تن جاتا کہ جس روشنی کے اوجھل ہونے کی وجہ سے سارا گاؤں تاریکی میں ڈوب گیا تھا وہ دن رات ہمارے گھر کے پسار اور کوٹھڑی میں جگمگاتی اور نور برساتی تھی۔ خوشی کے مارے میرے اندر میرا ہم عمر کان پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں ڈھولے گاتا۔

’’چھتی بمبی اے ٹاہلی۔ ہیٹھ اے بھیڈاں دا واڑا

بھیڈاں نیں ڈب کھڑبیاں ۔۔‘‘

مگر پھر یہ سوچ کر کہ خونخوار بھیڑئیے اس کی بو سونگھتے ہوئے اس تک پہنچ گئے تو کیا ہو گا۔ میں پریشان ہو جاتا اور اندر ہی اندر غصے کی سل پر انتقام کی چھریاں رگڑنے لگتا۔ ایک ساتھ بہت سے گھوڑوں پر سوار ہو کر باگھ بگھیوں کے گرد گھیرا ڈال لیتا۔

وہ مجھ سے گلیوں، چوپالوں اور تھڑوں پر ہونے والی باتیں سنتی۔ بادشاہوں اور خوبصورت رانیوں کی کہانیاں سنتی سناتی اور بھیڑیوں کے تیز دانتوں اور نوکیلے پنجوں کے خوف کو ایک طرف رکھ کر ہنسی مذاق کی باتیں کرتی۔اس کے ہنسنے کا منظر عجیب ہوتا۔ میری آنکھیں چندھیا سی جاتیں۔میرے اندر سے دگنی عمر کا مرد نکل کر اس کے قدموں میں بیٹھ جاتا اور کہتا۔

’’اذن دو۔ میں ساری دنیا کے بھیڑیوں کے پیٹ پھاڑ آؤں۔‘‘

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیتی اور مدھم سریلی آواز میں عبدالستار کی یوسف زلیخا گنگنانے لگتی۔

’’ہے میں ایسے مار مکائیاں دیسوں دور کرائیاں۔‘‘

پھر ایک ایک کر کے میری سکول کی کتابیں اور گھر میں موجود پنجابی سی حرفیاں اور بارہ ماہے ختم ہو گئے مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی خوف کی سیاہ رات ختم نہ ہوئی۔

وہ سارا دن اندر چھپی رہتی رات کے وقت تھوڑی دیر کے لئے باہر آتی۔اس نے چھابے اور چنگیریں بنا بنا کر گھر کی ساری پڑچھتیاں بھر دیں۔ بستر کی چادروں تکیوں کے غلافوں پر پھول کاڑھ کاڑھ کر اس نے پورے گھر کو گلزار بنا دیا۔ اس کے گھر والے چوروں کی طرح چھپ کر رات کی تاریکی میں اسے ملنے آتے اور تسلی دے جاتے۔ وہ مجھ سے کہتی۔

''اگر تم نے ہوتے تو میں گھٹ کر مر جاتی۔ تم سے باتیں کر کے میرا دل بہلا رہتا ہے۔''

وہ اپنے ابا کے سچ بولنے پر خوشی کا اظہار کرتی اور فخر سے کہتی۔ ''ابا نے میرا مان رکھ لیا ہے۔ اندھیرا تو چھٹ جائے گا مگر کالک کبھی نہ اترتی۔''

وہ مجھے یقین دلاتی کہ وہ اداس اور پریشان نہیں ہے مگر میں اسے قید جیسی زندگی گزارتے دیکھ کر اداس ہو جاتا۔ دل ہی دل میں غصے سے کھولتا اور طرح طرح کے خطرناک منصوبے بناتا رہتا۔

پھر اس نے مجھ سے خط لکھوانا شروع کر دئیے۔

وہ بولتی جاتی اور میں لکھتا جاتا۔ گرمیوں کی سخر دوپہروں میں اور بعض اوقات رات کو لالٹین کی روشنی میں ہم پہروں اکٹھے بیٹھ کر اس کے نام چٹھیاں لکھتے۔ یہ بڑی انوکھی، دلچسپ اور خوبصورت باتیں ہوتیں جو میں نے کہیں پڑھی سنی نہیں تھیں۔ اس کی بے وفائیوں، بے خبریوں اور سنگدلیوں کی شکایتیں اور شکوے ہوتے اس کے فراق میں اپلوں کی طرح سلگنے، پانی کے بغیر مچھلی کی طرح تڑپنے اور صابن کی گاچی کی طرح کھرنے کا ذکر ہوتا۔ وہ اسے بار بار تاکید کرتی کہ وہ جلد از جلد آئے اور اسے بھیڑیوں کے خوف اور قید کی سی زندگی سے رہائی دلائے۔ لکھ لکھ کر میرے ہاتھ تھک جاتے مگر اس کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ میں جب تک لکھتا رہتا وہ سامنے بیٹھ کر پنکھا کرتی رہتی۔ پھر خط کو تہ کر کے اپنے پاس رکھ لیتی اور اگلے روز شیدو کے آنے اور خط لے جانے کا انتظار کرنے لگتی۔

کبھی کبھی مجھے اس پر،جسے میں نے اس وقت تک دیکھا ہوا نہیں تھا،غصہ آتا۔ آخر وہ اس کے کسی خط کا جواب کیوں نہیں بھیجتا تھا مگر پھر سوچتا کیا پتہ جواب آتا ہو، مگر وہ مجھے بتاتی نہ ہو اسے پڑھنا تو آتا ہی تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اس کا نام اور پتہ اور اس کے بارے میں بہت سی دوسری باتیں چھپاتی تھی۔ شاید اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا یا شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

اس کے گھر والوں کا ہمیشہ سے اصرار تھا کہ گھر کی بات ہے۔ قرض لئے بغیر فرض ادا ہو جائے گا اسے اس کے ننھیال میں بیاہا جائے مگر اسے اپنے ماموں زاد سے چڑ تھی۔ کہا کرتی ''ہے تو وہ میرے ماموں کا بیٹا مگر خدا معاف کرے شکل سے بالکل بھیڈ کٹ لگتا ہے۔''

میرے گھر والوں نے اس کے ابا کی پھٹی پرانی پگڑی پاؤں سے اٹھا کر اسے لوٹاتے ہوئے تسلی دی تھی مگر ساتھ ہی ہدایت بھی کی تھی کہ وہ جلد از جلد کوئی مستقل انتظام کر لے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کے والدین کا اصرار کہ وہ ننھیال میں شادی کرنے پر رضامند ہو جائے، بڑھتا جا رہا تھا مگر وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

پھر ایک دن میری چھٹیوں کا حساب کر کے وہ نہایت پریشان ہوئی کہنے لگی۔

''تم چلے جاؤ گے تو میں ایک دن بھی اس کال کوٹھڑی میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔''

مجھ سے اکثر اپنی سہیلیوں، ان کی مصروفیتوں اور کپڑوں گہنوں کے بارے میں پوچھتی۔ شیدو آتی تو اس سے دیر تک سرگوشیاں کرتی۔ گاؤں کے تالابوں، ٹیلوں، فصلوں، کھیتوں اور دھوپ میں چرتے ہوئے مویشیوں کے بارے میں پوچھتی۔ بیٹھی بیٹھی اچانک مجھ سے پوچھ لیتی۔

''جلاہوں کے گھر کے سامنے والی گلباسی پر پھول لگتے ہیں ؟''

''مسجد کی منڈیر پر کبوتر بیٹھتے ہیں ؟

پنگھٹ کے کنوئیں کی چرخی سے گیڑتے ہوئے روں روں کی آواز سنائی دیتی ہے؟''

کبھی کبھی مجھے وہ چٹھیاں زبانی سناتی جو اس نے مجھ سے لکھوا کر وقتاً فوقتاً شیدو مہترانی کے ہاتھ اسے بھجوائی ہوتیں۔ میں حیران ہوتا اس کی یادداشت اور حافظے کی داد دیتا۔ وہ چٹھی کا مضمون سناتی اور مجھے یاد آتا کہ میں نے بالکل یہی کچھ لکھا تھا مگر لکھتے وقت میرے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ اسے وہ سب باتیں ازبر ہو جاتی ہوں گی۔

پھر ایک رات اس کی ماں ملنے آئی تو دونوں ماں بیٹی دیر تک باتیں کرتی رہیں اور اگلے روز مجھے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ وہ اپنے ماموں زاد سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا تو رو دی۔

کہنے لگی۔ ''کیا کرتی؟''

'' اور وہ'' میں نے پوچھا۔ ''جسے ہم نے اتنے خط لکھے۔''

کہنے لگی۔ ''اس کا ذکر اور انتظار اب فضول ہے۔ وعدہ کرو تم بھی اب اس کا ذکر کبھی نہیں کرو گے۔''

میں نے وعدہ کر لیا مگر میں حیران تھا اور پریشان بھی۔ اب کسی روز چپکے سے اس کا ماموں زاد جو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ آئے گا اور اسے لے جائے

گا۔شہنائی بجے گی نہ ڈھولک۔ اسے مہندی لگائی جائے گی نہ اس کی سہیلیاں گیت گائیں گی اور سب سے بڑھ کر وہ صدمہ جو ایک نہ ایک دن پورے گاؤں کو مل کر سہنا تھا اب مجھ اکیلے کو برداشت کرنا ہو گا۔

اور پھر ایک رات

جب چاند ڈوب چکا تھا۔ ہوا بند تھی اور باہکوں سے ریوڑوں کی رکھوالی کرنے والوں کی گھگھیائی ہوئی آوازیں آ رہی تھیں، گلی میں آہٹ ہوئی اور پانچ چھ مسلح گھوڑ سوار گھر کے دروازے کے سامنے آ کر رکے۔ پچھلے کئی دنوں سے مختلف اطراف سے ڈاکے پڑنے کی خبریں آ رہی تھیں۔ ہمارے اوسان خطا ہو گئے مگر ابا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پتہ چلا کہ بارات تھی۔

پورے چالیس روز بعد خوفناک، طویل اور باگھ بگھیلی رات ختم ہوئی تھی یا شاید شروع ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر میں اس کے ماں باپ، نمبردار اور مولوی صاحب بھی آ گئے مجھے چھت پر نگرانی کے لئے بھیج دیا گیا۔

جب نکاح ہو رہا تھا، اچانک میرا جی چاہا سب سے اونچی منڈیر پر کھڑے ہو کر ہوکا دوں۔ ’’گاؤں والو۔۔ جاگو۔۔ گاؤں لٹ گیا۔‘‘

رخصت ہونے سے پہلے اس نے مجھے اندر بلوایا۔

گلے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ پھر جاتے ہوئے سسکی روک کر آہستہ سے بولی۔

’’تمہارے کپڑوں کے ٹرنک میں ایک پوٹلی رکھی ہے اسے سنبھال کر رکھنا۔‘‘

دوسرے روز صبح ہوئی

چڑیاں چہچہائیں

کوے بچھڑے ہوؤں کے سندیسے لے کر منڈیروں پر آ بیٹھے

جلاہوں کے گھر کے سامنے والی گلباسی پر پھول کھلے

پنگھٹ کے کنوئیں کی چرخی سے کرلانے کی آواز گونجی۔

اور سیڑھیوں کے درمیان بیٹھ کر اپنے نام اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط پڑھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

***

بند مٹھی میں جگنو

جب پڑوس میں عورتوں کی لڑائی شروع ہوئی وہ گھر میں اکیلی تھی۔ وہ شہر سے اپنے ساتھ کوئی کتاب یا رسالہ نہیں لائی تھی۔ وہ کتابوں اور رسالوں سے اکتا گئی تھی۔ لیکن وہ شریف کی آٹھویں جماعت کی پھٹی پرانی کتابوں کو صبح سے کئی بار جھاڑ پونچھ چکی تھی۔

شریف اور ببلو صبح سے شریفاں کو لینے چچا کے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ لیکن اسے گھر کی ہر چیز سے شریفاں کے بدن کی خوشبو آ رہی تھی۔ شریفاں گھر میں نہیں تھی لیکن لگتا تھا ہر جگہ ہر چیز میں موجود ہے اور وہ؟۔۔ وہ موجود تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے کہیں نہیں ہے۔

تھوڑی دیر پہلے،کھیتوں کو روٹی لے کر جاتے وقت،پھوپھی اس پر تنہائی کا ٹوکرا رکھ گئی تھی۔ اگر پڑوس میں عورتوں کی لڑائی شروع نہ ہوتی تو اسے خود کو بار بار ٹٹول کر دیکھنا پڑتا کہ وہ ہے یا نہیں ہے۔

تنہائی کے ٹوکرے کے نیچے پڑے پڑے اسے بدبو کے بھبوکوں نے گھیر لیا تھا کہ پڑوس کے آنگن میں بادل سے گرجے اور چپ کے کھڑے پانیوں میں آوازوں کے پرنالے گرنے لگے۔

یہ جولائی کے آخری دن تھے۔

سچ مچ کے بادلوں اور اصلی دھوپ میں آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ سورج لمبی لمبی زبانیں نکال کر سرمئی بادلوں کے نحیف جسموں سے نمی چاٹ رہا تھا۔

بچپن میں اس کا خیال تھا کہ آسمان پر ہزاروں لاکھوں سورج ہیں اور ہر روز نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک یہی سمجھتی رہی کہ ہر شام ایک سورج بجھ جاتا ہے اور اگلی صبح ویسا ہی یا موسم کے لحاظ سے چھوٹا بڑا سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ اسے سارے سورج اچھے لگتے تھے۔ زندہ اور دہکتے ہوئے بھی اور بجھ کر ڈوب جانے والے بھی۔۔ شاید ان بجھے ہوئے ٹوٹے پھوٹے سورجوں کے ڈھیر سے بھی اکثر کار آمد ٹکڑے مل جاتے تھے جنہیں فرشتے چمکا کر راتوں کو چاند کے روپ

میں طلوع کر دیتے تھے۔ مگر اب اسے پتہ تھا کہ ایک ہی پرانا سورج اور ایک ہی تھکا ہارا چاند ہر روز استعمال ہوتے ہیں۔

پرانی چیزوں سے اس کا جی اُوبھ گیا تھا۔

تازگی کا عالم گیر قحط پڑا ہوا تھا۔ ہر صبح بوسیدگی کی دبلی گائیں تازگی کی فربہ گایوں کو ہڑپ کر جاتی تھیں۔

ًًًً تازگی کو سورج کی شعاعوں سے بچا کر فریج میں کئی کئی دن تک رکھا جاتا تھا۔ تازگی آٹھ آٹھ دن کی مری ہوئی مچھلیوں کی صورت بکتی تھی۔ جسموں کی بوسیدگی کو ڈھانپنے کے لئے نئے فیشن رائج ہوتے تھے اور آوٹ آف ڈیٹ نظریات پر لفظوں کا ملمع چڑھایا جاتا تھا۔

ٹیلی ویژن اور فلموں کی نقلی لڑائیاں، سنے سنائے لطیفوں کی طرح بور لگتی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کی لڑائی میں اورجینلٹی کا تصور کر کے اس نے اپنے آپ کو چپ کے ٹوکرے سے نکالا اور ایک ایک کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بڑے گھمسان کار ن پڑا تھا۔

آوازوں کے ہوائی گولے فضا میں دور دور جا کر پھٹنے لگے تھے۔

ٹھاہ۔۔ ٹھاہ۔۔ ٹھاہ۔۔

وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔اسے آزادی اور تازگی کا احساس ہونے لگا اور جی چاہنے لگا کہ وہ مرغیوں کے ڈربے پر کھڑی ہو کر ان دور افتادہ لوگوں کو آواز دے جو اپنے اپنے انڈوں میں زندہ چوزوں کی طرح باہر نکلنے کے لیے ٹھونگے مار رہے تھے۔

لڑنے والیوں کے چہروں پر آگ کے شعلے تھے،نفرت کے مکروہ جالے نہیں تھے۔ان کی آوازوں میں بجلی کی کڑک تھی،سانپوں کی پھنکار نہیں تھی۔ ان میں سے وہ نوراں اور مہراں کو پہچانتی تھی۔شریفاں اکثر ان دونوں کا ذکر کرتی تھی اور کل شام وہ اسے ملنے بھی آئی تھیں۔ مگر اب پتہ چلا کہ وہ دونوں پھپھے کٹنیاں ہیں۔

کاش وہ بھی پھپھے کٹنی ہوتی۔

آدمی ایک ہی نام سے اور ایک ہی حیثیت میں رہتے رہتے کتنا اکتا جاتا ہے۔ اس کے جسم پر چکنائی اور میل کے دھبے پڑ جاتے ہیں اور اس کی روح کو یکسانیت کی دیمک چاٹنے لگتی ہے۔

ابا عید کی نماز پڑھنے ایک راستے سے جاتے اور دوسرے سے واپس آتے کہ نئے راستے پر چلنے سے زیادہ ثواب ملتا تھا۔کاش لکیر کے فقیروں کی سمجھ میں یہ بات آسکتی!

وہ خود بھی ہر روز جس راستے سے کالج جاتی اسی راستے سے واپس آتی ہر سال وہی پرانے نوٹس،پرانی باتیں اور دہرائے ہوئے لیکچرز دہراتی۔اسے عظیم مفکروں کے زریں اقوال دہراتے ہوئے شرم آنے لگتی جیسے وہ کلاس کو دونی کا پہاڑا یاد کرا رہی ہو۔کبھی کبھی دونی کا پہاڑہ پڑھتے پڑھتے آواز اس کے حلق میں پھنس جاتی،کندھوں پر سر کی جگہ چکی کا پاٹ رکھا محسوس ہوتا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا۔ اکثر متلی ہو کر طبیعت بحال ہو جاتی ورنہ ہوش آنے پر پتہ چلتا کہ اسے دورہ پڑا تھا۔

اس نے خود ہی اپنے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ روز شریفاں کے پاس چلی جائے۔جب سے کالج بند ہوا تھا اس کے ذہن میں ہر وقت چھوٹی چھوٹی بھنبھیریاں اپنے آپ چلتی رہتی تھیں۔ وہ سوچنا نہ چاہتی تو بھی سوچ کی سخت جان اور بد شکل چھچھوندر اس کے دماغ میں تھوتھنی ڈالے مسلسل چیختی رہتی۔

لڑنے والیاں دیورانی اور جٹھانی واضح گروپوں میں تقسیم تھیں۔

دونوں جانب ایک ایک بڑی اور تین تین چار چار چھوٹی عورتیں تھیں۔لیکن گھوڑ سوار سے گھوڑ سوار اور پیادے سے پیادہ لڑ رہا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے چھوٹیاں بڑے بڑے خوابوں کے رسوں سے جکڑی ہوئی ہیں۔

خواب؟

معدے کی گرانی؟

واہمے؟

لاشعور میں چھپی ہوئی خواہشات۔

ایک بار اس نے دیکھا وہ چائے بناتے بناتے خود کیتلی میں بند ہو گئی ہے۔ وہ چیختی چلاتی ہے مگر کوئی ڈھکنا نہیں اٹھاتا یہاں تک کہ اس کا دم گھٹ جاتا ہے اور وہ مر جاتی ہے۔

اکثر اسے شک ہوتا کہ وہ خواب نہیں تھا اور وہ واقعی مر چکی ہے وہ اکثر خود کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی رہتی کہ وہ ہے یا نہیں ہے؟

بھرے پرے گھر میں بھی اس پر اداسی اور تنہائی کے تنبو ہر وقت تنے رہتے۔کبھی کبھی وہ اپنے جسم کی ان پڑھی کتاب کھول کر خود ہی تصویریں دیکھنے بیٹھ جاتی،پھر میلی ہونے کے ڈر سے بند کر کے ایک طرف رکھ دیتی۔

پھر جب دونی کا پہاڑا سینکڑوں مرتبہ دہرانا پڑتا، اسے ہر چیز باسی محسوس ہونے لگتی۔ اسے اپنا جسم۔۔ جس پر اسے خود بھی سونے کا پانی چڑھا ہوا لگتا تھا،سوکھا چمڑا نظر آنے لگتا۔پسینے سے مردہ مچھلیوں کی بدبو آتی اور کتاب یا

رسالہ کھول کر بیٹھتی تو جگہ جگہ مری ہوئی مکھیاں چپکی دکھائی دیتیں۔ بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن میں سوچ کی مکروہ چمگادڑ چکر لگانے لگتی اور اسے ہر چیز سے گھن آتی۔ موسیقی مردہ کوے کی لاش پر سینکڑوں کوؤں کی کائیں کائیں معلوم ہوتی۔ انڈوں سے مرغی کی بیٹ،روٹی سے برادے اور سالن سے مردہ گوشت کی سڑاند آتی۔بدبو کے بھبھوکے اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے، اس کا جی متلانے لگتا اور وہ قے کرنے لگتی۔

جیٹھانی گروپ کی عورتیں چڑیلیں، ڈائنیں اور پچھل پیریاں تھیں خون چوستی کلیجے چباتی اور بڑے ول چھل جانتی تھیں۔

دیورانی گروپ کی عورتیں لچیاں لفنگیاں اور مشٹنڈیاں تھیں وہ آنکھ مٹکا کرتی،چن چڑھاتی اور ادھل جاتی تھیں------اسے ان پر رشک آ رہا تھا۔

آنکھ مٹکا کرنے، ول چھل جاننے اور اپنے یار کے ساتھ ادھل جانے میں کتنی زندگی اور رومان تھا،اس میں اسے کہیں کھوٹ نظر نہ آتا تھا۔سچ کی اس چلچلاتی دھوپ میں اسے اپنا آپ ابر آلود مطلع کی طرح لگا۔

جیٹھانی کی مرغیوں کی عادت تھی کہ وہ دیورانی کے گھر انڈہ دیتیں اور کڑ کڑ کرنے اپنے گھر آ جاتی تھیں مگر دیورانی کا بیان تھا کہ وہ فاحشہ مرغیاں اپنے بانجھ پن کو چھپانے کیلئے کڑ کڑ کرتی اور انڈوں کی بجائے مرغوں کی طرح اذانیں دیتی تھیں۔

بعض باتیں اپنے مخصوص جغرافیائی اور مقامی حوالوں کی وجہ سے اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھیں مگر موضوع بدلتے دیر نہیں لگتی تھی اور صنائع بدائع کا استعمال زبان و بیان کو دلچسپ اور متنوع بنا رہا تھا۔خاص کر صنعت اغراق اور غلو کی ایسی نادر مثالیں کتابوں میں کہاں ملتی تھیں، البتہ تشبیہات کبھی کبھی زیادہ قریب الفہم ہونے کی وجہ سے درجہ بلاغت سے گر جاتیں۔

گھر میں سب محتاط رہتے کہ اس کی طبیعت کے خلاف کوئی بات نہ ہو لیکن شہر کے لوگ اس امر سے بے خبر تھے کہ گھسی پٹی اور دہرائی ہوئی باتوں کی شناخت کے لئے ایک قد آدم آلہ ایجاد ہو چکا ہے جو متروک اور بانجھ چیزوں کی سو فیصد درست نشاندہی کرتا ہے۔

لڑائی کے بہانے پچھلی سات پشتوں کا سرسری سا جائزہ بھی لیا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں گڑے مردے اکھاڑنے کی کیا تک تھی۔ پتہ نہیں ہوں بھی کہ نہیں اور اگر ہوں تو ان کے تن پر کفن ہوں یا نہ ہوں اسے قبرستانوں میں راتوں کو الاؤ کے گرد ناچتی ننگی عورتوں کے قصے یاد آئے۔ اس کا جی چاہا وہ بھی کسی رات چھپ کر قبرستان چلی جائے۔

لڑنے والیاں اب طعنوں مہنوں کی دلدل سے نکل کر پلوتوں اور گالیوں کے گہرے پانیوں میں اتر چکی تھیں۔

ایسی الف ننگی گالیاں اس نے زندگی میں پہلی بار سنی تھیں۔انسانی اعضا کے نام سن کر اس کے ذہن کے پنجرے میں قید بے شمار چھوٹی چھوٹی چڑیاں یکبارگی پھر سے اڑ گئیں اس کے بدن سے ہمیشہ سے چمٹی ہوئی جونکیں ایک ایک کر کے جھڑنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اندر ایک نیا سورج اُگنے لگا۔ اس کا سارا جسم اس کی کرنوں سے دمکنے لگا۔لذیذ سی گرمی سے رخسار تمتمانے لگے۔پسینے سے سارا جسم بھیگ گیا۔اسے اپنے پسینے سے پہلی بار تازہ گلاب کی خوشبو آئی اور یوں لگا جیسے اس کا بدن ہلکا ہو کر زمین سے اوپر اٹھتا جا رہا ہو۔

اسی لمحے شریفاں آ گئی۔

شریفاں کا بپھرا ہوا جسم گھر بھر میں پھیل گیا وہ اس کے جسم کی کشش اور آواز کی ڈور کے سہارے زمین پر واپس آ گئی۔

اچھی بھلی مزے کی لڑائی ہو رہی تھی کہ اچانک خطرے کا سائرن بجنے لگا۔ مرد گھروں میں داخل ہوئے اور دونوں طرف برچھیاں اور بلمیں چمکنے لگیں۔

خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے۔مردوں کی لڑائی بہرحال سینما کی سکرین پر ہی اچھی لگتی تھی۔ اسی لمحے خدا نے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا۔ ساٹھ ستر برس کا ایک با وقار بوڑھا جس کی چال میں متانت اور چہرے پر بے پناہ ذہانت تھی اندر آیا۔۔ اور فریقین کے درمیان صلح و امن کی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔

شریفاں نے اسے بتایا جسے وہ فرشتہ سمجھ رہی ہے وہ احمد دین تیلی ہے۔اسے یقین نہ آیا مگر جب انہوں نے اسے دھکیل کر ایک طرف کر دیا تو اسے یقین آ گیا۔

امن کی کوششیں ناکام ہوتی دیکھ کر خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ پیٹ سے باہر لٹکتی آنتوں اور گردن کے بغیر تڑپتے دھڑوں کا تصور کر کے وہ لرز گئی۔ مگر اسی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔

ایک چھوٹے قد کا مریل سا آدمی اندر آیا اور آتے ہی فریقین کو فحش گالیاں دینے لگا اسے دیکھتے ہی تنی ہوئی گردنیں اور اٹھی ہوئی بلمیں جھک گئیں۔ چھتوں پر کھڑی عورتیں اور بچے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان کار زار برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔

شریفاں نے اسے بتایا،چھوٹے قد کا مریل سا وہ شخص بہت بڑا چودھری اور گاؤں کی ایک تہائی زمین کا مالک ہے۔اس کی طبیعت متلانے لگی۔ اور اسے اپنا آپ بند مٹھی میں جگنو کی طرح لگنے لگا۔۔ مکروہ خیالوں کی بد صورت چھچھوندریں اس کے ذہن میں تھوتھنی ڈال کر چیخنے لگیں۔

گاؤں کے ننگ دھڑنگ سینکڑوں بچے اس کے گرد جمع ہو کر دونی کا پہاڑا پڑھنے لگے۔

غلیظ مکھیاں چاروں طرف بھنبھنانے لگیں چربی جلنے کی سڑاند ہر طرف پھیل گئی۔چکی کے پاٹ کے نیچے اس کا دم گھٹنے لگا اس نے تازہ ہوا میں سانس لینے کی کوشش کی مگر بہت ساری بھن بھناتی مکھیاں اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھیں،وہ قے کرنے لگی۔

***

بانجھ ہوا میں سانس

گھپ اندھیری رات۔۔۔ ہوا بند۔۔۔ اندر باہر دم گھونٹنے والا حبس۔ اوپر گرد آلود آسمان اور بجھتے ہوئے ستارے۔ نیچے ہانپتے ہوئے بیل کے سینگوں پر ڈولتی زمین!

اندر مچھروں کی گھوکر۔ باہر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر روتے کتوں اور آپس میں لڑتی بلیوں کی آوازیں۔گھر کا اکلوتا کمرہ۔۔۔ جس کا دروازہ گلی میں کھلتا ہے۔ ہَوا بھول کر اندر آ جائے تو اسے باہر جانے کا راستہ نہ ملے۔۔۔ وہ پسینے میں شرابور۔۔۔ ننگی چارپائی پر لیٹا ہے۔ اور جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو یا اس کے منہ اور نتھنوں میں روئی ٹھونس دی گئی ہو، اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر روتے کتوں تا آپس میں خوفناک غرہٹوں سے لڑتی بلیوں یا پھر اپنے ہی گلے سے نکلنے والی عجیب و غریب آوازوں کو سن کر ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا اور کھنکار کھنکار کر سانس لینے کے عضلات صاف کرتا ہے۔ اس کا سانس پھولا ہوا ہے اور وہ یوں ہانپ رہا ہے جیسے سو کر نہیں اٹھا میلوں لمبی دوڑ لگا کر آیا ہے۔ وہ ہانپتا ہوا اٹھ دروازے تک آتا ہے اور سنسان گلی میں کھڑے ہو کر چھت پر سوئے ہوئے بیوی بچوں کو مدد کے لئے پکارتا ہے مگر اسے کوئی جواب نہیں ملتا وہ چھت پر جانا چاہتا ہے مگر چھت پر جانے کے لئے کوئی سیڑھی نہیں ہے اس کی بیوی اور بچے بغل والی حویلی کی طرف اپنے گھر کی چھت پر جاتے ہیں اور چونکہ بڑی حویلی کی عورتوں کی بے پردگی کا احتمال ہے اس لئے اسے اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

وہ دو بارہ گرد آلود آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بیوی کو آواز دیتا ہے اپنی آواز اسے عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے بالکل ایسی ہی جیسی آوازیں سن کر وہ جاگا ہے۔ اسے اب بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔ وہ تھک ہار کر گلی کے کچے فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے۔ اسے خود حیرانی ہوتی ہے کہ وہ اس طرح بیٹھنے پر کیوں مجبور ہے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اوپر منہ کر کے آوازیں دیتا رہتا ہے۔ پھر پھٹے پرانے کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑتا ہوا اس کے قریب سے گزرتا ہے تو اسے یہ جا کی حیرت ہوتی ہے کہ ہوا بند نہیں ہے۔

ہَوا بند نہی ہے لیکن یہ کیسی بانجھ ہوا ہے جس میں اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ شاید دھوپ میں مسلسل کام کرنے اور شدید گرمی اور حبس میں اندر سونے کی وجہ سے حبس نے اس کے اندر جگہ جگہ بل کھود لئے ہیں۔ کیا پتہ اسے سانس کی تکلیف ہو گئی ہو آخری عمرمیں ابا کو بھی دمہ ہو گیا تھا رات رات بھر وہ اسی طرح سینے کی چاٹی میں سانس کی مدھانی ڈالے رڑکتا رہتا تھا مگر اسی لمحے ایک مریل سا کتا ہانپتا

ہوا اس کے قریب آتا ہے اور اس کے پاؤں چاٹنے لگتا ہے شاید اسے بھی دمہ ہو گیا ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں اور جلدی جلدی سانس لینے لگتا ہیں پھر اسے چھت سے سوئی ہوئی بیوی اور بچوں کی خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے کوئی ان کے گلوں پر چھری چلا رہا ہو۔ وہ پریشان ہو کر انہیں پھر آواز دیتا ہے مگر گھٹی ہوئی چیخوں اور کراہوں کے سوا کچھ جواب نہیں ملتا تو کیا ان سب کو دمہ ہو گیا ہے؟ وہ اور کتا اٹھ کر گلی کا چکر لگاتے ہیں۔ ہَوا چل رہی ہے۔

مگر حسن سے دم گھٹا جاتا ہے۔ پتہ نہیں ہوا کو کیا ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری ہَوا باسی ہو گئی ہے اور خود تاہ جھونکوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارتی پھرتی ہے۔ منڈیروں کو چھو کر گزرتے ہوئے اسی کی کراہیں نکلتی ہیں اور ممیا ہٹیں سنائی دیتی ہیں۔

اچانک اسے یاد آتا ہے کہ آج مہینے کی وہی تاریخ ہے جس کے بارے میں وہ کئی دنوں سے مختلف افواہیں سن رہا تھا۔ کہتے تھے نئے مہینے کی پہلی تاریخ سے ہوا بدل جائے گی اور اس میں جانداروں کو سانس لینا دشوار ہو جائے گا اس نے شیخوں کی ہٹی، چوپال اور مسجد میں ہر جگہ یہ باتیں سنی تھیں نمبردار اور چودھریوں کے ہاں ہوا سے بھرے ہوئے بالکل ویسے ہی سلنڈر دیکھے تھے جیسے ہسپتالوں میں ہوتے ہیں ان میں سانس لینے کے لئے نلکیاں لگی ہوئی تھیں اسے یاد پڑتا ہے شاید اس ہوا کو آکسیجن کہتے تھے۔ گاموں ترخان کے لڑکے نے جو شہر میں پڑھتا تھا اسے بتایا تھا کہ ہوا سے بہت سی گیس نکال لی جائے گی اور اسے سلنڈروں میں بھر کر ڈپوؤں پر فروخت کیا جائے گا اور ہر شخص کو زندہ رہنے کے لئے ہوا سے بھرے ہوئے سلنڈر ہر وقت ساتھ رکھنا ہوں گے مگر اسے ان باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے؟ اور بھلا اتنی ساری ہوا سے گیس کیسے نکالی جا سکتی تھی لوگ کندھوں پر گیس کے سلنڈر اٹھائے کام کاج کیسے کر سکتے تھے مگر اب اسے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ شاید ٹھیک ہی کہتے تھے یقیناً ہوا میں سے کوئی چیز نکال لی گئی ہے اور جیسے عورت سے حیاء اور مرد سے غیرت نکال لی جائے تو گوشت کے سوا کچھ نہیں بچتا ہوا کا بھی پھوک باقی رہ گیا ہے جس میں اب بستی کے اور بہت سے بچوں، عورتوں اور مردوں کی بلبلاہٹیں اور گھٹی ہوئی چیخیں جیسے انہیں کند چھریوں سے ذبح کیا جا رہا ہو شامل ہو گئی ہیں۔ بستی کے گھروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں اور پھاٹکوں کی چرمراہٹیں سنائی دیتی ہیں چھوٹے گھروں کے مکین گلیوں میں ننگ دھڑنگ دوڑتے نظر آتے ہیں اور بڑے گھروں اور حویلیوں کے پھاٹکوں پر ان کی آہ و زاری اور دستکیں سنائی دیتی ہیں۔

وہ آگے بڑھتا ہے اس کا ساتھی کتا اب زمین پر چپ چاپ لیتا ہوا ہے بڑی حویلی کا پھاٹک بند ہے وہ دستک دینا چاہتا ہے مگر اس کا ہاتھ لرز کر رہ جاتا ہے کچھ دیر کے تامل کے بعد وہ پھاٹک کے نیچے سے لیٹ کر اندر داخل ہوتا اور بیت الخلاء کی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آتا ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ وہ سب سانس کی تنگی کی وجہ سے نیم مردہ حالت میں چارپائیوں پر پڑے تڑپ رہے ہیں اس کی جوان بیٹی دری بے چینی سے دائیں بائیں سرکو جھٹک رہی ہے اس کے بال کھل کر اِدھر اُدھر دور تک پھیل گئے ہیں وہ اس سے لپٹنے کی کوشش کرتی ہے مگر پھر ہانپ کر گر جاتی ہے چھوٹا لڑکا بری طرح ہاتھ پاؤں مارتا اور جیسے آخری سانس لیتا ہے اس کی بیوی حلال کی ہوئی گائے کی طرح نیم مردہ حالت میں پڑی ہے تھوڑی تھوڑی دیر بعد روح اس کے جسم میں کلبلاتی اور تیناں دیتی ہے۔ وہ گلی میں کسی کے قدموں کی آواز سن کر نیچے جھانکتا ہے۔ چھوٹا ملک اس کے گھر کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے اس کے پاس ہوا سے بھرے ہوئے بہت سے چھوٹے چھوٹے سلنڈر ہیں اس نے خود بھی ہوا کی نلکی ناک میں لگا رکھی ہے۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر نیچے آتا اور پھاٹک کا دروازہ کھول کر چھوٹے ملک کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔

''لوگ تو جاہل تھے ہماری باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے'' چھوٹا ملک کہتا ہے ''مگر فتیا تم تو سات آٹھ جماعتیں پڑھے ہوئے تھے اور اتنا عرصہ مل میں بھی کام کرتے رہے ہو تمہیں تو پہلے سے انتظام کر لینا چاہئے تھا کیا تم نے اپنا اور بیوی بچوں کے نام رجسٹر کروائے ہیں ؟''

''نہیں ملک جی بھول ہو گئی۔'' وہ ہانپتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

''تمہیں پتہ ہونا چاہئے فیتا کہ ساری دنیا مین ہوا کی راشننگ ہو گئی ہے جس طرح آٹا، گھی، تیل، چاول، چینی اور زندگی کی دوسری چیزیں کارڈ پر ڈپوؤں سے ملتی ہیں بالکل اسی طرح۔ شہروں کے لوگ تعلیم یافتہ اور عقلمند ہوتے ہیں وہاں تمام انتظامات پہلے سے کر لئے گئے گھروں، کارخانوں، دکانوں، ہوٹلوں، کلبوں، سینما گھروں، ہسپتالوں اور عبادت گاہوں یہاں تک کہ بسوں اور کاروں میں بھی گیس کا مناسب انتظام کر لیا گیا ہے جگہ جگہ ایسے ڈپو قائم کئے گئے ہیں جہاں سے پیدل چنے والوں کو کارڈ دیکھ کر گیس سلنڈر فروخت کئے جا سکیں مگر تم دیہاتی لوگوں کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں کوئی ہماری سنتا ہی نہیں۔ اب دیکھنا کیسے کتوں کی طرح پاؤں چاٹیں گے اور ڈپو کے باہر کس طرح لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے ہانپتے رہیں گے مگر انہیں نہیں پتہ ہر ایرے غیرے کو ہوا کا راشن نہیں دیا جائے گا ہوا صرف ایسے لوگوں کو مہیا کی جائے گی جن کا زندہ رہنا ضروری سمجھا جائے گا۔ ہمیں اپنے گاؤں کے لئے جو کوٹہ ملا ہے وہ تم لوگوں کی بیوقوفی اور بروقت نام نہ لکھوانے کی وجہ سے بہت تھوڑا ہے اب پتہ نہیں کتنے لوگ دوسرا ٹرک آنے تک زندہ رہتے ہیں ''

اس کا دم اس قدر گھٹتا ہے کہ اس کا جی چاہتا ہے چھوٹے ملک سے سلنڈر چھین کر بھاگ جائے مگر اسے بیوی بچوں کا خیال آتا ہے اور ہو ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرتا ہے، ''ہم آپ کے غلام ہیں ملک جی خدا کے لئے ہم پر مہربانی کریں صبح تک ہم سب جائیں گے۔''

’’دیکھو فتے۔۔‘‘ چھوٹا ملک ہمدردانہ لہجہ میں کہتا ہے، ’’ہوا تھوڑی ہے ار لوگ زیادہ ہیں یقیناً بلیک بھی ہو گی مگر میں دن چڑھنے پر تو لوگوں کو مناسب داموں پر لے دوں گا‘‘

’’مناسب دام؟‘‘ وہ بو کھلا کر کہتا ہے ’’ملک جی آپ تو جانتے ہیں جسے مل کی نوکری چھوٹی ہے ہم اکثر فاقے کرتے ہیں ہمارے پاس دام کہاں۔۔۔ ہم آپ کی خدمت۔۔‘‘ ’’اچھا‘‘۔ چھوٹا ملک راز دارانہ لہجے میں کہتا ہے ’’ان لوگوں کے لئے جو تابعدار ہیں اور وہ جو اس کا وعدہ کریں اور اس پر قائم رہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم اس طرح کرو کہ داری والی شرط منظور کر لو۔۔۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا‘‘ اسے یاد آتا ہے ایک بار اس نے داری کے سلسلے میں چھوٹے ملک کو ڈانٹ پلائی تھی اور دوبارہ اس کی طرف میلی آنکھ اُٹھا نے پر آنکھ نکال دینے کی دھمکی دی تھی مگر یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب ہوا میں سے کئ نہیں نکالا گیا تھا جب ہوا پر قبضہ نہیں ہوا تھا اور اس ی راشن بندی نہیں ہوئی تھی۔ لوگ گھر بیٹھے، کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرتے ہو جگہ آسانی سے سانس لے سکتے تھے اور انہیں اپنے ساتھ گیس سلنڈر نہیں اٹھانا پڑتے تھے۔ ہوا چلتی تھی تو پرندے چہکتے اور بچے کھلکھلاتے تھے۔ ہوا کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں جھانجھریں ہوتی تھیں ہوا خوشبو اور زندگی کا پیغام لے کر قریہ قریہ گھومتی تھی مگر کہیں کوئی حاجت مند نہیں ملتا تھا۔ وہ وقت اور تھا یہ وقت دوسرا ہے وقت کے ساتھ اسے بھی بدل جانا چاہئے ورنہ دری ہی نہیں وہ سب دم گھٹنے سے مر جائیں گے۔ وہ فاقے کر کے زندہ رہ سکتے تھے مگر ہوا کے بغیر رات کا باقی حصہ بسر نہیں ہو سکتا تھا اور کیا پتہ اب تک داری اور اس کی ماں زندہ بھی ہیں کہ نہیں وہ ہانپتے ہوئے گھگھیا کر کہتا ہے۔

’’مجھے منظور ہے ملک جی۔۔۔ آپ جلدی کیجئے۔۔۔ خدا کے لئے‘‘

چھوٹا ملک اسے گن کر تین سلنڈر دیتا ہے۔

دونوں بڑی حویلی کے کھلے پھاٹک کی راہ چھت پر آتے ہیں۔

سلنڈر کی گیس سونگھتے ہی اس کی بیوی اور بیٹا ہوش میں آ جاتے ہیں۔ ساتھ والی چارپائی پر چھوٹا ملک داری کو ہوش میں لاتا ہے اور۔۔۔!

وہ آسمان کی طرف منہ کر کے روتے کتوں یا آپس میں خوفناک غراہٹوں سے لڑتی بلیوں یا پھر اپنے ہی گلے سے نکلنے والی ہولناک آوازیں سن کر ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور بھاگ کر کمرے سے باہر آتا ہے۔

باہر گھپ اندھیری رات۔۔۔ ہوا بند۔۔۔ اوپر گرد آلود آسمان اور بجھتے ہوئے ستارے نیچے ہانپتے ہوئے بیل کے سینگوں پر ڈولتی زمین۔۔۔ وہ بیوی اور بچوں کو بلند آواز میں پکارنے لگتا ہے۔

***

بڑا سوال

اس نے اپنے ذہن کی لیبارٹری میں پہلے بھی بڑی بڑی باتیں دریافت کی تھیں مگر اس بار انکشاف کی جو نئی کونپل کھلی تھی وہ نہایت ہی غیر معمولی نوعیت کی تھی۔

ہر بار جب وہ کوئی نئی بات دریافت کرتا تھا اسے بے پناہ خوشی ہوتی تھی مگر اس بار ایسا نہیں ہوا--- اس انکشاف نے اسے پریشان اور مضطرب کر دیا۔ اسے لگا اس نے ایک بڑی چٹان کے نیچے سے مٹی کھود ڈالی ہے اور اب چٹان اسے ہاتھوں پر روکنا پڑ گئی ہے۔

اپنی حماقت پر اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا آخر اسے ایسا تجربہ کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر اب کیا ہو سکتا ہے---- چٹان اپنی جگہ سے سرک چکی تھی۔ بجلی کے سے کوندے نے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مستور منظر کی جھلک دکھا دی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور جو کچھ معلوم ہو چکا تھا وہ واپس لا علمی کے دریا میں نہیں پھینکا جا سکتا تھا۔

کچھ روز ملول اور پریشان رہنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک نئی خواہش کا چیونٹا کا ہلانے لگا ہے کہ وہ حیرت انگیز منظر جس کو اسکی آنکھیں دیکھ چکی تھیں سب کو دکھائے اور داد پائے۔ مگر یہ آسان اور سہل نہیں تھا۔ لوگ نئے خیالات کو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ اسے تمام مشکلات کا بخوبی اندازہ تھا مگر اس کے اندر یہ خواہش کہ وہ سب کو اس حیرت انگیز دریافت سے آگاہ کرے، شدت اختیار کرتی گئی۔

ایک بار جب شہر میں ایک بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا اس کا جی چاہا وہ اچانک اسٹیج پر پہنچ کر ایک ہی سانس میں ساری بات کہ دے مگر اول تو اس کا اسٹیج تک پہنچنا ہی مشکل تھا دوسرا لوگوں کے مشتعل ہو جانے کا ڈر تھا۔ خطرات کا سامنا کرنے کے لئے وہ تیار تھا مگر اسطرح اس کا اصل مقصد ادھورا رہ جاتا۔

پھر ایک بار کسی رشتہ دار کی شادی کے موقع پر جب بہت سے لوگ ایک جگہ جمع تھے اسکا جی چاہا اعلان کر دے۔مگر پھر وہ یہ سوچ کر کہ رشتہ دار پہلے

ہی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے وہ اس کی بات پر یقین کرنے کی بجائے اسے غلط معنی پہنانے کی کوشش کریں گے، خاموش رہا۔

آخر کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اس کام کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی چاہئے اور اپنی بیوی کو اعتماد میں لینا چاہئے۔ اس کی بیوی پڑھی لکھی اور ذہین عورت تھی اور اگرچہ وہ بھی اس کے بارے میں کوئی زیادہ اچھی رائے نہیں رکھتی ہو گی----- مگر وہ ایک روایتی بیوی کی طرح اس کی وفا دار ضروری تھی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی بات سن کر حیرت سے اچھل پڑے گی مگر اس نے نہایت اطمینان سے اس کی بات سنی اور جب وہ کہہ چکا تھا وہ اسی اطمینان سے اٹھی اور باورچی خانے میں جا کر آٹا گوندھنے لگی۔

وہ پریشان ضرور ہوا مگر پھر اسے خیال آیا کہ اتنی بڑی بات سن کر اسے ہضم کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے کچھ وقت تو لگتا ہے۔ اس لئے اسے مہلت دینی چاہئے یقیناً وہ اس پر غور کرے گی اور جلد ہی نہایت حوصلہ افزا رد عمل ظاہر کرے گی۔

مگر جب کئی روز گزر گئے تو اسے تشویش ہونے لگی کیا معلوم وہ اس کی بات سمجھی ہی نہ ہو؟

آخر ایک روز اس نے پوچھا ہی لیا ’’میں نے تم سے جو بات کی تھی اس کا تم نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا؟‘‘

’’کیا جواب دیتی‘‘ وہ بولی ’’آپ تو ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں سوچتے ہیں۔ کچھ گھر کی بھی فکر ہے:‘‘

’’کیوں کیا ہوا گھر کو؟‘‘

’’گھر میں آلو اور پیاز ختم ہو گئے ہیں۔ ڈپو سے آٹا منگانا ہے۔ ماموں جان کی نظر کا امتحان کرانا اور خالہ جان کو افسوس کا خط لکھنا ہے۔ کئی دن سے کہہ رہی ہوں کہ منی کے یونیفارم کا کپڑا لادیں میں خود سی دوں گی لیکن آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب سے میری سینڈل ٹوٹ چکی ہے۔‘‘

بیوی سے مایوس ہو کر اس نے اپنے قریبی دوست ن سے رجوع کیا۔ ن نے اس کی گفتگو نہایت توجہ اور دلچسپی سے سنی مگر کوئی جواب دینے کی بجائے اسے پکڑ کر نئی فلم دکھانے لے گیا۔ فلم کے دوران اس نے ن کو یاد دلایا کہ اس نے اس سے بہت ہی اہم بات کی تھی۔ اس پر ن نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ وہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا اور اس کا علاج کرائے گا۔

ایک ایک کر کے اس نے اس نے سبھی دوستوں سے بات کی مگر کسی نے بھی اس کی بات توجہ اور سنجیدگی سے نہیں سنی۔

دوستوں سے مایوس ہو کر وہ گھر میں پناہ گزین ہوا اور کئی روز تک کتابیں پڑھتا اور مختلف قسم کے چھوٹے موٹے تجربے کر کے وقت گزارتا رہا۔ ایک صبح اس کی بیوی چائے لے کر آئی تو وہ خلاف معمول مہربان اور خوش نظر آتی تھی۔ اس کے دل میں امید کا پھول کھلا۔

''معلوم ہوتا ہے میری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہے؟''

''کونسی بات؟''

''وہی جو میں نے بہت دن پہلے تم سے کی تھی''

''حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا'' وہ اطمینان سے بولی

''یہی تو میں کہتا ہوں '' اس نے خوش ہو کر کہا

''حقیقت وہ نہیں جو آپ سوچتے ہیں ''

اس پر اوس سی پڑ گئی۔ دل بجھ گیا۔ درشت لہجے میں بولا۔

''تمہارے پاس اپنی بات کا کیا ثبوت ہے؟''

''میرے پاس اپنی کسی بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ مجھے اپنی کوئی بات کسی لیبارٹری میں جا کر ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ بس جو کچھ جیسا ہے، ٹھیک ہے۔''

''مجھے تمہاری ذہانت پر ہمیشہ فخر رہا'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا '' اور میری یہ خواہش ہے کہ تم میری بات پر غور کرو---- اس سے میرا حوصلہ بڑھے گا کم از کم میری شریک حیات تو میری ہم خیال ہے۔''

''میں آپ کی بات پر کیسے یقین کر لوں '' وہ رکھائی سے بولی ''کیا میں آپ کو جانتی نہیں ہوں ؟''

''تم مجھے ضروری جانتی ہو'' اس نے کہا ''میری اچھائیوں اور برائیوں سے واقف ہو، مجھ میں بہت سی خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن میں جس سلسلے میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں وہ میرا ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔''

''آپ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے'' وہ تنک کر بولی اور اٹھ کر چلی گئی اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

دو ایک دن اور گزر گئے۔ وہ اس سے کھنچا کھنچا سا رہا مگر اس نے ذرا پرواہ نہ کی، معمول کے مطابق گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ آخر تیسرے چوتھے روز اس نے خود ہی بات شروع کی۔

''پھر تم نے کچھ مزید سوچا؟''

''نہیں مجھے فرصت نہیں ہے''

پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد خود ہی کہنے لگی ''میرا مشورہ ہے آپ ایسی باتیں سوچنا چھوڑ دیں یہ نہایت اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے اس کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے ہیں ''

''میں جانتا ہوں '' اس نے کہا ''مگر میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ ہاں تم میرا ساتھ دو تو میرا کام آسان ہو سکتا ہے۔ محلے کی عورتیں تمہیں اچھا سمجھتی ہیں ''

''جی نہیں مجھے تو معاف ہی رکھئے۔''

''اچھا مدد نہیں کرنا چاہتیں نہ کرو۔۔۔۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میری بات پر یقین کرتی ہو؟''

''نہیں ''

''مگر کیوں ''

''اس لئے کہ جس شخص کو اتنا یاد نہ رہتا ہو کہ اس نے رات کیا کھایا تھا اور جسے یہ یاد نہ ہو کہ اس کی بیوی نے جو ساڑھی پہنی ہوئی ہے وہ اسے کسی اور نے تحفے میں نہیں دی بلکہ اس کے اپنے شوہر نے خود خرید کر دی تھی تو ایسے شخص کو اتنی بڑی اور دور کی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے؟''

''بڑی بڑی باتیں سوچنے والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں۔''

''لیکن میں نے دیکھا ہے'' وہ بولی ''آپ کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سوچتے ہیں ''

''ہاں۔۔۔۔ وہ بھی سوچ لیتا ہوں۔۔۔ تم ہر بات میں میری ذات کو کیوں کیوں درمیان میں گھسیٹ لاتی ہو۔۔۔۔ آخر تم کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ میں گمنام اور عام سی موت نہیں مرنا چاہتا۔۔۔۔ میں نے جو کچھ دریافت کیا ہے وہ نہایت اہم ہے اور میں اسے دنیا تک پہنچانا چاہتا ہوں خواہ اس کے لئے مجھے بڑی سے بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔''

''مجھے افسوس ہے'' وہ دھیمے لہجے میں بولی ''میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔''

’’یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟‘‘

’’ہاں ‘‘

بیوی کی باتوں سے ایک بار پھر مایوس ہو کر--- وہ کئی روز تک اداس رہا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا ہے---- کہ اگر وہ اپنی شریک حیات اور قریبی دوستوں کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکا تو دوسرے لوگوں کو کیسے قائل کرے گا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے باپ سے بات کرے گا۔ اگرچہ اس کے باپ کے عقائد اور نظریات بہت پختہ تھے مگر وہ علمی باتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔ کم از کم وہ اسے بہتر مشورہ ضرور دیں گے۔

اس نے اپنے باپ کی نظر کا معائنہ کرایا اور انہیں نئے نمبر کی عینک خرید کر دی کئی روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور طرح طرح کے موضوعات پر بحثیں کرتا رہا پھر ایک روز ڈرتے ڈرتے اس نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔

وہ نہایت اطمینان سے سنتے رہے پھر بولے۔

’’برخوردار---- جب تم ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے تو میں نے اس وقت سے لے کر آج تک کئی بار تمہیں الٹی سیدھی کتابیں پڑھنے اور بے معنی باتوں پر سوچتے رہنے سے منع کیا مگر تم باز نہ آئے--- اب ماشاء اللہ تم ایک ذمہ دار شوہر اور باپ ہو اب تو تمہیں ایسی واہیات باتوں کے بارے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے‘‘

’’ابا جی‘‘ اس نے پریشان ہو کر کہا ’’یہ واہیات باتیں نہیں ہیں۔ یہ اتنا اہم اور بڑا مسئلہ ہے کہ اگر سب لوگ میری طرح سوچنے لگ جائیں تو ایک بہت بڑی تبدیلی آ سکتی ہے۔‘‘

’’میرا مشورہ ہے‘‘ اس کے باپ نے کہا ’’تم ایسی باتوں پر سوچنا چھوڑ دو آخر تمہیں اس سے کیا فائدہ حاصل ہو گا۔‘‘

’’فائدہ؟‘‘

’’ہاں---- الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور تمہارا سکون الگ چھن جائے گا۔‘‘

’’سکون تو اب بھی چھن گیا ہے ابا جی اور میں اتنی بڑی بات کیسے چھپا سکتا ہوں۔ کیسے خاموش رہ سکتا ہوں میں انسانی تاریخ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔‘‘

’’تم بالکل فکر نہ کرو---- انسانی تاریخ کو اپنے فطری ارتقاء کی منزلیں طے کرنی ہیں اور وہ کرتی رہے گی--- تم کاروباری معاملات پر توجہ دیا کرو‘‘

باپ کی گفتگو سے دل برداشتہ ہو کر اس نے ایک عالم دین کا سہارا لیا اور اسے اور زیادہ مایوسی ہوئی جب انہوں نے بتایا کہ اس مسئلے کے بارے میں کتابوں میں کہیں ذکر نہیں آیا--- اور یہ کہ ایسی باتوں پر سوچنا گنا ہے۔

اب اس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے خیالات کو مضمون کی شکل میں اخبار کو بھیج دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ایک روز ڈاک سے اسے اپنا مضمون واپس مل گیا۔ ایڈیٹر نے لکھا تھا۔

''قواعد ہمیں ایسے مضامین کی اشاعت کی اجازت نہیں دیتے، ویسے بھی آپ کی تحریر میں پختگی نہیں ہے آپ مشق جاری رکھیں گے تو بہتر زبان لکھنے لگیں گے۔''

اس نے چاہا کہ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کی خواہش کا گلا گھوٹ کر کوئی دوسرا کام جو اس کے گھریلو اور کاروباری معاملات کو بہتر بنانے میں مدد سے شروع کر دے اور اس نے ایسا ہی کیا مگر اس کے بعد اس کی اپنی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

اب وہ کئی برسوں سے مجذوبیت کی حالت میں شہر کی سڑکوں پر گھومتا پھرتا ہے کوئی کچھ دے دیتا ہے تو کھا لیتا ہے۔ جہاں جی چاہتا ہے پڑ کر سو رہتا ہے۔ ہاں اسے سکول کے بچوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ چھٹی کے وقت وہ کسی نہ کسی سکول کے گیٹ پر پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک بچے کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ بچے اس پر آوازے کستے اور اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھتے ہیں۔

''سی اے ٹی؟''

''کیٹ''

''آر اے ٹی؟''

''ریٹ''

''چھ دونی؟''

''بارہ''

بچے اپنے سوالوں کے درست جواب سن کر خوش ہوتے ہیں مگر وہ اداس ہو جاتا ہے شاید وہ کسی بڑے سوال کے پوچھے جانے کا منتظر ہے۔

***

بارھیں برسیں

بارہ برس بعد۔۔۔۔

ایک روز میں اس کے گھر کے دروازے پر دستک دیتا ہوں تو وہ اندر سے چہک کر کہتی ہے۔

''دروازہ کھلا ہے ڈرائنگ روم میں چلے جائیے۔''

میں دروازہ ٹٹولتا ہوں واقعی ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند نہیں ہے۔ میں دروازہ کھول کر اندر آ جاتا ہوں تپائی پر چائے کے برتن رکھے ہیں۔ چائے دانی سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی ہے۔ پلیٹوں میں مختلف قسم کے پھل اور کھانے کی چیزیں قرینے سجی ہوئی ہیں۔ میں گردن گھما کر دیکھتا ہوں۔ قدموں کی چاپ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ساتھ والے کمرے کے دروازے پر آ گئی ہے۔ درمیان میں ہلکے گلابی رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اس کی آواز سن سکتا ہوں وہ کہہ رہی ہے۔

''مجھے معلوم تھا تم آنے والے ہو۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ تم تیسرے خواب والے وعدے پر بارہ برس بعد ہی عمل کرو گے۔ تم نے مجھے بارہ برس تک راہ دکھائی ہے۔ اب بارہ برس تک تمہیں اکیلے بیٹھ کر چائے پینا ہو گی اور تیرھویں برس کا انتظار کرنا ہو گا۔''

میں چائے کی دو پیالیاں بنا کر رکھ دیتا ہوں اور کہتا ہوں۔

''جب تک تم میرے پاس نہیں بیٹھو گی میں چائے نہیں پیوؤں گا تم نے کم از کم ایک پیالی چائے میرے ساتھ بیٹھ کر پینے کا وعدہ کیا تھا۔''

وہ کہتی ہے ''جب تم اپنے وعدے پر پورے نہیں اترے تو میں بھی اس کی پابند نہیں ہوں تم نے بارہ برس تک مجھے انتظار کی آگ میں جلاتا ہے۔ اب تمہیں بارہ برس تک انتظار کرنا ہو گا۔''

اور تم؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''میں '' ''وہ کہتی ہے'' تم سے باتیں کروں گی۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ اور پھر اس طرح تمہارے انتظار کے بارہ برس آسانی سے کٹ جائیں گے۔

میری آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں لیکن گرنے سے پہلے جم جاتے ہیں۔ میں انہیں خالی پلیٹ میں چن دیتا ہوں وہ بولتی رہتی ہے۔

''جب تم گھر سے چلے تھے تمہارا یہاں آنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن میں جانتی تھی اب تمہیں آنا ہی پڑے گا۔ تم کہیں اور نہیں جا سکتے۔ تمہیں شائد معلوم نہ ہو۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔مجھے ہر بات کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ بات میں نے تمہیں پہلے خواب میں بھی بتائی تھی۔''

''پہلا خواب؟ نہیں۔۔۔ وہ تو شائد دوسرا خواب تھا'' میں جواب دیتا ہوں۔

''نہیں وہ پہلا خواب تھا'' وہ کہتی ہے۔ ''مجھے تو ذرا ذرا سی بات یاد ہے۔میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ مجھے کسی نے دیکھا تھا اسی لئے جب ہر صبح مجھے پانچ پھولوں سے تولا جاتا۔ تو میرا وزن کبھی کم یا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ سارا شہر میرے بدن کی روشنی سے منور تھا۔ لوگ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلاتے تھے جلا نہیں سکتے تھے۔ مگر میرا دل اداس رہتا تھا۔ مجھے پھولوں سے وحشت ہوتی تھی۔ اور میں پہروں چپ چاپ بیٹھی سوچوں میں کھوئی رہتی تھی اور پتہ ہے تم۔۔۔''

میں اس کی باتیں توجہ سے سنتا ہوں۔۔۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین برس گزر جاتے ہیں۔ میں اس کی باتوں سے اکتا جاتا ہوں۔ اسے پردے کے پیچھے کھڑے باتیں کرتے چھوڑ کر میں تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل جاتا ہوں اور وہ۔۔۔ جو سب کچھ جانتی ہے، نہیں جان سکتی کہ میں وہاں نہیں ہوں۔

میں گلی سے نکل کر سڑک پر آتا ہوں۔ سڑک پہلے سے زیادہ چوڑی کر دی گئی ہے۔ لیکن ٹریفک کے تناسب سے اب بھی نا کافی ہے۔ فٹ پاتھ پر کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ہر طرف شور و غل ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں چوک پر پہنچ کر تازہ اخبار خریدتا ہوں اس میں میرے لئے بہت سی خبریں دلچسپ نئی اور عجیب ہیں۔ نئے نئے ناموں کے وزیر، نئے منصوبے، ایک نیا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا ہے۔ ملک میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ میں اخبار پڑھتا اور لوگوں سے ٹکراتا جاتا ہوں۔ کہ اچانک میری نظر اپنی تصویر پر پڑتی ہے۔ میرے چچا نے ان تمام احباب اور رشتہ داروں کا بذریعہ اخبار شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے میری بے وقت موت پر انہیں تعزیتی پیغامات اور تار بھیجے ہیں۔ اور جنہیں فرداً فرداً جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اپنی بے وقت موت کی خبر پڑھ کر میرا جی بھر آتا ہے۔ اور میں دیر تک آنسو بہاتا رہتا ہوں پھر مجھے اپنے چچا کا غم سے نڈھال چہرہ یاد آتا ہے میں اخبار سے آنسو خشک کر کے جلدی جلدی گئی ہیں۔ میں انہیں تسلی دیتا ہوں۔ جائیداد فروخت کر کے فیکٹری یا کارخانہ لگانے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اپنی نگرانی میں اپنی قبر کو پختہ کراتا ہوں۔ اور اس پر کتبہ لگواتا ہوں۔

جب میں لوٹتا ہوں تو وہ دوسرے خواب کا حال بیان کر رہی ہوتی ہے۔ چائے ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ میں چپ چاپ آ کر صوفے میں بیٹھ جاتا ہوں کبھی کبھی دروازے کے ادھ کھلے پٹ سے ہوا کا نازک سا جھونکا اندر آتا ہے تو میری نظریں

اسے ہلکے گلابی رنگ کے پردے تک چھوڑنے جاتی ہیں۔ وہ مجھے نظر نہیں آتی لیکن اس کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے۔

''اگرچہ میں وہاں کبھی نہ جا سکی لیکن تمہارے جسم کی خوشبو مجھ تک ہر لمحہ پہنچتی تھی۔ میں ہر شام محل کی چھت پر کھڑے ہو کر ہوا میں تمہارے جسم کی خوشبو محسوس کرتی اور سمت کا تعین کرتی تھی۔ پھر جس روز تم کنویں کی قید سے رہا ہوئے اس روز صبح سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ اور خوشبو کی کثرت سے مجھے سانس لینا دو بھر ہو گیا تھا۔ اور مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ اب تم تیسرے خواب کر سفر پر روانہ ہو گے۔ مجھے اس کی باتیں سنتے سنتے تین برس اور بیت گئے ہیں۔ میں اس کی باتوں سے اکتا جاتا ہوں۔ اور چھٹے برس اس سے آنکھ بچا کر باہر نکل جاتا ہوں اور وہ جو سب کچھ جان لیتی ہے۔ نہیں جان سکتی کہ میں وہاں نہیں ہوں۔

گلی کے نکڑ پر مجھے ایک نہایت حسین عورت دکھائی دیتی ہے اسے دیکھ کر میں ٹھٹھک جاتا ہوں۔ پھر س کے اشاروں پر ناچنے لگتا ہوں۔ جب ناچتے ناچتے تھک جاتا ہوں وہ مجھے اپنے گھر لے جاتی ہے میں اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر میں داخل ہوتا ہوں دروازہ اپنے اپ کھٹاک سے بند ہو جاتا ہے۔ میں دوسرے ہی لمحے ایک ایسے گڑھے میں گر جاتا ہوں جس میں لوہے کی بڑی بڑی نوکیلی سلاخیں عموداً گڑی ہوئی ہیں۔ جس میں جسم سے خون کے فوارے نکلنے لگتے ہیں خوبصورت عورت چہرے سے خوبصورتی کا ماسک اتارتی ہے۔ اس کے لمبے لمبے دانت اور مکروہ صورت دیکھ کر میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ جب مجھے ہوش آتا ہے۔ تو میری ہڈیاں ننگی ہوتی ہیں انسانی گوشت کے جلنے کی بو چاروں طرف پھیلی ہوتی ہے۔قریب ہی میری کھال رکھی ہوتی جس میں جا بجا سوراخ ہیں میں اپنی کھال اٹھا کر اوڑھ لیتا ہوں۔ اور بھاگتا ہوا واپس آ جاتا ہوں۔

اسے بالکل پتہ نہیں چلتا۔ وہ اپنے تیسرے خواب کی تفصیل سنا رہی ہے۔ میں چائے کی پیالیاں ٹٹولتا ہوں۔ چائے ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی وہ کہتی ہے۔

''پاداش میں میرے بدن کا نور جاتا رہا۔ اور میں پھولوں کی بجائے پونڈوں سیروں میں تلنے لگی۔ پھر بھی میں خوش تھی۔ میرا اندر آباد تھا مجھے تنہائی اور ویرانی سے نجات ملی تھی۔ اور شائد میں ہمیشہ خوش ور مطمئن رہتی۔ اگر مجھے تمہارے بارے میں پتہ نہ ہوتا کہ تم کہاں ہو۔ اور کیا کرتے ہو۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ تم بارہ برس کی قید با مشقت کاٹ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں تمہیں بارہ برس کا بن بار ملا تھا۔ اور کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ تم کسی اندھے کنویں میں الٹے لٹک کر بارہ برس سے چلہ کشی کر رہے ہو۔ لیکن میں جانتی تھی مجھے سب کچھ معلوم تھا کہ تم کس طرح دن رات دولت جمع کرنے میں مصروف ہو کاش تم مجھ سے پوچھ لیتے کاش آخری خواب میں میں نے تمہیں بتا دیا ہوتا کہ وہ دولت تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔

میں اس کی باتیں سنتا ہوں یہاں تک کہ تین سال اور بیت جاتے ہیں نویں سال میں اکتا کر باہر نکل جاتا ہوں۔ اور وہ جو سب کچھ جان لیتی ہے۔ نہیں جان سکتی کہ میں وہاں نہیں ہوں۔

گلی سنسان پڑی ہے۔

کسی گھر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ نہ کسی کھڑکی سے کوئی عورت جھانکتی ہے ساری گلی ویران اور خاموش ہے۔ میں سڑک پر آتا ہوں۔ سڑک پر کہیں بھی کوئی نہیں ہے۔ آدمی نہ حیوان نہ پرند۔۔۔ ہر طرف مکمل خاموشی ہے۔ موت کا سا سناٹا ہے۔ ہو کا عالم ہے۔ دکانیں کھلی ہیں مگر دکاندار اور خریدار نہیں ہیں۔ ٹانگے اور ریڑھے سڑک کے ایک طرف یا درمیان میں کھڑے ہیں مگر ان میں کوئی سواری ہے نہ کوئی جانور جُتا ہوا ہے۔ مٹھائی کی دکان سجی ہوئی ہے مگر ایک مکھی نہیں ہے۔ کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا نہیں آتا۔ کوئی ذی روح بولتا سنائی نہیں دیتا۔ کاش کہیں کوئی کتا ہی بھونکتا سنائی دے۔ میں خوف سے کانپنے لگتا ہوں اور اس قدر گہرے سکوت سے مجھے ہول آنے لگتا ہے میں بھاگ کر ریڈیو کی ایک بڑی دکان میں گھس جاتا ہوں۔ اور باری باری ہر چھوٹے بڑے ریڈیو کی سوئی گھماتا ہوں۔ کسی بینڈ پر کوئی اسٹیشن سنائی نہیں دیتا۔ خوف کے مارے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ اسی لمحے میری نظر قریب پڑے ٹیپ ریکارڈر پر پڑتی ہے۔ میری ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ میں ٹیپ ریکارڈر سے انسانی آوازیں سن کر اپنا حوصلہ بڑھاتا ہوں۔

پھر اچانک اس احساس سے کہ ان سب چیزوں کا میں تنہا مالک ہوں اور دکانوں مکانوں گلیوں کو چوں بازاروں پر میں اکیلا قابض ہوں اور وہ سب کسی انجانے خوف کی وجہ سے شہروں کے شہر میرے لئے خالی کر کے بھاگ گئے ہیں میں خوشی اور مسرت کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہوں۔ لیکن یہ خدشہ کہ کہیں کوئی اور بھی میری طرح موجود نہ وہ۔ مجھے اچانک فکر مند کر دیتا ہے میں اسلحہ کی دکان سے بندوق اور گولیاں لے کر اس کی تلاش میں نکلتا ہوں جس کے موجود ہونے کا امکان ہے میں میں اسے پہلے آہستہ آہستہ بلاتا ہوں پھر بلند آواز مین پکارتا گالیاں دیتا اور للکارتا ہوں۔ بز دلی کے طعنے دیتا ہوں۔ لیکن وہ سامنے نہیں آتا میں اس کی تلاش میں شہر کا چپہ چپہ چھانتا ہوں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ جب مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ کہیں نہیں ہے۔ تو میں ہوائی فائرنگ کر کے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کرتا ہوں۔

اچانک مجھے اس کا خیال آتا ہے۔ میں بھاگتا ہوا واپس آتا ہوں۔ تاکہ اسے خوشخبری سنا سکوں۔ کہ اب دنیا میں صرف میں اور وہ باقی ہیں۔ اور پوری دنیا پر ہماری آنے والی نسلوں کی حکمرانی ہو گی۔

میں چپکے سے آ کر صوفے میں دھنس جاتا ہوں۔ وہ کہتی ہے۔

''مجھے سب پتہ ہے تم نے باہر جا کر جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سوچا ہے مجھے اس کا بھی علم ہے۔ اور جانتے ہو مجھے یہ بھی معلوم کہ میری باتوں کے دوران میں تم ہر تین سال بعد چپکے سے اٹھ کر باہر چلے جاتے رہے ہو۔ تم میری

باتیں سن سن کر اکتا جاتے ہو۔ اس لئے اب میں میں کچھ نہیں بولوں گی۔ ابھی تین برس باقی ہیں یہ بٹن برس تمہیں تنہائی اور خاموشی سے اکیلے بیٹھ کر گزارنا ہونگے۔

وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔ جو گرنے سے پہلے جم جاتے ہیں۔ میں انہیں اٹھا کر پلیٹ میں چن دیتا ہوں۔ ایک دو تین برس گزر جاتے ہیں۔

تیرھواں برس شروع ہوتا ہے۔ میں اسے پکارتا ہوں۔ چائے ابھی تک گرم ہے میں پردے کی طرف دیکھتا ہوں لیکن وہ سامنے نہیں آتی۔ جواب بھی نہیں دیتی۔ میں اٹھ کر پردہ ہٹاتا ہوں وہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

اسی لمحے انسانی آوازوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ شائد شہر سے بھاگے ہوئے لوگ اپنے گھروں میں و اپس آ رہے ہیں۔

* * *

بچھڑے ہوئے ہاتھ

وہ جب سے اپنے جسم سے بچھڑا ہے دولخت ہو گیا ہے اور اگرچہ وہ پوری طرح صحت مند ہو چکا ہے لیکن اسے لگتا ہے جیسے اس کا دھڑ پتھر ہو گیا ہو یا جسم سے الگ ہو کر اس کی روح ہوا میں تیرتی پھرتی ہو اور حالانکہ اس قبر پر جہاں اس کا گردن کے بغیر جسم دفن ہے اس کے نام کا کتبہ نہیں لگا ہوا ہے لیکن اسے لگتا ہے جیسے ب کی بجائے وہ خود مر چکا ہے یا زندہ در گور ہو گیا ہے اور حالانکہ ب کے جسم کی لگام تھامے جہاں چاہتا ہے اس کے پاؤں سے چلتا پہنچ جاتا ہے اور ب کے ہاتھ پاؤں اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں پھر بھی اسے اپنے ہاتھ پاؤں بہت یاد آتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ب کا جسم اس کے اپنے جسم سے زیادہ خوبصورت اور تر و تازہ ہے لیکن اسے اپنے جسم کی یاد بہت ستاتی ہے اور وہ کئی بار ب کی ٹانگوں سے چلتا اس قبر پر بھی گیا ہے جہاں اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم کے باقی اعضاء دفن ہیں کئی بار اس نے ب کے ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھوں کے لئے فاتحہ خوانی بھی کی ہے۔

ہاتھ پاؤں کے علاوہ اسے اپنے کندھے بھی یاد آتے ہیں جن پر اس کا بیٹا جاوید بالکل اسی طرح سوار ہو جاتا تھا جیسے وہ ب کے جسم پر سوار ہے اسے اپنے پاؤں کی چاپ بھی بہت یاد آتی ہے جسے سن کر ناہید کو اس کی دستک سے پہلے ہی اس کے آنے کا پتہ چل جاتا تھا اور ٹانگیں--- جن کو وہ برسوں جگہ جگہ لئے پھرا--- اور پیٹھ جسے وہ کئی برس تک آرام دہ بستر مہیا نہ کر سکا لیکن اسے سب سے زیادہ اپنے ہاتھ یاد آتے ہیں اور اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے ہاتھوں سے بچھڑ کر ہی خود سے جدا ہوا ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو ماں اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتی آنکھوں سے لگاتی اور بار بار چومتی تھی۔ پھر اس نے ان ہاتھوں سے تختی لکھنا سیکھا۔ ماسٹر نور محمد سزا کے لئے ہاتھ نکالنے کو کہتے تو وہ ہاتھوں کو پشت کی طرف چھپا لیتا۔ پھر اس نے ان ہاتھوں سے میٹرک کے امتحان کے پرچے حل کئے اور ضلع بھر میں اول رہا ان ہاتھوں سے اس نے کالج کے زمانے میں موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی کی۔ ناہید کے نام زندگی کے بہترین خطوط انہی ہاتھوں سے لکھے اور کئی بار اس کے ماتھے پر آئی ہوئی لٹ کو سلجھایا۔ جب اس کی ماں بیمار پڑ گئی تو وہ رات رات بھر اپنے ہاتھوں سے اس کا سر دباتا اور اسے اپنے سے دوا پلاتا۔

اپنے ہاتھوں پر اس کی بے شمار یادیں نقش تھیں۔ ہتھیلیوں پر اس کی قسمت کی لکیریں کھدی ہوئی تھیں اور چھنگلی میں اس نے منگنی کی انگوٹھی پہنی تھی۔ جس کے ننھے سے نگینے میں خوبصورت مناظر کی متحرک فلم چلتی رہتی تھی۔

جب اس نے آخری بار اپنے ہاتھوں سے معاہدے پر دستخط کئے تھے تو اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو بار بار چوما اور آنکھوں سے لگایا تھا کاش اس کے اپنے جسم کا کوئی ایسا حصہ باقی رہ جاتا جو آئینے کے بغیر دیکھا جا سکتا کاش کوئی ایک ہاتھ ہی اس کا اپنا ہوتا جو اسے زندہ ہونے کا احساس دلاتا رہتا۔

اسے اپنے بائیں ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلی جو کبھی اسے بہت بدنما معلوم ہوتی تھی اور وہ محفلوں میں اسے چھپانے کی کوشش کرتا رہتا تھا، بہت یاد آتی ہے۔ اگر وہ کٹی ہوئی انگلی اسے پھر مل جائے تو وہ ہر ایک کو فخر سے دکھائے اور کہے ''دیکھو یہ میری اپنی انگلی ہے''۔

مگر اب اسے لگتا ہے اس کا اپنا کچھ نہیں ہے جیسے وہ کرائے کی گاڑی چلا رہا ہے پتہ نہیں کب اسے اسٹیرنگ سے ہٹا دیا جائے اور وہ ہوا میں معلق رہ جائے۔ نجانے کب اس کے ہاتھ سے ب کے جسم کی مہار چھوٹ جائے اور وہ ہوا میں تیرنے لگے اور اس کی گردن کے نیچے خلاء کے سوا کچھ نہ ہو۔

راتوں کو اکثر وہ اپنے بے سر کے جسم کو ہاتھ پھیلائے سڑکوں اور بازاروں میں ٹھوکریں کھاتے دیکھتا ہے۔ تیز رفتار موٹریں اس کے جسم کو کچل کر آگے بڑھ جاتی ہیں تو وہ اٹھ کر گردن کی تلاش میں پھر سے بھاگنا شروع کر دیتا ہے وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور اسے آوازیں دیتا ہے لیکن وہ ہاتھ پھیلائے دور ہوتا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ نہیں آتا، ہاتھ بھی تو اس کے اپنے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی اسے اپنے ہاتھ ہوا میں اڑتے نظر آتے ہیں اور وہ ب کی ٹانگوں پر ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے کبھی کبھی اسے اچانک اپنے ہاتھ جسم کے الگ ہو کر سڑک کے کنارے پڑے ہوئے مل جاتے ہیں تو وہ انہیں ب کے ہاتھوں کی مدد سے اٹھا کر صاف کرتا اور آنکھوں سے لگاتا ہے۔

جب وہ ہوش میں آیا تھا اور مانگے ہوئے ہاتھ پاؤں میں پہلی بار حرکت ہوئی تھی تو صرف ایک بار ب کی بیوی نے اپنے شوہر کے ہاتھ کو بوسہ دیا تھا مگر وہ بوسہ ہاتھ پر چپک کر رہ گیا تھا اور اسے لگتا تھا جیسے وہ زخم کی طرح ہر وقت اس کے ہاتھ سے رستا رہتا ہو مگر وہ ہاتھ اس کا کہاں تھا۔۔۔۔ وہ تو ب کا ہاتھ تھا اور ب کی بیوی کا اس پر زیادہ حق تھا۔ ہاتھ ہی نہیں اس نے تو ب کا پورا جسم قرض لے رکھا ہے وہ کسی بھی وقت اپنا قرض واپس مانگ سکتی ہے مگر وہ معاہدہ!

معاہدہ اور نکاح کے فارم

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ الف اور ب کی بیویوں میں سے کون بیوہ ہو چکی ہے ب کی بیوی اس پر قانونی حق نہیں رکھتی لیکن دراصل اس کے جسم پر اسی کا حق ہے اور الف کی بیوی جو دراصل بیوہ ہو چکی ہے معاہدے کی رو سے اب تک ساکن ہے۔

یہ عجیب بات ہے لیکن وہ کیا کر سکتا ہے اس کا تو جی چاہتا ہے کہ وہ رات کو ب کے کندھوں سے الگ ہو کر اپنے گھر چلا جائے اور ب کے بے سر کے جسم کو اس کے گھر کی طرف بھیج دیا کرے۔

اسے اور بھی کئی طرح کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی----- مثلاً گواہی دیتے وقت ب کے ہاتھ پاؤں کا اس کے بارے میں کیا رویہ ہو گا اور خود اس کے اپنے ہاتھ پاؤں کس کی گواہی دیں گے۔

لیکن ان سب باتوں سے زیادہ اسے ایک اور پریشانی نے گھیر رکھا ہے وہ ناہید کے ماتھے پر آئی ہوئی لٹ سنوارنا چاہتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے یہ لٹ وہ نہیں ب سنوار رہا ہے۔ ناہید فرط محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتی ہے تو اسے لذت کی بجائے رقابت کا احساس ہوتا ہے۔

وہ محبت کے لمس کو ترس گیا ہے اور اسے شک ہے کہ ب کے دھڑ سے اس کی گردن جوڑتے وقت وہ کئی اہم اعصابی تار جوڑنا بھول گئے ہیں۔

***

بھُول

بڑے کمرے کے اس حصے کو، جس میں اوپر کی منزل کے غسل خان کی سیلن رستی رہتی تھی پارٹیشن وال کھڑی کر کے اور ایک پرانا دروازہ لگا کر سٹور روم بنا دیا گیا تھا۔ جس میں کھڑکی نہ روشندان۔ انہوں نے اندر آتے ہی سٹور روم کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ اسے لگا جالی میں پھنس گیا ہے۔ موت کی کال کوٹھڑی میں قید ہو گیا ہے۔

یقیناً انہیں شک ہو گیا تھا کسی نے اسے گھر میں گھستے دیکھ کر خبر کر دی تھی۔ مگر آدمی کو آخری وقت تک اپنی سی کوشش کرتے رہنا چاہئے اس خیال سے وہ لکڑی کی سخت سیٹ اور تین ٹانگوں والی کرسی دروازے کے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا اور جھری سے ان کی حرکت و سکنات کا مشاہدہ کرنے لگا۔

ماسٹر جی نے چھتری کھونٹی سے لٹکائی۔ جب سے کچھ کاغذات نکال کر الماری میں رکھے اور پنکھا لگا کر اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے وہ خاموش اور سنجیدہ ضرور تھے مگر کسی کرید یا شک کی کوئی پر چھائیں ان کے چہرے پر نظر نہ آتی تھی۔ اسے قدرے اطمینان ہوا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ان کے لئے چائے لیکر آ گئی۔

پہلی نظر میں وہ اسے اتنی حسین نظر نہ آئی تھی جتنی اس کی دھوم تھی یا جتنی اب نظر آ رہی تھی عجیب طلسماتی سا چہرہ تھا۔ جتنا دیکھو اتنا ہی نکھرتا جاتا اور کوئی اور چھوڑ نظر نہ آتا۔ ''کوئی سبزی ترکاری لا دیجئے'' اس کی آواز میں تھوڑی دیر پہلے کے وقوعے کی گھبراہٹ اب تک موجود تھی ''لانا وانا کچھ نہیں۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ جو گھر میں ہے پکا لو'' انہوں نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ وہ گرمی میں ابھی ابھی تو باہر سے آئے تھے۔ انکی خفگی سمجھ میں آتی تھی۔

اس نے مایوس اور پریشانی نظروں سے سٹور روم کی طرف دیکھا اور چپ چاپ چلی گئی۔

صاف ظاہر تھا اب بڑے میاں کا کہیں جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور وہ دن بھر گھر میں ہی براجمان رہیں گے۔ پھر شام کو ان کے دونوں بیٹے کام سے واپس آ جائیں گے اور باہر نکلنے کا راستہ بالکل مسدود ہو جائے گا۔ اسے برا سا خیال آیا۔ اگر ان سب نے مل کر اسے قتل کر دیا اور اسی تاریک کمرے میں گڑھا کھود کر دبا دیا تو کیا ابا کو اپنے کشف سے پتہ چل جائے گا؟ اور بالفرض پتہ چل بھی جائے تو کیا وہ دوبارہ زندہ ہو سکے گا؟ اس بد خیال سے اسے جھر جھری سی آ گئی۔

امید کی اب صرف ایک ہی کرن باقی تھی کہ ممکن ہے دوپہر کا کھانا کھا کر ماسٹر جی سو جائیں اور وہ کنڈی کھول کر اسے باہر نکال دے۔

شاید اس سے بہت بڑی حماقت ہو گئی۔ اس نے غلط گھر اور وقت کا انتخاب کیا۔

لوگ سنیں گے تو کہیں گے سات گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے اور وہ تو اس کے استاد تھے۔ مگر اب پچھتانے سے کیا حاصل۔ غنیمت ہے کہ وہ زیادہ سمجھدار نکلی اور کوئی بڑا حادثہ رونما نہ ہوا ورنہ ماسٹر جی ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ وہ چھوٹی موٹی غلطی بھی صاف نہیں کرتے تھے اتنی بڑی خطا پر کیسے درگزر کرتے اور خدا جانے انہیں خاموش کرنے کے لئے اسے کیا کچھ کرنا پڑ جاتا جس کا اسے ہمیشہ افسوس رہتا۔

بھوک، پیاس اور حبس سے اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ گرمی سے اس کے اندر کی سلوٹیں اور پسینے سے باہر کی کریز میں برابر ہوتے ہیں مگر اب چارہ ہی کیا تھا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی جب وہ ماسٹر جی کا کھانا لیکر آئی۔ گرمی میں چولھے کے پاس کھڑے رہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ماسٹر جی کھانا کھانے لگ گئے اور وہ پنکھے کے نیچے کھڑی ہو کر دوپٹے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگی۔

''بیٹھو بیٹی۔ تم بھی کھاؤ'' ماسٹر جی کا لہجہ اب خاصا نرم تھا

''گرمی میں کھانا پکاتے پکاتے میری بھوک مر گئی ابو''

''ہاں آج بہت گرمی ہے'' انہوں نے آہستہ آہستہ لقمہ چباتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے تو ایسے لوگوں کا خیال آ رہا ہے ابو۔ جو بے چارے دھوپ میں جسمانی مشقت کرتے ہیں یا جن کے گھروں میں پنکھے ہیں نہ برف اور فریج کا ٹھنڈا پانی''

ماسٹر جی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ کھانا کھاتے رہے۔ لیکن جب وہ کمرے کی چیزیں ٹھیک کر کے جانے لگی تو بولے۔

''بیٹی سٹور کی کنڈی لگا کر رکھا کرو۔ مجھے بتانا یاد نہ رہا۔ صبح جب میں چھتری تلاش کرتا ہوا اندر گیا تو مجھے لگا اندر سانپ ہے۔

''سانپ؟''

’’ہاں۔۔ بڑے صندوق کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ مگر اس کی دم صاف نظر آ رہی تھی۔‘‘

اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہاں سچ مچ سانپ تھا یا ماسٹر جی اسے سانپ کہہ رہے تھے اور اپنے بیٹوں کی واپسی تک بند رکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ اطمینان سے اس کا سر کچلا جا سکے۔

’’اب کیا ہو گا ابو؟‘‘ اس کا طلسماتی چہرہ ایک دم مرجھا گیا تھا۔

’’ڈرو مت۔۔۔ کچھ نہیں ہو گا۔ میں جلد ہی کسی سانپ پکڑنے والے کو بلا لوں گا‘‘

’’ابھی بلا لیجئے نا‘‘ اس نے التجائی لہجے میں کہا۔

’’ایسی بھی کیا جلدی ہے‘‘ وہ بولے ’’سانپ کو جب تک اپنی جان کا خطرہ نہ ہو وہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ بس تم کنڈی لگا کر رکھو‘‘

’’آپ بھی اب اس کمرے میں نہ سوئیں ‘‘ وہ بولی ’’خدانخواستہ‘‘

’’سانپ سوئے ہوئے آدمی کو نہیں ڈستا۔ اسے چارپائی پر چڑھنے کا حکم نہیں ہے‘‘

’’اللہ کرے یہ سچ ہو‘‘ اس کے لہجے میں تشوش اور بے یقینی تھی۔

وہ برتن اٹھا کر چلی گئی تو ماسٹر جی لیٹ گئے۔

اب تک اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اور سانپ ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ مگر اب یہ جان لینے کے بعد، اس کے لئے وہاں رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ بار بار نیم تاریک کمرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور جدھر دیکھتا۔ طرح طرح کے رینگتے، سرسراتے، بل کھاتے اور کنڈلی مار کر بیٹھے سانپ نظر آتے۔ کچھ دیر بعد، وہ اس وقت ہڑ بڑا گیا جب سوتے ہیں، ماسٹر جی کے منہ سے نکلنے والی عجیب سی آواز پر اسے سانپ کی پھنکار کا گمان ہوا۔

کمرے کی فضا سے مانوس ہو جانے کے بعد بدبو کا احساس اور پسینے سے بھیک جانے سے گرمی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ اس کی بھوک بھی مر گئی تھی مگر پیاس اسے مار ڈالنے کے درپے تھی۔ ماسٹر جی بڑی دیر تک خراٹے لیتے رہے لیکن وہ دوبارہ اندر نہیں آئی۔ شاید وہ کسی زیادہ مناسب وقت اور موقع کے انتظار میں تھی۔

پھر شام ہو گئی۔ ماسٹر جی جاگے، کچھ دیر کھانستے کھنکارتے اور جمائیاں لیتے رہے۔ پھر جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پینے لگے۔ پانی کی انڈیلے جانے کی آواز اسے بہت ہی بھلی گئی۔ مگر جلتا ہوا سینہ اور جلنے لگا اس نے بچے کھچے تھوک سے بمشکل گلا تر کیا اور ماسٹر جی کے کمرے سے باہر چلے جانے کی دعائیں مانگنے لگا اور اسے حیرت ہوئی کہ اس کی دعا فوراً ہی قبول ہو گئی مگر آدھی کیونکہ ان کے جانے کے بعد اس نے پنکھے کا سوئچ آن کیا تو پتہ چلا وہ خراب ہے۔

پھر رات ہو گئی۔ جس سے سٹور روم میں موت کی سی تاریکی چھا گئی۔ اس نے گھبرا کر بجلی کا بٹن دبایا جس سے کمرہ روشن ہو گیا۔ مگر ساتھ ہی ٹین کی ڈبوں اور ہیڑوں کی اکھڑی ہوئی جالیوں میں کھٹکا ہوا۔ شاید سانپ روشنی سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روشنی خطرناک ہو سکتی تھی اس نے جلد ہی بچھا دی مگر اس اثنا میں اس نے چارپائی کا جائزہ لے لیا تھا۔ جی کڑا کر کے اٹھا اور چارپائی بچھا کر جوتوں سمیت اس پر لیٹ گیا۔ کیا پتہ سانپ کے چارپائی پر نہ چڑھنے کی بات سچ ہی ہو۔ سخت سیٹ والی کرسی پر بیٹھے رہنے سے اس کی پیٹھ دکھنے لگی تھی اور کرسی کی چوتھی ٹانگ کا کام دینے والی ٹانگ سن ہو گئی تھی۔ لیٹنے سے اس کے اعضا اور پٹھوں کا کھنچاؤ کم ہو گیا اور راحت محسوس ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے کسی چیز نے اس کی پنڈی پر کاٹ لیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور ٹانگ سمیٹ کر کاٹے جان کی جگہ کو کھجانے سہلانے لگا۔ پتہ نہیں بھڑ تھی یا سانپ۔ اگر بھڑ تھی تو بھی بہت زہریلی کہ مسلسل کھجانے کے باوجود جلن اور کھجلی کم نہیں ہو رہی تھی اور سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر چارپائی سے اترا اور دروازے کے پاس بجلی کا بٹن تلاش کرنے لگا۔ مگر اسے دروازہ مل رہا تھا نہ بجلی کا بٹن۔ اس کے حساب سے جہاں دروازہ ہونا چاہئے تھا وہاں دیوار تھی۔ اسی تگ و دو میں وہ کئی بار بڑے صندوق اور دیواروں سے ٹکرایا۔ پھر اس کی دوسری ٹانگ ہیٹر کی ٹوٹی ہوئی جالی میں پھنس گئی۔ اس نے زور لگایا تو کوئی نوکیلی چیز اس کی پنڈلی میں چبھ گئی۔ درد سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا تو اس کی انگلیاں گیلی ہو گئیں۔ یقیناً خون بہہ رہا تھا۔ کہیں یہ سانپ نے تو نہیں ڈس لیا؟ مارے خوف کے اس کا خون خشک ہو گیا۔ وہ بتی جلا کر دیکھنا چاہتا تھا مگر گھپ اندھیرے میں اسے مشرق مغرب کا کچھ پتہ نہ چل رہا تھا۔ ساری سمتیں ایک ہو گئی تھیں اچانک وہ چونکا۔ بڑے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ کسی نے بڑے کمرے کی بتی جلائی۔ وہ سانس روکے انتظار کرنے لگا۔ شاید وہ اس کے لئے اچھی خبر یا کھانے پینے کو کچھ لائی ہو۔ مگر اسے مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد بتی بجھ گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔

اب پھر وہی گھپ اندھیرا تھا۔ بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ پھر اسے اس پر جس نے چھری اپنے پیٹ میں گھونپ لینے کی دھمکی دے کر اسے قید میں ڈال دیا تھا اور جسے وہ بہت مہربان سمجھا تھا، غصہ آنے لگا۔ کیا اسے اس کی بھوک، پیاس اور تکلیف کا اندازہ نہ ہو گا؟ کیا اسے اپنی عزت، اس کی جان سے زیادہ پیار تھی؟ اس کا جی چاہا زور زور سے چیخنے چلانے لگے۔ مگر پھر اس نے اپنے باؤلے پن پر خود ہی قابو پا لیا اور آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس میں بالکل سکت نہ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس پر نقاہت اور غشی طاری ہونے لگی۔ شاید سانپ کا زہر پورے جسم میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے گھر والے یاد آئے۔ وہ اس کی گم شدگی پر کس قدر پریشان ہوں گے۔ اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈیں گے۔ اور شاید ہمیشہ ڈھونڈھتے رہیں گے۔

اور عنبرین۔ کاش میں مرنے سے پہلے تمہیں بتا سکتا۔ تم مجھے کتنی اچھی لگیں۔ اتنی اچھی کہ میں صرف تمہاری عزت کی خاطر خاموشی سے جان دے رہا ہوں۔ پھر اس

پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور وہ مر گیا۔ مگر اگلی صبح دوبارہ زندہ ہو گیا اس کی آنکھ کھلی تو یہ سوچ کر خوش ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ بڑے کمرے سے مردانہ آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید وہ تینوں باپ بیٹے ناشتہ کر رہے تھے۔ کمرے میں اب نیم تاریکی تھی۔ وہ سخت سیٹ اور تین ٹانگوں والی کرسی پر جا بیٹھا اور جھری سے انہیں دیکھنے لگا۔ مگر وہ اسے دکھائی دے رہی تھی نہ اس کی آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ناشتہ بھی چھوٹے نے ہی بنایا تھا وہ پریشان ہو گیا۔ وہ کہاں گئی؟

اسے کہیں بھیج کر ان کا ارادہ کوئی واردات کرنے کا تو نہیں تھا؟ خوف سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ پھر جسے ساری سازش کا اسے خود بخود پتہ چل گیا۔ عام حالات میں ان کا اس پر قابو پانا شاید آسان نہ ہوتا۔ اس لئے اسے بھوکا پیاسا رکھ کر اس قدر نڈھال کر دیا گیا۔ کہ وہ مزاحمت کے قابل نہ رہے اور انہیں اسے ٹھکانے لگانے میں زیادہ تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔ اوہ میرے خدایا۔ کہاں آ پھنسا۔ کیسی بھول ہو گئی!

''ابو میں باجی کو لے آؤ؟'' چھوٹے نے جلدی جلدی چائے پیتے ہوئے کہا۔

''نہیں تمہیں دیر ہو جائے گی'' ماسٹر جی نے جواب دیا ''میں خود جا کر لے آؤ گا''

''جیسے آپ کی مرضی''

''ٹیکسی تانگہ لے لیجئے گا'' بڑے نے کہا ''ویگنوں بسوں میں اس وقت بڑا رش ہوتا ہے''

''ٹھیک ہے'' ماسٹر جی نے کہا۔ وہ ابھی تک ناشتہ کر رہے تھے۔

اس کی جان میں جان آئی۔ سارا غم و غصہ کا فور ہو گیا۔ مگر اب خدا جانے ماسٹر جی کب ناشتہ ختم کر کے اٹھیں، کب اسے لیکر آئیں اور کب اس کے یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو۔ ''اچھا ابو ہم چلتے ہیں '' بڑا اٹھ کھڑا ہوا ''اچھی طرح تالے لگا کر جائیے گا۔ آپ کو بھولنے کی عادت ہے''

''تم فکر نہ کرو'' ماسٹر جی نے کہا ''اطمینان سے جاؤ۔ خدا حافظ''

بیٹوں کے چلے جانے کے بعد ماسٹر جی بڑی دیر تک چائے پیتے اور اخبار پڑھتے رہے۔ بھوک اور پیاس سے وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ اگر وہ رات کو گھر میں ہوتی اور اسے کسی عزیز رشتہ دار کے ہاں جانا نہ پڑ جاتا یا وہ زبردستی روک نہ لیتے تو یقیناً اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ اس نے سوچا۔ کیا پتہ وہ اب تک اسے وہاں سے نکالنے میں بھی کامیاب ہو چکی ہوتی۔

خدا خدا کر کے ماسٹر جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ پانی کے جگ اور ناشتے سے بچ جانے والی چیزوں کو ڈھانپا الماری سے کچھ لیا۔ کمرے کا پنکھا بند کیا۔ سٹور کے دروازے کی کنڈی کو ٹھونک بجا کر اطمینان کیا اور بڑے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر چلے گئے۔ اس کے اندر کا اضطراب رسے تڑانے لگا۔ مگر اس نے توقف کیا۔ پچھلے

چوبیس گھنٹوں میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ پھر جب اس کے انداز سے ماسٹر جی چوک میں پہنچ گئے تو اس نے ضبط کی لگا میں چھوڑ دیں۔ رہی سہی توانائی جمع کر کے اس نے دونوں ہاتھوں سے شور کے بوسیدہ کواڑ کو زور کا جھٹکا دیا وہ کھٹاک سے کھل گیا۔ اس نے تپائی سے پانی کا جگ اٹھایا اور اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا پھر ایک توس منہ میں ڈال کر چباتا ہوا برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آیا۔ اس کے بولٹ کھولے، اس میں جالی تھی نہ گر لی۔ وہ بڑی آسانی سے برآمدے میں کو دیکھا۔ مگر ابھی گھر سے باہر نکلنے کا بڑا مرحلہ باقی تھا وہ باہر کے دروازے کے بولٹ کھولنے کے لئے مناسب اوزار تلاش کر رہا تھا جب اس کی نظر نیم وا صدر دروازے پر پڑی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ تو کیا ماسٹر جی، دروازہ بند کرنا سچ مچ بھول گئے تھے؟!

***

بوکا

تپش اگلتی زمین۔ مضبوطی سے گڑے ہوئے حبس کے خیمے۔ شکر دوپہر رات، ہر طرف گہرا ہولناک سناٹا۔ رات کا کوئی پابہ زنجیر لمحہ۔

گھمس گھمس گھمس ۔۔ پیاس پیاس پیاس!

عجیب خوفناک رات ہے جس کی بھی آنکھ تھوڑی دیر کے لئے لگتی ہے وہ ایک ہی جیسا ڈراؤنا خواب دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

کیا دیکھتا ہوں اک تاریک اور گہرا کنواں ہے۔ جس کے اردگرد بہت سے لوگ جن کی صورتیں دھند اور تاریکی میں پہچانی نہیں جا رہیں، کھڑے ہیں۔ وہ باری باری کنوئیں کے اندر جھانکتے اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اپنی باری آنے پر۔۔ میں اندر جھانکتا ہوں ۔۔ اندر۔۔ اندر باہر سے زیادہ تاریکی اور خاموشی ہے۔ مجھے پانی دکھائی نہیں دیتا مگر اس کے خیال سے میری پیاس اور بھڑک جاتی ہے میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور اپنے پیاسے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا ہوں۔ ان میں سے ایک بار بار کھنکارتا، تھوک سے گلا تر کرتا اور کہتا ہے۔

’’کچھ کرو۔۔ ورنہ سب پیاس سے مر جائیں گے۔‘‘

’’کیا کریں ؟‘‘

ایک بار اور کنڈا (پھندا)ڈال کر دیکھو۔۔ شاید مل ہی جائے۔‘‘

’’نہیں ملے گا۔۔ ہم کنڈے ڈال ڈال کر تھک گئے ہیں۔‘‘

’’کسی غوطہ خور کو بلواؤ۔‘‘

’’بلوایا تھا۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’اس نے کہا تہہ میں کیچڑ اور دلدل ہے اسے ڈر لگتا ہے۔‘‘

’’پھر کیا کریں ؟‘‘

''کوئی ہمت کرے اور جا کر نکال لائے۔''

''نہیں ۔۔ پہلے یہ پتہ چلاؤ یہ بار بار پھینک کون دیتا ہے؟''

''یہ بعد میں پتہ چلائیں گے۔''

''ہاں ہاں پہلے نکالنے تو دو۔''

''کچھ فائدہ نہیں ۔۔ پہلے یہ پتہ چلانا چاہیے کہ بار بار پھینک کون دیتا ہے؟''

''چپ کر اوئے۔۔ پہلے نکالنے تو دے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔''

''کوئی ہے جو اترے؟''

''کوئی ہے؟''

''کوئی ہے؟''

''کوئی نہیں ۔۔ ہم سب پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔''

''میں ہوں۔'' ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

''تم؟''

''ہاں میں ۔۔ میں جاؤں گا اور نکال کر لاؤں گا۔''

میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن آواز میرے حلق میں پھنس جاتی ہے۔ وہ کنوئیں کی منڈیر سے رسی باندھتا اور مضبوطی سے گرہ لگاتا ہے۔سب حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھتے ہیں۔وہ رسی ہاتھ میں لے کر کنوئیں میں اترتا ہے، میں تھوک نگل کر گلا تر کرتا ہوں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہوں۔

''یہ کیا کر رہے ہو ابا؟''

وہ کہتا ہے ''مجھ سے لوگوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی۔ میں نکال کر لاؤں گا۔''

''بوکا نہیں ملے گا ابا۔۔ تم خود کھو جاؤ گے۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' وہ کہتا ہے۔ ''میں ڈوب نہیں جاؤں گا بوکا ڈھونڈھ کر جلد واپس آ جاؤں گا۔''

میں اسے آوازیں دیتا رہتا ہوں مگر وہ نہیں رکتا۔ رسی تھامے آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کی آواز اور آہٹ دور ہوتی جاتی

ہے پھر اس کے پانی میں غوطہ لگانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سب منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر اندر جھانکتے ہیں مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، میں گھبرا کر پکارتا ہوں۔

’’ابا۔‘‘

میری آواز دیر تک کنوئیں کی دیواروں پر موٹر سائیکل چلاتی رہتی ہے پھر ڈوب جاتی ہے۔

’’ڈوب گیا ہے۔‘‘

’’کیچڑ میں پھنس گیا ہے۔‘‘

’’مجھے پہلے ہی ڈر تھا۔‘‘

میں اسے آوازیں دیتا ہوں۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ میں کنوئیں میں لٹکتی بے حرکت رسی کو دیکھتا ہوں اور میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔میری چیخ کی آواز سن کر وہ ساتھ والی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب آتا اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے

’’کیا ہوا بیٹے۔۔ خیریت تو ہے؟‘‘

میں پسینے میں شرابور، ابھی تک لرز رہا ہوں۔ کانپتے ہاتھوں سے اسے ٹٹولتا اور پوچھتا ہوں

’’ابا۔۔ یہ تم ہی ہو نا۔۔ بوکا نکال لائے ہو؟‘‘

’’معلوم ہوتا ہے۔تم نے بھی برا خواب دیکھا ہے۔‘‘

’’تو کیا تم نے بھی دیکھا ہے ابا؟‘‘

’’ہاں بیٹے بہت برا۔‘‘

’’کیا دیکھا ہے ابا؟‘‘

’’میں نے دیکھا۔‘‘ وہ کہتا ہے۔ ’’ایک دنبہ ہے سفید سفید اون اور بھاری خوبصورت چکی والا۔ میرے آگے آگے دوڑ رہا ہے، میں چھری لئے اس کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ مگر اسے پکڑ نہیں پا رہا ہوں۔ جب میں ہانپ جاتا ہوں تو کہتا ہوں۔‘‘

’’بزدل اللہ کی راہ میں جانے سے ڈرتے ہو؟‘‘

میری بات سن کر وہ رک جاتا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ گردن جھکا کر کہتا ہے۔ ’’اچھا۔۔ جیسے اس کی رضا۔‘‘

میں اسے زمین پر لٹاتا، گردن پر چھری رکھتا اور چلانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے۔ ''آنکھوں پر پٹی باندھ لو۔''

میں آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتا اور اللہ اکبر پڑھ کر چھری چلا دیتا ہوں اور یہ دیکھ کر میری چیخ نکل جاتی ہے کہ اس کی جگہ تم ذبح ہوئے پڑے ہو۔۔ استغفار بیٹے۔۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔

کچھ دیر کے لئے ہم دونوں خاموش ہو جاتے ہیں وہ زیر لب کچھ پڑھ پڑھ کر میری طرف منہ کر کے پھونکنے لگتا ہے اور ابھی اس نے تیسری پھونک مارنا ہوتی ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا ابو ابو پکارتا اٹھ کر بیٹھ جاتا اور رونے لگتا ہے۔ پھر اس کی ماں جاگتی ہے اور اسے سینے سے چمٹا کر وہ بھی رونے لگتی ہے۔ ابا اپنی پھونکوں کا رخ ان کی طرف کر لیتا ہے۔

وہ پوچھتی ہے۔ ''کیا وقت ہو گا؟''

''پتہ نہیں۔'' میں جواب دیتا ہوں۔ ''کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ آسمان دھند میں چھپا ہوا ہے کوئی ستارہ تک نظر نہیں آتا جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے۔ عجیب رات ہے۔ لگتا ہے وقت رک گیا ہے اور اب کبھی صبح نہیں ہو گی۔''

''کیا صبح نہیں ہو گی؟'' وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

''ہو گی۔۔ ضرور ہو گی تم سو جاؤ۔'' ابا جواب دیتا ہے پھر کہتا ہے۔ ''ضرور کہیں کچھ ہوا ہے۔''

''کیا ہوا ہے۔'' وہ اور پریشان ہو کر پوچھتی ہے۔

''کوئی انہونی بات۔ پتہ نہیں کس پر کیا گزری ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہوا تھا۔''

''کب۔۔ کیا ہوا تھا ابا؟''

''یہ پرانی بات ہے بیٹے۔۔ کتابوں میں لکھی ہے۔ دن چڑھے گا تو خود پڑھ لینا۔''

''دن چڑھے گا ابا؟''

''ہاں بیٹے۔۔ ہر رات خواہ وہ کتنی ہی قیامت کی کیوں نہ ہو، آخرکار ختم ہو جاتی ہے اور سورج نکلتا ہے،صبح طلوع ہوتی ہے۔''

''اب کیا وقت ہو گا؟'' وہ پھر پوچھتی ہے

''صبح کاذب معلوم ہوتی ہے۔''

'' اور صبح صادق؟''

''صبح کاذب کے بعد صبح صادق ہوتی ہے پھر شفق پھوٹتی ہے اور سورج طلوع ہوتا ہے۔''

''مگر مرغ نے اذان نہیں دی؟''

''ہاں ۔۔ مرغ نے اذان نہیں دی؟۔۔ تم جاؤ۔۔ جا کر دیکھو۔''

میں اٹھ کر ڈربے کے قریب آتا ہوں دروازہ کھولتا ہوں۔مرغ زندہ اور سلامت ہے اور جاگ رہا ہے مگر بری طرح خوفزدہ ہے اور ہانپ رہا ہے شاید اس نے بھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔میں اسے پکڑ کر باہر نکالنا چاہتا ہوں مگر وہ سہمی ہوئی مرغیوں کے پروں میں سر چھپا کر دبک جانا چاہتا ہے۔میں اسے زبردستی پکڑ کر باہر نکالتا ہوں۔ اس کی گردن کو اوپر کرتا اور اسے بھینچ کر اس کے اندر سے آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہوں مگر آواز نہیں نکلتی۔

''چھوڑ دے۔'' ابا کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ''ایسے آواز نہیں نکالی جا سکتی۔۔ اور نکل بھی آئے تو ایسی اذان کا کیا فائدہ؟''

میں مرغ کو واپس ڈربے میں دھکیل دیتا ہوں اور آ کر اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ ابا کہتا ہے۔

پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرغ اذان نہ بھی دے تو بھی وقت رکتا نہیں ہے۔''

''مجھے تو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔''

''نہیں بیٹے۔ جب ہمیں وقت ٹھہرا ہوا لگتا ہے اس وقت دراصل ہم خود ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اندر اندھیرا ہو جائے تو دن رات ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔نیکی اور بدی کی پہچان نہیں رہتی۔عدل اور بے عدلی میں تمیز نہیں رہتی۔ مگر وقت چلتا رہتا ہے اور ہر رات کے بعد صبح کا اجالا ضرور پھیلتا اور چیزوں کی اصلی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔''

''اگر صبح نہ ہوئی تو؟'' وہ کہتی ہے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' ابا کہتا ہے۔ ''پہلے کبھی ایسا ہوا ہے؟۔''

''پہلے کبھی ایسی ہولناک رات اور اس طرح کے بھیانک خواب بھی تو دکھائی نہیں دئیے۔''

''اللہ خیر کرے گا۔۔ تم لوگ سو جاؤ۔''

''سو جائیں ؟۔۔ کیوں ؟۔۔ کس طرح؟؟''

''مجھے نیند نہیں آتی۔'' وہ کہتی ہے۔ '' اور کاکا بھی بار بار ڈر کر چونکتا ہے''

''مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔'' میں کہتا ہوں '' اور ڈر بھی لگتا ہے کہیں پھر سے ویسا ہی خواب۔۔''

''نہیں بیٹے۔'' ابا کہتا ہے۔ ''تم سو جاؤ۔۔ میں جاگتا ہوں۔میں جاگتا اور پڑھتا رہوں گا تو تمہیں برے خواب دکھائی نہیں دیں گے۔''

اسی لمحے اچانک آہٹ سنائی دیتی ہے ہم چونک کر ڈربے کی طرف دیکھتے ہیں۔ لگتا ہے مرغ ڈربے سے باہر نکل آیا اور اپنے پر پھڑپھڑا کر اذان دینے کے لئے زور لگا رہا ہے مگر آواز اس کے حلق میں پھنس گئی ہے۔ زور لگاتے لگاتے وہ ہانپ جاتا اور اذان کو ادھورا چھوڑ کر ڈربے میں گھس جاتا ہے۔

جاگتے جاگتے اور حبس اور دھند کے سائبان میں ستارے تلاش کرتے کرتے ہماری آنکھیں تھک جاتی اور اعصاب شل ہو جاتے ہیں مگر روشنی اور صبح کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ لگتا ہے رات کا کوئی لمحہ ساکت ہو گیا ہے یا مرغ کے گلے میں اذان کی صورت میں اٹک گیا ہے۔ مگر پھر گرمی اور حبس کے باوجود نجانے کب اور کیسے میری آنکھ لگ جاتی ہے اور میں نیند کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں۔ مگر ابھی میں نیند کے پہلے زینے پر قدم رکھتا ہوں کہ وہی ڈراؤنا خواب پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے جہاں میری آنکھ کھل گئی تھی۔

کیا دیکھتا ہوں کہ کنوئیں میں لٹکی ہوئی رسی اچانک ہلنے لگی ہے۔میں اندر جھانکتا ہوں۔کان لگا کر سنتا ہوں اور کہتا ہوں۔

''وہ ابھی ڈوبا نہیں ۔۔ بوکا ڈھونڈھ رہا ہے۔''

وہ جاتے جاتے پلٹ آتے ہیں اور منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر اندر جھانکتے ہیں۔ پانی میں اس کے چلنے اور حرکت کرنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے پھر اندر سے اس کی آواز گونجتی ہے۔ ''بوکا مل گیا ہے۔''

سب خوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اس کی آواز پھر آتی ہے۔

''میں بوکا لے کر اوپر آ رہا ہوں۔''

''مجھے پہلے ہی یقین تھا۔'' ایک کہتا ہے۔ ''وہ خالی ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''کمال کا آدمی ہے۔''

''میں کہتا ہوں ۔۔ پہلے یہ پتہ چلانا چاہیے کہ بار بار پھینک کون دیتا ہے؟''

''چپ کر اوئے۔۔ شکر کرو مل گیا ہے۔''

''کچھ فائدہ نہیں ۔۔ جب تک اس کو نہ پکڑا جائے جو بار بار پھینک دیتا ہے۔''

’’میں بتاؤں وہ کون ہے؟‘‘ پیچھے سے ایک شخص سب کو دھکیلتا ہوا آگے آ کر کہتا ہے۔

’’بتاؤ؟‘‘

وہ نیفے میں سے چھری نکالتا،ہوا میں لہراتا اور تنی ہوئی رسی کاٹ دیتا ہے پھر ہنستا ہوا ایک طرف چلا جاتا ہے۔ دہشت اور خوف کے مارے سب خاموش رہتے ہیں۔ کنوئیں کے اندر سے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔میری چیخ کی آواز سن کر وہ۔۔ ساتھ والی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب آتا اور جھک کر کہتا ہے۔’’اٹھو بیٹے۔۔ جلدی کرو۔۔ دن نکل آیا ہے۔‘‘

’’دن نکل آیا ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’مگر ابھی ابھی تو صبح کاذب تھی۔‘‘

’’ہاں بیٹے۔۔ آج صبح کاذب ہی کے وقت سورج نکل آیا ہے۔پتہ نہیں اب کیسی سخت دوپہر ہمارا راستہ روکے کھڑی ہے۔‘‘

***

چاہ در چاہ

وہ دونوں سیاحت کی خاطر اسلام آباد سے بیجنگ جا رہے تھے۔

رات کا وقت تھا۔اس کا ساتھی علی اور تقریباً سبھی مسافر سو رہے تھے صرف وہ اکیلا جاگ رہا تھا۔

وہ پوری دنیا گھوم چکا تھا مگر اسے ہوائی سفر میں، خواہ و ہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہوتا نیند نہیں آتی تھی۔اس کی وجہ محض ہوائی جہاز کے سفر کا خوف نہیں تھا بلکہ وہ اسے زمینی سواریوں،بسوں ویگنوں اورفلائنگ کوچز کے مقابلے میں،جو ڈرائیوروں کی حماقت،ضد یا لالچ کی وجہ سے آئے روز حادثات کا شکار ہوتی رہتی ہیں،محفوظ ترین ذریعۂ سفر سمجھتا تھا مگر اس کے باوجود اسے نیند نہیں آتی تھی اور زمین پر دوڑنے والی خطرناک سواریوں میں سفر کرتے ہوئے اسے گچھوں کے گچھے اور ٹوکرے بھر بھر کے نیند آتی۔جیسے ننھے بچوں کو پنگوڑے میں۔ ادھر بس، ویگن یا ریل گاڑی روانہ ہوتی ادھر اسے نیند آ دبوچتی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ موسمِ گرما کی تعطیلات کے دوران میں اتوار کو اکثر سینما دیکھنے گاؤں سے شہر چلا جاتا اور آتے جاتے،کتاب یا رسالہ پڑھتے پڑھتے لاری میں سو جاتا اور بعض اوقات اس کے گاؤں کا سٹاپ پیچھے رہ جاتا اور اسے کسی دوسری بس یا ٹانگے سے واپس آنا پڑتا۔

اب یہ تو کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے کہ بچوں کو پنگوڑے اور جھولے میں ڈال کر جھونک دیتے ہیں تو وہ کیوں جلدی سو جاتے ہیں اور بڑوں کو بھاگتی اور شور مچاتی سواریوں میں اتنی نیند کیوں آتی ہے۔ ریل گاڑی میں تو اسے بہت ہی نیند آتی۔جونہی وہ شاہدرہ یا چکلالہ سے نکلتی اس کی آنکھیں بندیہ فراٹے بھرنے لگتی اور وہ خراٹے۔گھر میں ذرا سی آہٹ یا کھٹکے سے آنکھ کھل جاتی مگر ریل گاڑی کی مسلسل کھٹ کھٹ اور ہچکولے اسے تھپکیاں دے دے کر سلاتے۔انجن کی کرخت سی کوک اور گارڈ کی تیز وسل اسے میٹھی لوری معلوم ہوتیں۔چندا کے ہنڈولے میں،اڑن کھٹولے میں۔ مگر یہ عجیب سا خمار ہوتا کہ وہ سوتا بھی رہتا اور اسے راستے کے سٹیشنوں اور سٹاپوں کا بھی پتہ چلتا رہتا اور ہاکروں،خوانچے والوں اور بھکاریوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہتیں جن کے الفاظ کثرتِ استعمال سے پوری طرح سمجھ میں نہ آتے۔ اور یہ اندازہ بھی ہوتا رہتا کہ کب انجن نے گاڑی کو جھنجوڑا اور کوک مار ی۔بلکہ نیند اور ریل گاڑی میں ایک ایسا تعلق سا پیدا ہو گیا تھا کہ جب کبھی گھر میں بھی نیند کا وقت گزر جاتا یا ستانے والے کسی خیال کی وجہ سے نیند اچٹ جاتی تو وہ

آنکھیں بند کر کے فرض کر لیتا کہ آرام دہ بستر پر نہیں ریل گاڑی کے سخت پھٹے پر لیٹا ہوا ہے اور اس کی یہ ترکیب اکثر کارگر ثابت ہوتی اور وہ خراٹے لینے لگتا۔

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی اور ہر پل سکڑتی جا رہی تھی کیونکہ وہ اجالے کی سمت سفر کر رہے تھے۔بڑے جہاز کی ٹی وی سکرین پر ایک چھوٹا جہاز ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر پرواز کرتا لمحہ بہ لمحہ سحر کے قریب تر ہو تا جا رہا تھا مگر ابھی گھپ اندھیرا تھا۔برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑی سلسلوں کے درمیان کہیں کہیں کوئی اکا دکا چراغ ٹمٹماتا نظر آتا تو وہ انسانی جدوجہد اور جستجو کے بارے میں سوچنے لگتا کہ دشوار گزار پہاڑوں،بے پایاں سمندروں اور لق و دق صحراؤں میں انسانی قدم کہاں کہاں نہیں پہنچے۔ پھر اسے اولین دور کے انسانوں کا خیال آنے لگا وہ اس تاریک، ویران اور خطرات سے پر زمین پر کیسے زندگی بسر کرتے ہوں گے اور اس کے جد امجد کی کیا شکل و صورت اور حلیہ ہو گا؟

پھر پو پھٹی اور پھٹتی ہی چلی گئی۔اسے یوں لگا جیسے لٹھے کے کائناتی سائز کے تھان کو دونوں کناروں سے پکڑ کر درمیان سے کاٹا جا رہا ہو۔اس نے زندگی میں کئی بار رات کو صبح، آمریت کو جمہوریت اور ظلمت کو روشنی میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔لیکن اتنی خوبصورت،اجلی اور طویل صبح طلوع ہوتے ہوئے شائد ہی پہلے کبھی دیکھی ہو۔اسے لگا جیسے اب تک وہ اجالے کا استقبال کرتا آیا تھا مگر آج اجالا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

نہایت عجیب اور دلکش منظر تھا۔زمین پر وادیوں میں ابھی رات تھی مگر پہاڑی چوٹیوں پر برف مسکرا رہی تھی اور اوپر آسمان روشن تھا۔جہاز کے پر اب صاف نظر آنے لگے تھے اور فضا میں جگہ جگہ دھنکی ہوئی روئی کے مانند بادلوں کی بستیاں دکھائی دینے لگی تھیں جو لمحہ بہ لمحہ زیادہ اجلی اور سفید ہوتی جا رہی تھیں۔وہ ان بستیوں کے نام سوچنے لگا۔ پینگ

پور ہ،خمار کوٹ،نیند نگر، خواب گڑھ، سپنوں کا گاؤں،نور آباد وغیرہ۔

پھر ان نقرئی بادل بستیوں کے گرد سونے کی فصیلیں تعمیر ہونے لگیں۔ اسے کہیں آسمانوں سے گیتا رائے کی آواز سنائی دی۔دھرتی سے دور گورے بادلوں کے پار آ جا۔ آ جا بسا لیں نیا سنسار آ جا۔گیت ختم ہوتا تو وہ ذہن کے ریکارڈ پلیئر پر اسے پھر نئے سرے سے لگا دیتا۔یوں ہی کئی ہزار میلوں تک وہ متواتر ایک ہی گیت بار بار سنتا رہا۔

پھر اس نے اپنی یاد داشتوں کا وہ فولڈر کھولا، جس کی ایک فائل میں اس نے اپنے حصے کی موعودہ حوروں کو زمینی قصے سنانے کے لئے اپنے نوٹس محفوظ کئے ہوئے تھے۔ اس کا خیال تھا وہ لاکھوں برس تک عرش کے مقدس ماحول میں رہتے اور پارسائی کی بے رنگ زندگی گزارتے گزارتے اکتا گئی ہوں گی اور زمینی قصے انہیں بہت دلچسپ اور اچھوتے معلوم ہوں گے۔اس فولڈر میں کئی مناظر بند تھے۔

پہلا منظر۔گرمیوں کی ایک دوپہر کا،جب وہ بائیسکل پر سکول سے لوٹ رہا تھا اور وہ خربوزوں کے کھیت کی رکھوالی کرتے اپنے باپ کو دوپہر کی روٹی دینے جا رہی تھی کہ وہ دونوں ایک بگولے کی لپیٹ میں آ کر ٹکرا گئے تھے۔بہتے ہوئے کھال میں گر کر ان کے کپڑے گیلے ہو گئے۔ وہ باہر کے بگولے سے تو بچ نکلا تھا مگر اس کے بدن کے چھوٹے چھوٹے بگولوں سے،جو بھیگنے سے نمایاں تر ہو گئے تھے نہ بچ سکا اور ہمیشہ کے لئے اس کی نیلگوں آنکھوں میں ڈوب گیا۔ اور اگرچہ کتابیں بھیگ گئیں،کھانا خراب ہو گیا اور کپڑے مٹی سے لت پت ہو گئے تھے مگر وہ اس کے منہ پر لگی کیچڑ دیکھ کر بے اختیار ہنسے جا رہی تھی۔

دوسرا منظر۔کچے آموں کی رت تھی۔اس روز آندھی کے ساتھ بارش آئی اور رات بھر باد و باراں کا سلسلہ جاری رہا۔بارش اور آندھی سے گر جانے والی کیریاں چننے اور لے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔اس کا گھر گاؤں کے دوسرے سرے پر اور عام گزرگاہ سے ہٹ کر تھا اس لئے وہاں جانے کا کوئی موقع یا بہانہ نہیں ملتا تھا۔وہ جانتا تھا اسے کیریاں پسند ہیں اور وہ علی الصبح آموں والے باغ میں ضرور جائے گی۔ وہ منہ اندھیرے اٹھ کر پہنچا تو وہ دوسری کئی لڑکیوں کے ساتھ سچ مچ وہاں موجود تھی۔جلدی جاگ جانے کی وجہ سے اس کے چہرے پر نیند کا عجیب سا خمار تھا۔ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی اور اس کے سوکھے سیاہ بال اڑ رہے تھے۔جنہیں وہ بار بار پیشانی سے جھٹکتی سمیٹتی مگر وہ بار بار اس کے چہرے کو ڈھانپ لیتے۔

تیسرا منظر۔اس کے پڑوس میں اس کی ایک سہیلی کا بیاہ تھا۔وہ رات کو وہاں آ جاتی اور دیر تک سہیلیوں کے ساتھ شادی کے گیت گاتی رہتی۔وہ بھی بے قراری سے عقبی گلی میں رات رات بھر ٹہلتا اور اس کی آواز سنتا رہتا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی اور اسے گیت بھی بہت یاد تھے۔ خود بھی گھڑ لیتی تھی۔ماہیے کے بول گھڑنے میں تو اسے بہت ہی مہارت تھی۔ایک رات وہ کسی بہانے چھت پر آئی اور منڈیر پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتی رہی۔پھر پتہ نہیں اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے دس بارہ فٹ اونچی چھت سے گلی میں چھلانگ لگا دی اور اگرچہ وہ اس کے بعد کئی روز تک لنگڑا کر چلتی رہی تھی اور اسے اس کے اس والہانہ پن سے خوف بھی آیا تھا مگر وہ منظر اس کی یادداشت کا حصہ بن گیا تھا۔

آہستہ آہستہ بادلوں کے گرد کارِ زرگری تمام ہو گیا۔نیچے وادیاں،بستیاں اور درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔دوری اور بلندی کی وجہ سے ہمالیہ کے ابلتے چشمے تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن کہیں کہیں کسی پہاڑی یا میدانی گھر سے اٹھنے والے دھوئیں سے معلوم ہو رہا تھا چینی جاگ اٹھے ہیں۔پہاڑی ڈھلوانوں پر سبزے کے قالین بچھے تھے اور کالے بادل امڈے ہوئے تھے۔اگرچہ اتنی دور سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا مگر وہ تصور تو کر سکتا تھا،ہرے بھرے جنگلوں میں بلند اور گھنے،طرح طرح کے پھلوں سے لدے اشجار کا،جن کے درمیان توتوں،میناؤں اور کوئلوں کی چہکاریں گونج رہی ہوں گی۔فضا میں تتلیاں بھٹکتی اور چڑیاں اڑتی پھرتی ہوں گی۔ابابیلوں کی ڈاریں ایک دم تیزی سے نیچے کو جاتی پھر اسی تیزی سے واپس

پلٹتی ہوں گی اور نسیمِ سحری کے چلنے سے درختوں کے پتے اور ٹہنیاں آہستہ آہستہ جھولے جھولتی ہوں گی مگر ذہن کی فلاپی میں حوروں کے لئے یہ منظر محفوظ کرتے ہوئے اسے تامل ہوا کہ کہیں وہ نیک بخت یہ نہ کہہ دیں۔لاکھوں برس سے عرش پر بیکار بیٹھی یہی زمینی مناظر دیکھ کر تو وقت گزارتی رہی ہیں۔

سورج ابھی کہیں بحر الکاہل کے جزیروں پر گلاب اور لالے کے پھول برسا رہا تھا لیکن اس سے ہمالیہ کی ترائیاں روشن اور معطر ہونے لگی تھیں۔مگر دور تک کوئی آدم زاد نظر نہ آتا تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھا۔علی سمیت سب لوگ سو رہے تھے۔کیا پتہ بعض اس کی طرح چپکے چپکے جاگ رہے ہوں۔پھر اجالا اور بڑھا۔سورج نے بحر الکاہل کے پانیوں سے سر نکالا اور نیند نگر،نور آباد اور سپنوں کا گاؤں سبھی بادل بستیاں روشن ہو گئیں۔سورج کا سونا ہر طرف پھیل گیا اور روشنی کھڑکی سے اندر گھس آئی۔

’’تم ابھی تک جاگ رہے ہو‘‘؟ علی کی آنکھ کھل گئی

’’ہاں ‘‘

’’اچھا کیا کسی کو جہاز کی نگرانی بھی تو کرنا تھی ‘‘

’’تم تو خوب سوئے ‘‘

’’کتنا اچھا خواب تھا‘‘ علی بولا

’’کیا دیکھا؟‘‘

’’اپنے مرحوم والدین کو‘‘ وہ بولا ’’پہلی بار خواب میں آئے ‘‘

’’کس حال میں تھے ؟‘‘

’’خوش تھے اور جوان‘‘

’’یقیناً جنت میں ہوں گے ‘‘

’’اماں کی گود میں دو تین برس کی صغریٰ تھی ‘‘

’’صغریٰ کون؟‘‘

’’میری چھوٹی بہن۔حال ہی میں جس کا تینتالیس برس کی عمر میں انتقال ہوا۔‘‘

’’تو تم نے چالیس برس پہلے کے زمانے کو خواب میں دیکھا؟‘‘

’’ہاں ‘‘

’’یا پھر اگلے جہان کی ایک جھلک ؟‘‘

’’یار کتنا اچھا ہوتا جو اگلا جہان اسی دنیا،اسی گلوب پر کہیں واقع ہوتا اور جو لوگ ہم سے ایک سرزمین میں بچھڑ جاتے ہیں وہ کسی دوسرے ملک یا خطے میں مل جاتے ‘‘

’’ہم چاہیں تو اب بھی ایسا ہو سکتا ہے‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’سنا نہیں تم نے ؟یہ توہم کا کارخانہ ہے۔یاں وہی ہے جو اعتبار کیا‘‘

’’چلو کچھ دنوں کے لئے ایک نیا نظریہ ایجاد کرتے ہیں ‘‘

’’نظریہ یا مفروضہ؟‘‘

’’ایک ہی بات ہے،ہر نظریہ شروع میں مفروضہ ہی ہوتا ہے‘‘

’’تو کیا کسی اور زمین اور زمانے میں جانے کا ارادہ ہے؟‘‘

’’ہاں ‘‘

یہ اسی سہ پہر یا شائد اس سے اگلے روز کا واقعہ ہے۔

ہم فلائنگ کوچ میں ایک کشادہ سڑک پر سیر کو جا رہے تھے۔ مجھے پھر اونگھ آ گئی۔مگر شور سن کر جاگ پڑا

’’روکو روکو‘‘ ایک بوڑھا چلا رہا تھا ’’میں مریض ہوں زیادہ دیر تک ضبط نہیں کر سکتا‘‘

فلائنگ کوچ ہری بھری فصلوں اور درختوں کے درمیان رک گئی۔سبھی اُتر پڑے اور منتشر ہو گئے۔

کچھ فاصلے پر سیبوں کا مہکتا ہوا ایک باغ تھا۔وہ دونوں چلتے ہوئے اس کے دروازے پر آ گئے۔ سیب کے درختوں کے درمیان کیاریوں میں جیسے نغمے بوئے گئے تھے   طرح طرح کے خوشنما پرندے اپنی اپنی منقاروں سے سازینے بجا رہے تھے۔ وہی کچی کیریاں لوٹنے والی صبح کی سی ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔بڑے دروازے کے قریب دو عورتیں جو ماں بیٹی یا ساس بہو معلوم ہوتی تھیں،اپنے اپنے سامنے ایک ایک ٹوکری رکھے سیب بیچ رہی تھیں۔وہ اشاروں سے بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔ علی نے تصویر بنانے کی کوشش کی تو بڑھیا نے اشارے سے منع کر دیا۔چھوٹی کے سوکھے سیاہ بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔وہ انہیں پیچھے ہٹاتی سمیٹتی مگر وہ بار بار چہرے کو ڈھانپ لیتے۔

’’چھوٹی تمہیں بڑے غور سے دیکھ رہی ہے ‘‘علی بولا ’’جیسے پہچانتی ہو‘‘

’’مجھے بھی اس کی صورت اور منظر جانے پہچانے لگتے ہیں ‘‘

’’مگر تم تو یہاں پہلی بار آئے ہو؟‘‘

’’ہاں مگر لگتا ہے یہ کوئی دوسری زمین اور زمانہ ہے‘‘

’’ہاں اسی جہان میں اگلا جہان؟‘‘

’’نہیں مفروضہ ‘‘

اچانک اسے یاد آ گیا۔اس نے پوچھا

’’تم جمیلہ ہو؟‘‘

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔مگر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔وہ گھبرا کر بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی اسے یقین ہو گیا وہ جمیلہ ہی تھی۔اتنے برسوں بعد قدرتی طور پر شکل و صورت میں کچھ تبدیلی آ گئی تھی مگر اس کی کرنجی آنکھوں کی نیلاہٹ اور چہرے کی ملاحت ابھی تک برقرار تھی۔یوں بھی وہ اس سے کئی برس چھوٹی تھی۔

اس کے ایم اے فائنل کا امتحان دے کر یونیورسٹی سے گاؤں لوٹنے تک وہ بھی عشق کے کئی نو ماہی ششماہی امتحان پاس کر چکی تھی اور اڑوس پڑوس میں آنے جانے اور اٹھنے بیٹھنے کے ٹھکانے تلاش کر چکی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ٹھکانہ بی بی جی کا گھر تھا جن سے وہ سیف الملوک کا سبق لینے آتی اور کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر کے چکر بھی کاٹتی اور سیف الملوک کے شعروں کے بہانے اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہتی۔مگر وہ اب اس سے بات کرنے سے گریز کرنے لگا تھا کیونکہ نہ صرف اس کا رشتہ طے ہو چکا تھا بلکہ عنقریب شادی ہونے والی تھی۔یوں بھی اس کا منگیتر اور بھائی گنوار لٹھ مار قسم کے لوگ تھے اور وہ پڑھا لکھا اور ڈرپوک لڑکا۔ مگر وہ بیوقوفی کی حد تک جذباتی لڑکی تھی،عزت یا جان کسی چیز کی پرواہ نہ کرتی۔

ملازمت کی تلاش اور انٹرویوز کی خاطر اس کا ہر دوسرے تیسرے روز شہر آنا جانا رہتا تھا۔اس کے والدین اور رشتے دار عورتیں بھی اکثر شاپنگ کے لئے شہر آ جا رہی تھیں پڑھا لکھا اور سمجھدار جان کر وہ شادی کے زیورات اور کپڑوں کے انتخاب اور خریداری میں اس سے مدد لیتی رہتی تھیں۔وہ اس با ت پر بہت خوش ہوئی۔ایک روز کہنے لگی:

’’میرا شادی کا جوڑا تم نے پسند کیا؟‘‘

’’ہاں میرا مشورہ شامل تھا‘‘

’’کاش تم مجھے یہ جوڑا پہنے بھی دیکھ سکتے ‘‘

’’مکلاوے آؤ گی تو پہن کر آ جانا۔دیکھ لوں گا‘‘ اس نے دل رکھنے کو کہہ دیا۔

’’تب تک تو وہ میلا ہو جائے گا‘‘

’’پھر تو ممکن نہیں ‘‘

لیکن اس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

ایک روز دوپہر کو اس کی برات آئی اور شام کو وہ ڈولی میں بیٹھ کر سسرال چلی گئی۔وہ شہر سے لوٹا تو گھر کے سب لوگ اس کی شادی میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ شام سے کچھ دیر پہلے اس کی رخصتی ہوئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھر آ گئے۔گاؤں میں کچھ دیر شادیانے بجتے رہے پھر ہر طرف اداسی چھا گئی۔

کاتک کا مہینہ تھا اور پورے چاند کی رات۔

خنک چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور اوس سے بوجھل ہوا چل رہی تھی۔بھورے شاہ کے مزار پر قوالی ہو رہی تھی اور گیت دھمالیں ڈال رہے تھے۔

’’چھیتی بوہڑیں وے طبیبا نہیں تے میں مرگیا ں۔تیرے عشق نچایاں کر کے تھیاتھیا‘‘

قدموں کی دھمک اور گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ گھر والے اس شور کی وجہ سے جمعرات کو چھت پر نہیں سوتے تھے مگر وہ چھت پر ہی سوتا تھا کیونکہ اسے قوالیاں اور گیت اچھے لگتے تھے اور اگر سونا چاہتا تو لوری کا کام دیتے اور سپنوں میں رنگ بھرتے رہتے۔ اور آج تو دل کے زخموں پر مرہم کا کام دے رہے تھے۔

گاؤں بھرکی چھتیں ایک دوسری سے ملی ہوئی تھیں اور بڑی گلی کے دونوں طرف کسی بھی ایک چھت پر چڑھ کر پورے گاؤں میں گھوما جا سکتا تھا۔قوالی کے بول بھی بانس کی سیڑھیاں لگا کر ہر چھت پر چڑھ آئے تھے اور پورے گاؤں میں گھوم رہے تھے۔

ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اور یہ دیکھ کر اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ زیورات سے لدی،سہاگ کے اسی سرخ جوڑے میں ملبوس وہ چاند کی طرف رخ کئے پائنتی کی طرف کھڑی تھی۔اس کا سسرال تین چار کوس دور تھا اور اس کی رخصتی ہوئے بمشکل ایک پہر گزرا تھا۔اس کا اکیلے اتنی رات گئے واپس آ جانا ممکن نہیں تھا۔یقیناً یہ خواب تھا یا کوئی اسرار۔کیا پتہ بھورے شاہ کے مزار کی کوئی ڈائن یا پچھل پائی اپسرا کا روپ بھر کر آ گئی ہو۔

اس نے تھوڑی دیر کو آنکھیں بند کر لیں اور جب دوبارہ کھولیں تو وہاں کوئی نہیں تھا۔یقیناً یہ سوتی یا جاگتی آنکھوں کا خواب ہی تھا ورنہ وہ اتنی جلدی بہت سی چھتیں پار کر کے غائب نہ ہو جاتی۔مگر ہوا میں اب تک اس کی خوشبو موجود تھی۔ اگر وہ صرف گمان تھی تو یہ خوشبو کہاں سے آئی؟

اگلے روز پتہ چلا اس نے سسرال پہنچتے ہی شور مچا دیا تھا کہ اس سے بھول ہو گئی ہے۔اس نے شوہر کا منہ دیکھنے سے پہلے بھورے شاہ کو سلام کرنے کی منت مانی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر اور سسرال والے بھورے شاہ کے معتقد اور مرید تھے وہ اس کے فریب میں آ گئے۔ انہوں نے کہاروں سے کہا کہ وہ اسے فوراً لے جائیں اور سلام کروا کر واپس لے آئیں۔اس کے ہوش اُڑ گئے۔ مزار سے نکل کر اتنی دُور آتے جاتے اسے ضرور کسی نہ کسی نے دیکھ لیا ہو گا اور بات پھیل جائے گی۔

اس کا اندیشہ درست نکلا۔بات نہ صرف پھیل گئی تھی بلکہ اس کے سسرال والوں نے خفیہ طور پر اس کا بھورے شاہ کے مزار تک پیچھا کیا تھا۔ اگلے روز اس کے بھائیوں نے بھی تفتیش شروع کر دی۔اس کے لئے اب گاؤں چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا وہ ایک روز شہر اور کچھ عرصہ بعد بیرونِ ملک چلا گیا۔

شروع شروع میں اس کے بارے میں خبریں ملتی رہیں کہ سسرال والوں کی طرف سے اس پر بہت پابندیاں ہیں۔شوہر سختی کرتا اور مارتا پیٹتا ہے اور اسے میکے گاؤں آنے جانے اور والدین سے ملنے تک کی اجازت نہیں۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس کے سسرال والوں نے دوسرے صوبے میں زمین خرید لی اور وہاں منتقل ہو گئے۔پھر ایک روز پتہ چلا کہ وہ بیمار ہو کر فوت ہو گئی ہے۔لیکن کچھ لوگوں کو شبہ تھا اسے قتل کر دیا گیا تھا اور اس کے بھائی اور دوسرے رشتہ دار بھی اس واردات میں شامل تھے۔

اور اب اتنے برسوں بعد وہ اس کے سامنے زندہ اور سلامت موجود تھی مگر جیسے اس کی قلبِ ماہیت ہو چکی تھی۔شائد زندگی کے تلخ تجربات اور ٹھوکروں نے اس کے مزاج کو تبدیل کر دیا تھا اور اس کی ساری شوخی،بہادری اور جوش چھین لیا تھا ورنہ وہ اتنے عرصہ بعد اور ایک اجنبی سرزمین میں اسے اچانک دیکھ کر بے اختیار لپٹ نہ جاتی؟

سب لوگ اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھ چکے تھے اور ڈرائیور ہارن دے کر اسے بلا رہا تھا۔اب مصلحت اور احتیاط کی گنجائش نہیں تھی اس نے کہا:

''تم نے مجھے پہچانا جمیلہ۔ میں طاہر ہوں۔پتہ نہیں تم یہاں کیسے پہنچیں اور کس حال میں ہو مگر شکر ہے تم زندہ ہو۔ہم نے تو سنا تھا تمہیں قتل کر دیا گیا تھا''

اس نے پریشان ہو کر پہلے بڑھیا کو اور پھر اپنے اردگرد دیکھا پھر بولی

’’تم نے ٹھیک سنا تھا۔انہوں نے پاؤں کے ساتھ پتھر باندھ کر مجھے اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا‘‘

’’پھر تم یہاں کیسے پہنچیں ؟‘‘

’’ مجھے جس کنویں میں پھینکا گیا تھا اس کی تہہ نہیں تھی۔وہ چاہ در چاہ کی صورت اندر سے دنیا بھر کے کنوؤں سے ملا ہوا تھا۔میں نیچے ہی نیچے گرتی چلی گئی اور اس بڑھیا کے بیٹے نے مجھے اپنے گھر کے کنویں سے باہر نکال لیا‘‘

’’اب تم میرے ساتھ واپس چلو گی؟‘‘

’’نہیں ‘‘ وہ بولی ’’لیکن ایک اجنبی کے ساتھ بات کرنے کے جرم میں اب یہ بھی مجھے کنویں میں پھینک دیں گے۔تم مجھے تلاش کر کے وہاں کسی کنویں سے نکال لینا‘‘

بڑھیا اپنی زبان میں زور زور سے کچھ بولنے لگی۔گائیڈ بھاگا بھاگا آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے فلائنگ کوچ میں لے گیا۔اچانک فلائنگ کوچ جہاز میں تبدیل ہو کر فضا ء میں اڑنے لگی۔پھر ائیر ہوسٹس کی آواز سنائی دی۔

’’خواتین و حضرات بیلٹس باندھ لیجئے ہم تھوڑی دیر میں بیجنگ کے بین الاقوامی ائیر پورٹ پر اترنے والے ہیں‘‘

***

چھتیں اور ستون

کہانی یوں شروع ہوتی ہے۔

وہ پچھلے اٹھارہ گھنٹے سے ڈیوٹی دے رہا تھا۔

دوسری شفٹ ختم ہونے والی تھی، تیسری شفٹ کی لیبر تنبوؤں سے نکل کر اپنے اپنے میٹوں کے گرد جمع ہو رہی تھی۔

چاروں طرف مشینوں کا شور اور پیٹرول اور ڈیزل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نیچے ڈمپر، واٹر پمپ اور مکسر مشینیں شور مچا رہی تھیں اور چھت پرنیڈل وائبریٹرز ایک دوسرے کا منہ چڑا رہے تھے۔

دوسری شفٹ کی لیبر اب تھک کر چور ہو چکی تھی مگر ٹھیکیدار اور اس کے میٹ منشی چلا چلا کر ان کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ ''شاباش پترو''۔۔ شاباش شیرو''۔ وہ نعرے لگا کر ان کے تھکے ہوئے جسموں سے خون کی آخری بوندیں بھی نچوڑ رہے تھے۔ بجلی کی تار میں پرویا ہوا نوٹوں کا ہار صبح سے بانس پر لٹکا ہوا تھا۔ ہوا میں پھڑ پھڑاتے ہوئے نوٹ سرچ لائٹ کی روشنی میں بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ یہ نوٹ مقررہ مزدوری کے علاوہ انعام کو حاصل کرنے کے لئے دو ہزار پانچ سو مکعب فٹ کنکریٹ ڈالنے کی شرط تھی۔ پہلی شفٹ کی لیبر بمشکل دو ہزار مکعب فٹ کنکریٹ ڈال سکی تھی۔ لیکن، دوسری شفٹ کی لیبر مقررہ نشان کے بالکل قریب پہنچ گئی تھی۔ جوں جوں مقررہ نشان اور وقت قریب آ رہا تھا۔ میٹوں منشیوں کے نعرے اور بلند ہوتے جا رہے تھے۔ تھکے ہوئے جسموں، میں نئی روح پھونکی جا رہی تھی اور ساری لیبر شرط جیتنے کی جان توڑ کوشش کر رہی تھی۔

اس کا لیبر اور شرط جیتنے سے کوئی تعلق نہیں تھا وہ سرکاری طور پر کام کی نگہداشت کر رہا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ ٹھیکیدار کے رہا تھا ا ور اس کی نظریں کام کی کوالٹی کے علاوہ بھی ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ دلچسپی سے لے رہا تھا اور اس کی نظریں کام کی کوالٹی کے علاوہ بھی ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آخری چند منٹ انتہائی فیصلہ کن تھے۔ اس لئے مشینوں اور انسانی آوازوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ وہ تغاریاں پھینک کر نعرے اور للکرے لگانے اور بکرے بلانے لگے۔ کچھ

زیادہ جوشیلے بھنگڑوں کے گرد خٹک ناچ کو بھوں بھنوالیاں دے رہے تھے کہ اچانک بڑی مکسر مشین بند ہو گئی۔

بڑی مکسر مشین کی آواز بند ہوتے ہی نعرے اور للکرے سینوں میں گھٹ گئے۔ اور کھلے ہوئے چہرے مرجھا گئے۔

پتہ نہیں، اسے کیسے پتہ چل گیا کہ مشین خراب نہیں ہوئی کی گئی ہے اور آپریٹر ٹھیکیدار سے ملا ہوا ہے۔

وہ چیخ چیخ کر لیبر کا ساری صورتحال سے با خبر کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنی عزت اور جان بھی عزیز تھی اسے رہ رہ کر لیبر پے غصہ آ رہا تھا آخر اتنے سارے میٹوں، مزدوروں اور کاریگروں میں سے کسی کے دماغ میں بھی اتنی معمولی سی بات خود بخود کیوں نہیں آ ہی تھی۔ وہ کرسی چھوڑ کر نیچے اترنے لگا سیڑھی پر اس کی ملاقات تلہ گنگئے سے ہو گئی وہ کالو کے ساتھ آخری جھانبر اٹھائے بھاری قدموں سے اوپر آ رہا تھا اس نے تلہ گنگئے کے کان میں کہا!

''مشین جان بوجھ کر خراب کی گئی ہے تم لوگوں سے بے انصافی ہو رہی ہے'' اتنا کہہ کر وہ سیڑھیاں اتر گیا تلہ گنگئے نے جھانبر پھینک دی اور چلانے لگا ''یہی چار سو بیسی نہیں چلے گی'' تھوڑی دیر میں لیبر نے کام کرنا چھوڑ دیا اور آپریٹر کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ آپریٹر موقع پا کر بھاگ گیا اور ٹھیکیدار نے لیبر کے انعام جیتنے کا اعلان کر کے صورت حال پر قابو پا لیا۔

وہ بہت خوش تھا۔ اس کی دن بھر کی ساری تھکن دور ہو گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا اور نیند کی وجہ سے اسے بار بار جمائیاں آ رہی تھی، لیکن اب اس کا ذہن ہلکا ہو گیا تھا اور روح مسرت سے لبریز تھی۔

وہ پچھلے سات آٹھ گھنٹوں سے اپنے انجینئر انچارج شیخ صاحب کو کوس رہا تھا۔ جو تھوڑی دیر کے لئے آ کر چلے گئے تھے اور اب تک نہیں لوٹے تھے اس کا خیال تھا وہ دوسری شفٹ میں ڈیوٹی دیں گے اور وہ آرام کر لے گا مگر شائد وہ بھول گئے تھے کہ کام کی اہمیت کیا ہے اور ان کی ذمہ داری کیا، کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ انہیں فون کرے یا جیب بھیج کر پتہ کرائے مگر اس خیال سے کہ وہ بُرا نہ مانیں وہ ایسا نہ کر سکا۔

وہ کچھ دیر کے لئے سستانا چاہتا تھا۔ مگر اب تیسری شفٹ شروع ہو رہی تھی۔ اور چھت کے EXPANSION JOINTS کا کام تھا جہاں اس کی موجودگی اور نگرانی بے حد ضروری تھی ورنہ چھت کے ہمیشہ ٹپکتے رہنے کا خدشہ تھا۔

وہ دوبارہ چھت پر آ رہا تھا کہ چوکیدار نے اسے اطلاع دی نیچے سائٹ آفس میں ٹیلی فون پر شیخ صاحب اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔

شیخ صاحب مری سے بول رہے تھے وہ حیران تھا قومی اہمیت کی عمارت کی آخری چھت کو نظر انداز کر کے وہ مری کیسے پہنچ گئے تھے۔ وہ انہیں کام کی نوعیت و اہمیت اور ان کی حاضری کی ضرورت اور اپنی تھکاوٹ کی تفصیلات بتانا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ وہ ان کا ما تحت ہے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

شیخ صاحب اس کے آرام نہ کر سکنے پر رسمی سی معذرت کر کے اسے بتا رہے تھے کہ کیسے وہ چند شوخ اور حسین لڑکیوں کی کار کا پیچھا کرتے ہوئے مری پہنچ گئے تھے ان کی اس سے سب معاملات میں بے تکلفی تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ مری پہنچ کر وہ لڑکیاں انہیں ڈاج کر کے گاڑی نکال کر لے گئیں اور اب وہ انہیں اگلے روز تلاش کر کے لوٹیں گے۔پہنچ کر وہ لڑکیاں انہیں ڈاج کر کے گاڑی نکال کر لے گئیں اور اب وہ انہیں اگلے روز تلاش کر کے لوٹیں گے۔

پھر شیخ صاحب نے اسے کراچی کا ایک نمبر دیکر ہدایت کی کہ وہ ان کے دوست احمد سے رابطہ قائم کرے اور انہیں پیغام پہنچائے کہ پچھلے سال والا ان کا دوست مری کی مال پر گھومتا دیکھا گیا ہے اس لئے احمد صاحب کو جلد از جلد کا نام بتایا اور کہا کہ شیخ صاحب کو بتایا جائے کہ ان کا دوست آج کل نائٹ ڈیوٹی پر ہے۔

اس نے شیخ صاحب سے رابطہ قائم کیا اور پیغام پہنچا دیا۔ شیخ صاحب پریشان ہو گئے کہنے لگے۔ اس احمد کے بچے سے یہ تو پوچھتے خ یا ص، کس دوست کی بات کرتا ہے! اس نے احمد صاحب سے کہو خ اب کہاں۔۔۔ ص اب۔ض بن گا ہے۔ اب تو نون کی بات کریں ''

اس نے شیخ صاحب کو نون کے بارے میں اطلاع دی تو انہوں نے ہدایت کی کہ احمد صاحب کے بتائے ہوئے ہسپتال کا نمبر ڈائریکٹری سے لے کر ڈائل کرے اور لیڈی ڈاکٹر مس نجمہ کا پتہ چلائے کہ وہ کب تک اور کس نمبر پر مل سکتی ہے۔

اس نے ڈائریکٹری کھولی، نمبر تلاش کیا۔ ڈائل کرنے پرت پتہ چلا نمبر مصروف ہے وہ انتظار کرنے لگا اور وقت گزارنے کے لئے ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔

دنیا بھر میں رسل و رسائل کے تیز طریقوں نے دوری کے تصور کو فنا کر دیا ہے۔۔۔ خود کا ٹیلیفون کی ترویج نے فاصلوں کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔۔۔ اندروں ملک سب سکرابئرز ٹرنک ڈائلنگ سے آپ کو جلدی رابطہ قائم کرنے کے یکساں مواقع ملتے ہیں۔ اور آپ زیادہ راز داری سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

اس نے دوبارہ کوشش کی۔ ایک مترنم آواز سنائی دی۔

''ہیلو''

''ڈاکٹر مس نجمہ ہیں ''؟

’’وہ آپ کی کیا لگتی ہیں ‘‘؟

’’جی؟--- جی کچھ نہیں۔‘‘

’’اچھا یہ تو بتاؤ--- کیا خوبصورت ہیں ‘‘؟

’’جی‘‘؟ وہ پریشان ہو گیا۔

’’دل زیادہ اداس ہوا کرے اور نجمہ بہت یاد آیا کرے تو تم مجھ سے بناتیں کر لیا کرو، اچھا اب سو جاؤ-- اچھے بچے‘‘۔

اس نے گھبرا کر ٹیلیفون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر تک سر پکڑ کر بیٹھا رہا پھر شیخ صاحب کو فون کر کے ساری بات سنائی وہ ہنسنے لگے بولے:-

’’معلوم ہوتا ہے تمہیں غلط نمبر مل گیا دوبارہ کوشش کرو‘‘۔

اس نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ ڈائل کیا۔ آواز نے اس کا اتا پتہ پوچھا اور کہا:

’’ان سے کہیں میں رات بھر ڈیوٹی پر ہوں اور انکے فون کا انتظار کروں گی‘‘۔

اس نے نجمہ کا پیغام پہنچا دیا شیخ صاحب بہت خوش ہوئے پھر انہیں اچانک یاد آیا کہ EXPANSION JOINTS اور چھت کے کام کی نگرانی ضروری تھی اور اسے وہاں ہونا چاہئے تھا۔ انہوں نے اسے ضروری ہدایات دیں۔ اپنے نہ آ سکنے کی ایک بار پھر معذرت کی اور فون بند کر دیا۔

جب وہ چھت پر آیا تو تیسری شفٹ کی لیبر EXPANSION JOINTS کا کام اپنی مرضی سے مکمل کر کے آگے بڑھ چکی تھی۔

بجلی کی تار میں پرو گیا ہوا نوٹوں کا ایک اور ہار بانس سے لٹکا ہوا تھا۔ ہوا میں پھڑپھڑاتے ہوئے نوٹ بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ ٹھیکیدار کے کارندے چلا چلا کر لیبر کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور انہیں جوش دلا رہے تھے۔ شاباش پترو، شاباش شیرو۔،

اسی جوش و خروش میں سنگ جانی کے پنوں خان کا پاؤں پھسل گیا اور وہ سیڑھی سے نیچے گر گیا۔

کہانی یہاں ختم ہوتی ہے۔

لیکن شائد نہیں ہوئی۔ اس میں کئی باتوں کا ذکر نہیں ملتا۔ مثلاً بانس پر لٹکائے ہوئے نوٹوں کی رقم کتنی تھی۔؟

کراچی لاہور اور مری کے درمیان بار بار ٹیلیفون سے رابطہ قائم کرنے کا بل کتنا تھا اور کس نے ادا کیا تھا۔؟

پنوں خان کی بیساکھیاں کتنے میں آئی تھیں۔؟

اور اس کہانی میں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ قومی اہمیت کی اس عمارت کی تعمیر پر شیخ صاحب کو اعلیٰ کارکردگی کا کون سا تمغہ ملا تھا اور کہانی کے مرکزی کردار کو چھت ٹپکنے کی وجہ سے کب نوکری سے نکالا گیا تھا۔

لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل اور وضاحت کی جانے لگے تو کہانی کبھی ختم نہ ہو۔

***

دیمک کا گھرونده

اس روز بھی وہ حسب معمول بین میوزک ریکارڈ سن رہا تھا۔ آٹو میٹک ریڈیو گرام پر ریکارڈ خود بخود بار بار بج رہا تھا کہ مجھے اونگھ آ گئی۔ پھر جب میں نے آنکھیں کھو لیں تو کمرے میں کہیں ارشد نظر نہ آیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا ریڈیو گرام کے پاس ایک سیاہ ناگ پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ میں اچھل پڑا۔

’’سانپ سانپ‘‘؟

میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اسی لمحے ارشد نے مجھے آواز دی۔

’’کیا ہوا کہاں ہے سانپ‘‘؟

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ارشد اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا اور ریڈیو گرام کے پاس کوئی سانپ نہیں تھا۔

’’میرا خیال ہے تم سو گئے تھے۔ اور بی ن میوزک کے تعلق سے تم نے سانپ کا خواب دیکھا۔‘‘

مجھے یقین آ گیا کہ یہ میرا خواب ہی تھا لیکن کیسا عجیب اور انوکھا خواب! اور شائد میں حقیقت کو خواب ہی سمجھتا رہتا کہ ایک دن جب لباس اور کردار کے موضوع پر بحث ہو رہی تھی اس نے اچانک کہا۔

’’اگر لباس کردار کا آئینہ ہوتا ہے تو تمہاری میلی چکٹ بنیان اس بات کا ثبوت ہے کہ تم اندر سے غلیظ ہوا‘‘۔

لمحہ بھر کے لئے میرا دماغ سن ہو گیا۔ بے شک میں نے اجلی قمیض اور نئے سوٹ کے نیچے میلی چکٹ بنیان پہن رکھی تھی مگر ارشد کو کیسے معلوم ہو گیا۔ جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

مجھے تمہارے بدن سے میل اور پسینے کی بو آ رہی تھی۔‘‘

مگر مجھے یقین نہ آیا میں اس کی قوت شامہ کی داد دینے کی بجائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے ایک تیز سی روشنی نکلی اور مجھے یوں لگا جیسے میرا سارا بدن سلگ اٹھا ہو۔

اچانک اس نے چائے اور بسکٹوں کی فرمائش کر دی۔ اور میں جیسے کسی طلسم سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کر اندر چلا آیا۔ امی نماز پڑھ رہی تھیں اور شکیلہ گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ سلام پھیر کر امی نے اسے چائے کی کیتلی چولھے پر چڑھانے کو کہا۔ وہ میرے کام بہت خوشی سے کرتی ہے بھاگ بھاگ کر چائے بنانے میں امی کی مدد کرنے لگی۔ میں قریبی مارکیٹ سے ارشد کی پسند کے بسکٹ لینے چلا گیا۔ واپس آیا تو شکیلہ ڈرائنگ روم میں چائے کے برتن رکھنے گئی ہوئی تھی۔ میں اسے اندر بھیجنے پر امی سے خفگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ اندر سے اس کی چیخ سنائی دی۔ میں بھاگ کر اندر پہنچا تو دیکھا چائے کے برتن ٹوٹے پڑے تھے۔ شکیلہ منہ چھپائے ایک طرف کھڑی رو رہی تھی اور ارشد کہیں نہیں تھا۔ مگر پھر اسی دم میری نظر نالی میں غائب ہوتی سانپ کی دم پر پڑی۔میں ہاکی لیکر اس کا سر کچلنے نکلا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں نے شکیلہ کو دلاسا دینے اور کئی روز تک مجھ سے ہی نہیں میرے دھلائی کے لئے اترے اور کھونٹیوں پر ٹنگے کپڑوں سے بھی یوں ڈرنے لگی جیسے ان میں سانپ چھپے ہوں جو چھونے پر اسے ڈس لیں گے۔

اب جب بھی میں گھر سے باہر نکلتا ہوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ارشد کی چمکتی ہوئی آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہیں اور میں کوئی دم میں اس کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شعلوں میں جھلس کر رہ جاؤں گا۔ اندھیرے سے مجھے خوف آتا ہے۔ کیا خبر وہ یہیں کہیں رینگ رہا ہو۔ مجھے ہر ملنے والے اور ہر راہ گیر پر سانپ ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اور دفتر میں بیٹھے بیٹھے میں سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ کی سیٹ والا سپرنٹنڈنٹ یا سٹول پر بیٹھا ہوا چپڑاسی ابھی اٹھ کر فرش پر کنڈلی مار کر بیٹھ جائے گا۔ اور پھن پھیلانے لگے گا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں خود بھی انسان کی جون میں کوڑئی سانپ ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر مجھے کسی دن پتہ چلا کہ میں سچ مچ اصل میں سانپ ہوں تو مجھے مختلف لوگوں کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا ہو گا مثلاً وہ بڑھیا جو میری ماں کہلاتی ہے۔۔ لیکن کیا خبر وہ بڑھیا یعنی میری ماں دراصل انسان کی جون میں کوئی ناگن ہو اور عورت بن کر اس نے میرے باپ سے شادی کر لی ہو۔ اور کون جانے ایک روز اس نے میرے باپ کو ڈس لیا ہو اور وہ مر گیا ہو لیکن یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ میرا باپ سانپ نہیں تھا۔ ممکن ہے ماں سے اکتا کر اس نے مرنے کا بہانہ کیا ہو اور قبر سے نکل کر اپنے پرانے بل یا غار میں چلا گیا ہو۔۔۔؟

میں نے ارشد کو اس کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔میرا خیال ہے وہ کچھ عرصہ کے لئے شہر سے باہر کسی ویرانے میں چلا گیا ہو گا اور سانپوں کے کسی غار میں رہتا ہو گا مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار اس نے کہا تھا کہ نرم، چکنی اور سفید جلد والے انسانوں کو دیکھ کر اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ ان جسموں سے بہت سا کچا گوشت کاٹ کر کھا جائے۔ شہر میں آج کل ایسے لوگوں کی اچانک گم شدگی بڑی پر اسرار اور پریشان کن ہے لیکن مجھے یقین ہے یہ سب کچھ جون بدلنے والے سانپوں اژدہوں کی وجہ سے ہے۔ اگر ان کا غار دریافت ہو جائے تو بے شمار انسانوں کی کھوپڑیاں اور ہڈیاں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ میں نے ماں اور شکیلہ کو اپنے گھر میں

نظر بند کر رکھا ہے۔ اور ان کا پہرہ دے رہا ہوں۔ ماں میری شادی پر مصر ہے اس نے میرے لئے پہلے سے ایک لڑکی چن رکھی ہے مگر میں نے ابھی تک اس لڑکی کو نہیں دیکھا اور کہہ سکتا کہ وہ لڑکی ہی ہو گی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جب ڈولی کا پردہ سرکایا جائے تو وہ کنڈلی مارے بیٹھی ہو یا پھر میرے پہلو میں لیٹی لیٹی اچانک ناگن بن کر میرے سینے پر چڑھ جائے۔

ان دنوں میں ہر وقت ڈرتا اور بدکتا رہتا ہوں۔ ذرا سی بھی آہٹ ہوتی ہے تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگتا ہے۔ چلتے پھرتے پاؤں کے نیچے کاغذ کا ٹکڑا بھی آ جائے تو میں چھپ پڑتا ہوں۔ درخت سے زرد درخت پتہ گرے تو لمحہ بھر کے لئے میرا کون خشک ہو جاتا ہے۔ رات برات بھر مجھے ڈراؤ نے خواب پریشان کرتے رہ جاتے ہیں اور میں ہر شب سینکڑوں، ہزاروں سانپوں میں گھرا رہتا ہوں اور چونک چونک جاتا ہوں۔ ہوا کا جھونکا مجھے سانپ کی پھنکار معلوم ہوتا ہے۔ روشنی کی کرن مجھے سانپ کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی چمک معلوم ہوتی ہے تاریکی میں میرے لئے ہر چیز سیاہ ناگ بن جاتی ہے۔ ہر چیز جو نرم اور لجلجی ہو یا اس کی بناوٹ سانپ کی طرح ہو میں اس چھو نہیں سکتا یہاں تک کہ جب میں سکوٹر دوڑاتا ہوں تو میرے گلے مین ٹائی ہوا میں لہراتی ہے تو مجھے اس پر ایک رنگ دار سانپ کا گمان ہوتا ہے جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو ریشمی رومال کے لمس سے تھوڑی دیر کے لئے خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔

یہ سب کچھ محض میرا وہم نہیں ہے میں نے جب سے ارشد کو سانپ کی صورت میں دیکھا ہے پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں اور میری سا احتیاط کی وجہ سے مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی ہے کہ شہر میں ایک ارشد ہی اکیلا آدمی کی جون میں سانپ نہیں ہے ان سب لوگوں میں جنہیں ہم سڑکوں، بازاروں، گلیوں اور محلوں میں آتے جاتے دیکھتے ہیں اور جن سے ہماری دوستی اور قرابت داری بھی ہوتی ہے ان میں سبھی نہیں و بہت سے، دراصل سانپ ہیں۔ اور انسان بن کر انسانوں میں رہتے ہیں میں اکثر اپنی آستینیں اور چڑھائے رکھتا ہوں تاکہ ان میں کوئی سانپ چھپ کر نہ بیٹھ جائے۔

میں نے کئی بار چاہا ہے کہ اپنے دوستوں، عزیزوں اور شہر کے لوگوں کو ان سب سانپوں کے بارے میں بتاؤں۔ لیکن میں اپنی کوشش میں لوگوں یعنی انسانوں میں خوف و ہراس پیدا نہیں کرنا چاہتا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بھرے پرے خوبصورت شہر ویران ہو جائیں۔ اس طرح بازار اور گلیاں، تفریح گاہیں، سکول، کالج ور یونیورسٹیاں بند ہو جائیں گی۔ سینما ہالوں میں صرف سانپ اور اژدہے باقی رہ جائیں گے۔ اور لوگ ایک دوسرے پر شک کرنے اور ایک دوسرے سے خوف زدہ رہنے لگیں گے۔ اور ہر آدمی ایک دوسرے سے آنکھ ملاتے ہوئے دہشت زدہ ہو گا۔

اور چونکہ ویرانہ جنگل اور تاریکی سانپوں کے مسکن ہوتے ہیں اس لئے لوگ شہروں سے بھاگ کر جنگلوں اور ویرانوں کی طرف رخ نہیں کریں گے۔ بلکہ اپنے اپنے گھروں میں محصور ہو جائیں گے انسانی نسل کے لئے جب بھی کوئی خطرہ در

پیش ہوا دھرتی نے ہمیشہ اسے آغوش میں پناہ دی ہے۔ انسان خوف زدہ چوہوں کی طرح زمین کے اندر ہی اندر گھستے چلے جائیں گے یہاں تک کہ شہر کے نیچے ایک اور شہر آباد ہو جائے گا سرنگوں اور انڈر گراؤنڈ بیس منٹوں کا جال پورے شہر میں پھیل جائے گا۔ جس سے عمارتوں کی بنیادیں کھو کھلی ہو جائیں گی۔ اور شہر زمین میں دھنس جائے گا۔ گویا تاریخ خود کو دہرائے گی میرا یہی خیال ہے کہ ہڑپہ، موہنجو ڈارو اور ٹیکسلا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو گا۔سو سال کی عمر پا کر انسان کا روپ دھارنے والے سانپوں نے جب شہروں پر یلغار کر دیتی ہو گی تو ان لوگوں ان کے خوف سے گھروں کہ آہنی دروازے لگا کر بند کر لیا ہو گا پھر آدمی چوہوں کی طرح سرنگیں ب اور بل کھود کر زیر زمین دھرتی کے اندر رہنے لگے ہونے بلند و بال عمارتوں کی بنیادیں سرنگوں کے جال سے کھوکھلی گئی ہونگی اور پھر یہ شہر زمین میں دھنس گئے ہوں گے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ عمارتیں بھی خوف زدہ ہو کر دبک گئی ہوں گی لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس راز کو اپنے تک محدود رکھنا چاہتا ہوں لیکن اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے اس کی دوسری وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں بنیادی طور پر ایک بزدل انسان ہوں مجھے ڈر ہے کہ جونہی میں کسی آدمی سے اس بات کا ذکر کروں گا وہ آدمی مجھے بغیر آنکھیں جھپکائے تھوڑی دیر تک گھورتا رہے گا پھر مجھے ڈس کر کسی نالی میں روپوش ہو جائے گا۔

***

دیوارِ گریہ

گاؤں کے سر کردہ لوگوں کے وفد سے میں نے اتوار تک کی مہلت مانگی اور وعدہ کیا کہ میں گاؤں آ کر اسے سمجھاؤں گا ہو سکتا ہے وہ میری بات مان جائے۔

انہوں نے کہا ''ہم اتوار تک آپ کا انتظار کریں گے، ہمیں آپ کا بہت لحاظ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کی بات ضرور مان جائے گی۔ کیونکہ وہ صرف آپ سے ڈرتی ہے۔''

''اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اگر وہ مجھ سے ڈرتی ہے تو میں بھی تو اس سے ڈرتا ہوں ایک انجانے خوف کی دیوار ہم دونوں کے درمیان حائل ہے کبھی کبھی یوں لگتا ہے ہم دونوں اپنے اپنے ہاتھوں پر اس دیوار کو روکے کھڑے ہیں اور ہم میں سے جس نے بھی ہاتھ پیچھے ہٹائے وہ دیوار کے نیچے دب جائے گا۔

وہ میری سگی خالہ نہیں تھی۔

لیکن وہ مجھے اپنی سگی خالاؤں سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ خوبصورت چیزیں ہمیں دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ میں زیادہ اچھی لگتی ہیں خواہ ان کا تعلق ہم سے ایک جیسا ہو۔ ہم اپنے بچوں میں سے خوبصورت ترین بچے سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور خواہ ہمارے قدموں میں گیارہ کڑیل جو ان بیٹے بیٹھے ہوں بارھویں خوبصورت بیٹے کی جدائی میں ہماری آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں بن جاتی ہیں۔

خوبصورت بیٹیوں کے بڑھتے ہوئے بدن اور روز بروز گلابی ہوتے رخسار دیکھ کر میں خواہ مخواہ ان پر پیار آنے لگتا ہے۔ بد صورت بہن کو ہم آسانی سے ڈانٹ سکتے ہیں لیکن خوبصورت بہن کی فرمائش آسانی سے نہیں ٹال سکتے۔

خالہ خوبصورت تھی اس لئے مجھے اپنی سگی خالاؤں سے اچھی لگتی تھی۔ ویسے بھی ہم بچپن میں ایک ساتھ کھیلے تھے۔

وہ مجھ سے کچھ ہی بڑی تھی مگر اسے کہانیاں بہت یاد تھیں۔ میری اس سے بڑی دوستی تھی اور میں زیادہ تر وقت اسی کے ہاں گزارتا تھا۔ کبھی کبھی خالہ اپنی خالہ کے ہاں چلی جاتی تو میرا دل اُداس ہو جاتا۔میں ابّا کے صندوق سے وہ کتاب نکال لیتا جس میں ہر طرح کے تعویذ اور گنڈے تھے یہ کتاب ابّا کے ہاتھ دادا جان کے انتقال

کے بعد آئی تھی لیکن میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں کتاب سے بچھڑے اور روٹھے ہوئے محبوب کو منانے اور واپس بلانے کے تعویذ نقل کر کے آزماتا اور خالہ کو چند ہی روز میں واپس آنا پڑ جاتا لیکن اسے بالکل پتہ نہ چلتا کہ میں نے اسے کس طرح واپس آنے پر مجبور کیا ہے۔

پھر خالہ اچانک بڑی ہو گئی اور زیادہ خوبصورت بھی۔ اسے کا گال انگاروں کی طرح دہکنے لگے۔ آنکھیں زیادہ چمکیلی اور نشیلی ہو گئیں اور بال لمبے ہو کر ٹخنوں تک پھیل گئے جب کبھی وہ مجھے پیرا کرتی اور میرا منہ چومتی۔ مجھے اس سے بڑی میٹھی میٹھی خوشبو آتی اور میرا جی چاہتا وہ میرا جی چاہتا وہ میرا من چومتی رہے اور مجھے اپنے نرم نرم سینے سے لگا کر بھینچتی رہے۔ مگر وہ اب مجھ سے زیادہ منظوم پنجابی داستانوں کے کرداروں س محبت کرنے لگی تھی ان کرداروں میں اسے ہیر اور مرزا پسند تھے اور مجھے رانجھا اور صاحباں۔۔۔ اس اختلاف پر کئی بار ہمارا جھگڑا ہو جاتا اور ہم کئی کئی روز تک ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔

خالہ کی آواز بری اچھی تھی وہ اکثر ہر وارث شاہ کے بند گنگنایا کرتی

’’میرے میکے کی گلیوں کو ہاتھ جوڑ کر میرا سلام کہنا اور ترنجن میں جا کر میری سکھیوں کو میرا پیغام دینا کہ وہ مجھے دشمنوں کے حوالے کر کے بھول گئی ہیں۔ میاں رانجھا کے پاؤں پکڑ کر اور میری طرف سے ہاتھ جوڑ کر کہنا کہ خدا کی رحمت سے مایوس سے نہ ہو وہ بے آسروں کا آسرا ہے میرے ماں باپ سے کچھ بھی نہ کہنا انہوں نے مجھے گھمن گھیر میں غرق کیا ہے ان سے اب میرا کوئی ناطہ نہیں ہے۔‘‘

خالہ جب مجھے ہیر پڑھ کر سناتی تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ میری بجائے اپنے آپ کو سنا رہی ہو۔ ہیر پڑھنے پر اُسے کئی بار ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی۔ اڑوس پڑوس میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں گاؤں میں عورتوں اور لڑکیوں کے لئے ہیر وارث شاہ پڑھنا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن مجھے اور خالہ کو اس میں کوئی برائی نظر نہ آتی تھی۔

کبھی کبھی خالہ کسی لفظ پر اٹک جاتی تو مجھے بڑی خوشی ہوتی میں چونکہ سکول میں پڑھتا تھا اس لئے ہجے کر کے لفظ پڑھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لفظ جتنا مشکل ہوتا وہ اتنا ہی زیادہ پیار کرتی میرا جی چاہتا اُسے ایک بھی لفظ پڑھنا نہ آئے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتا۔ اللہ کرے وہ اندھی ہو جائے میں اُسے کتاب کے سارے لفظ پڑھ پڑھ کر سناتا رہوں ا اور ہر لفظ پر۔۔۔ مگر خیر یہ بچپن کی باتیں ہیں۔

پھر مجھے تعلیم کے سلسلے میں شہر بھیج دیا گیا اور میں خالہ سے جدا ہو گیا۔ میں شہر میں جب بھی کسی حسین عورت کو دیکھتا مجھے خالہ یاد آ اجتی اور میں دل ہی دل کا خالہ سے موازنہ کرنے لگتا۔ شہر میں قدم قدم پر حسین عورتیں تھیں لیکن میں نے خالہ سے بڑھ کر کسی کو نہ پایا۔ لمبی لمبی کاروں میں حسین اور امر عورتوں

کو دیکھ کر مجھے رشک آتا کاش خالہ بھی ایسی ہی کسی لمبی چمکیلی کار میں بیٹھی ہو اور اس کا دولت مند میاں اس کی ہر ادا اور فرمائش پر آنکھیں بچھا رہا ہو۔

خالہ سے اب میری ملاقات بڑے وقفوں سے ہوتی تھی۔

لیکن میں جب بھی گاؤں جاتا زیادہ تر وقت اس کے گھر میں گزارتا۔ اکثر ہمارے گھروں کے تعلقات خوشگوار نہ ہوتے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بند ہوتا لیکن ہم پر اس کا کچھ اثر نہ پڑتا۔ خالہ کے گھر والے مجھ سے بات نہ بھی کرتے تو بھی خالہ سے مل کر ساری کوفت دور ہو جاتی ہے۔ وہ مجھے طرح طرح کی چیزیں اور پکوان کھلاتی اور ہم پہروں باتیں کرتے رہتے۔ گاؤں کے باتیں، شہر کی باتیں، فلموں کی باتیں جو میں شہر میں دیکھتا تھا اور کتابوں کی باتیں جو ہم دونوں ایک دوسرے کو پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

خالہ اب مجھ سے اور بڑی ہو چکی تھی۔

کبھی کبھی مجھے وہ ایک بڑی عورت نظر آتی اور مجھے اس سے جھجک محسوس ہونے لگتی لیکن ایک بار جب ہم باتیں شروع کر دیتے تو ساری اجنبیت اور جھجک خود بخود دور ہو جاتی۔ خالہ اب بے قرار ہو کر مجھے لپٹاتی اور چومتی نہیں تھی اور شاید میں بھی اب اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

ایک بار گرمیوں کی چھٹیاں تھیں جو کسی طرح ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ گھر والوں نے مجھے خالہ کے ہاں جانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ میں نے پہلے پہل اس کی پرواہ نہ کی مگر پھر سخت ڈانٹ ڈپٹ ہوئی اور والدہ نے مجھے ب اور کرانے کی کوشش کہ دشمن کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا کیا پتہ وہ لوگ مجھے زہر دے کر ہلاک کر ڈالیں اور دشمنی کا بدلہ چکائیں۔میں دل ہی دل میں ہنسا، خالہ کے ہوتے ہوئے مجھے اس کا گھر میں زہر کیسے دیا جا سکتا تھا۔ میرے لئے ایسا سوچنا بھی ممانعت تھی لیکن پھر والدہ کے بار بار کہنے سے شک نے میرے دل کے کسی گوشے میں ڈیرہ جما لیا کہ خالہ کے ہاں بہت کم جاؤں گا اور ان کے ہاں سے کھانے پینے کی کوئی چیز تو بالکل نہیں لوں گا۔

دو ایک روز بعد مجھے چلے جانا تھا اور میں خالہ سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے ایک سہ پہر میں گھر والوں سے چوری اسے ملنے چلا گیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی طبیعت اچھی نہ تھی اور وہ سر کو دوپٹے سے باندھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی مجھے دیکھ کر کھل اُٹھی او حسبِ عادت مسکرا کر بولی

’’بسم اللہ‘‘

میں پائنتی کی طرف بیٹھ گیا وہ کہنے لگی

’’تو نے اچھا کیا جو چلا۔۔ میرا بڑا ہی دل چاہ رہا تھا کہ تجھے دیکھوں۔ کل سے میری طبیعت ٹھیک نہیں اور تو مجھے بہت یاد آ رہا تھا۔‘‘

مجھے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی میں اُٹھ کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور اس کیا سر دبانے لگا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہنے لگی:

’’سنا ہے تیری چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے ہاں تو مجھے شہر جا کر خط لکھ بھیجا کر۔۔مگر اڑیا۔ آسان لکھنا تو اب بہت پڑھ گیا ہے نا‘‘

’’تو جواب دے گی تو لکھوں گا‘‘

وہ ہنس پڑی بولی ’’مجھے لکھنا کہاں آتا ہے‘‘

’’کسی سے لکھوا لینا‘‘

’’نہ بابا‘‘۔۔ اس نے کہا ’’لوگ سمجھیں گے پتہ نہیں کسے خط لکھوا رہی ہے‘‘

پھر خالہ میرے منع کرنے کے باوجود میرے لئے دودھ گرم کر لائی، میرا ما تھا ٹھنکا اس نے دودھ میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔

میرے لئے اب نہایت مشکل صورت حال تھی جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں گا خالہ کا رویہ دیکھ کر انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ میں اس کے بارے میں ایسا سوچ رہا ہوں تو صدمے کی تاب نہ لا کر وہ خود ضرور زہر پھانک لیتی۔

پھر اس خیال سے کہ مجھے خون کی قے کرتے دیکھ کر وہ خود ہی پیشمان ہو گی اور زندگی بھر اپنے اس فعل پر سینہ کوبی کرتی رہے گی میں نے دودھ کا گلاس منہ سے لگایا اور غٹا غٹ پی گیا۔۔ اور منہ اور نتھنوں سے خون جاری ہونے کا انتظار کرنے لگا ساتھ ہی اتنی جلدی دنیا سے رخصت ہو جانے کی خیال سے میری آنکھوں آنسو آ گئے۔

اس نے گھبرا کر پوچھا ’’میں واری۔۔ کیا بات ہے؟‘‘

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا۔۔ ’’امی نے کہا تھا تم لوگ مجھے زہر دے دو گے وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ دیر پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی

’’ اور یہ جانتے ہوئے بھی تو نے دودھ پی لیا؟‘‘

’’ اور کیا کرتا؟‘‘

’’ہائے میں مر جاؤں ‘‘ اس نے کہا ’’تجھے مجھ پر اتنا اعتبار ہے؟‘‘

مجھے ایسا لگا جیسے میں بے حد کمینہ ہوں اگر خالہ کو پتہ چل جائے کہ میں نے اس پر شک کیا تو؟ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی

''دیکھ اڑیا۔۔ تو ایسا کبھی نہ سوچنا۔ تجھے زہر دیتے سے پہلے میں خود سو بار زہر نہ پھانک لوں گی''

''زہر تو ایک ہی بار میں مار ڈالتا ہے پھر تو سو بار کیسے پھانکے گی؟''

''اچھا گولی مار زہر کو'' وہ بولی ''کوئی اور بات کر''

مجھے پھر ہنسی آ گئی ''زہر کو گولی کیسے ماری جا سکتی ہے؟''

اس نے میرا ما تھا چوما اور کان مروڑ کر کہا ''تو بہت شریر ہو گیا ہے''

میرا جی چاہتا تھا ہنستا رہوں۔ ہنستا ہی چلا جاؤں۔ ہنسی اور خوشی سے میرا سارا اندر بھر گیا تھا کئی برس بعد اس کے خوبصورت ہونٹ میری پیشانی سے چھوئے تھے دنیا بھر کی لذت اور خوشی ایک لمحے میں قید ہو گئی تھی لیکن پھر خالہ سے اکبرے ماچھی والی بات سن کر میری ساری ہنسی اور خوشی کا فور ہو گئی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ ایک کسان کی بیٹی ہو کر ایک کمی سے بیاہ کیسے کرے گی اور اگر بیاہ نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟ مجھے اس پر بڑا غصہ آیا اور میرا جی چاہا اُسے چوٹی سے پکڑ کر صحن گھسیٹوں مگر اس کی چوٹی دیکھ کر میرا سارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا ور میں سوچنے لگا کہ وہ اتنی بھاری اور لمبی چوٹی کیسے اُٹھائے پھرتی تھی۔

جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا خالہ نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اس ے اپنے ہاتھ سے لڈو بنائے اور اپنی سہیلیوں کو اور مجھے خوب خوب کھلائے۔ اتفاق سے ان دنوں ہما تعلقات بھی خوشگوار تھے لیکن مجھے اس بات کا بے حد رنج تھا کہ گاؤں میں اب اس کے اور اکبرے ماچھی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ باتیں سن سن کر میرا د اس کی طرف سے کھٹا ہو گیا تھا ور مجھے اس کی کوئی بات اچھی نہ لگتی تھی لیکن میں اے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اس کا سامنا کرنے سے کیوں گھبراتا اس کا مجھے خود بھی پتہ نہیں تھا۔

پھر میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور زیادہ تر ہوسٹل میں رہنے لگا۔

جب کبھی گاؤں جاتا اور میرے ہم عمر مجھ سے کہتے کہ یار اعظم تیری خالہ نے بڑا گند ڈالا ہوا ہے تو شرم سے میری گردن جھک جاتی اور مجھے خالہ پر غصہ آنے لگتا۔ اس لئے میں بے اب گاؤں جانا کم کر دیا تھا اور دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔

ایک ایک کر کے کئی برس گزر گئے

میں نے تعلیم مکمل کر کے ملازمت کر لی اور میری شادی شہر میں ہو گئی۔

اب میں شہر میں رہتا تھا اور کبھی کبھار گاؤں جاتا تھا۔ تاہم بہت سے لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور مجھے ہر طرح کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ گاؤں والے باتیں بنا بنا کر تھک گئے تھے خالہ اور اکبرے ماچھی کی بات اب عام سی ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی گاؤں والے اچانک بھڑک اُٹھتے تھے۔ مولوی صاحب گاؤں پر عذاب الہٰی نازل ہونے اور قربِ قیامت کی پیش گوئیاں دہرا دہرا کر تھک چکے تھے لیکن خالہ سے براہِ راست الجھنے کا کسی کو حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ اپنے والد کے مرنے کے بعد وہ اور سرکش ہو گئی تھی اور خوب کھری کھری سناتی تھی۔ خالہ کی طرح اکبرے کو ٹوکنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی سب جانتے تھے کہ وہ ہر وقت ڈبّ میں پستول رکھتا تھا اور ا سے کسی بھی قسم کے اقدام کی توقع کی جا سکتی تھی۔

خالہ اب وہ خالہ نہیں رہی تھی جو کبھی گاؤں والوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی تھی اور جسے دیکھ کر جوانوں کا ایمان ڈول جاتا تھا اور جسے بیٹی یا بہن کہہ کر پکارنے والوں کے لہجے میں بھی عجیب طرح کی مٹھاس ہوتی تھی سخت جسمانی محنت کی وجہ سے اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا اور رنگت تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ گھر بار کے کام کاج کے علاوہ کھیتوں میں بھی مردوں کی طرح کام کرتی تھی اکبرے کے سوا پورے گاؤں میں اس کا ہاتھ بٹانے والو کوئی نہیں تھا یہ درست ہے کہ اکبر کبھی اس کے گھر نہیں آتا تھا لیکن سارا گاؤں جانتا تھا کہ وہ باہر ہیر رانجھا کی طرح ملتے تھے اور خالہ اس کے لئے دو وقت کھیتوں پر روٹی لے کر جاتی تھی۔ اُسے دیکھ کر اس پر ترس ضرور آتا تھا لیکن یہ سوچ کر ان حالات کی وہ خود ذمہ در ہے غصہ آنے لگتا تھا۔

لیکن اب حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میرا گاؤں جانا اور اس سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا پروگرام کے مطابق میں اتوار کے روز گاؤں پہنچ گیا۔

رات کا کھانا کھا کر اور والدہ سے اجازت لے کر میں ا س کے گھر کی طرف روانہ ہوا

اس کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنی باتوں شہد میں مجھے ڈبو دے میں ایک ہی سانس میں اپنی بات کا سارا زہر اُنڈیل دوں گا اور اسے کھری کھری سناؤں گا۔

کئی لمحوں یا شاید صدیوں بعد میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولے بغیر اس نے دستک پہچان کر اور چہک کر کہا

’’بسم اللہ‘‘

اس کی آواز سے اس کا گھر ہی نہیں گلی بھی روشن ہو گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی بوڑھی اور نا بینا ماں کے پاس لے گئی اور بولی

’’دیکھ ماں۔۔ اعظم آیا ہے‘‘

میں نے سلام کیا۔اس کی ماں نے دعا دی۔ خالہ لپک کر کرسی اٹھا لائی۔ میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے سامنے تپائی لا رکھی اس پر ہاتھ سے بنا ہوا رد مال بچھایا۔ لالٹین کی لو اونچی کی اور کہنے لگی

’’میں بھی کہوں۔۔ یہ سارا دن کوا کیوں بولتا رہا ہے۔مجھے کیا پتہ تھا کہ تو آنے والا ہے‘‘

’’میں سہہ پہر کو آ گیا تھا ملنے ملانے اور کھانا کھانے میں دیر ہو گئی‘‘

’’ہائے مجھے کیا پتہ تھا کہ تو آیا ہوا ہے اگر مجھے پتہ چل جاتا تو میں نائیوں کے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر تجھے ایک نظر دیکھ آتی‘‘

اس نے لالٹین میرے قریب رکھ دی پھر بولی

’’اب تو بڑا آدمی ہو گیا ہے نا۔۔ مگر اڑیا۔۔ فکر نہ کر۔۔ میں تجھے پیالے میں چائے نہیں دوں گی میں نے تیرے لئے چائے کا سیٹ خرید لیا ہے اور کئی مہینوں سے چائے کا بن ڈبہ منگا کر رکھا ہوا ہے مجھے پتہ تھا تو ضرور آئے گا۔‘‘

وہ مجھے بٹھا کر چائے بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ گھر کے حالات اور خیریت پوچھتی رہی بات بات پر خوش ہو کر کہتی

’’میں تو ہر وقت دعا مانگی رہتی ہوں اللہ تجھے اس سے بڑا عہدہ دے میرا دل تو ہر وقت تیری یاد میں جلتا رہتا ہے پتہ نہیں تو نے بھی کبھی مجھے یاد کیا ہے کہ نہیں۔۔ اڑیا۔۔ تو نے تو آج تک مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی نہیں دی۔ آپا ہم سے ناراض رہتی ہیں پر تو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔‘‘

میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی بات کرنے کے قابل نہ چھوڑے مجھے اپنی بات شروع کر دینی چاہئے میں نے کہا

’’میں تجھے یاد تو کرتا ہوں لیکن یہ یاد بڑی تلخ ہوتی ہے مجھے تمہارے حالات سن کر ندامت ہوتی ہے‘‘

وہ چپ ہو گئی اس کی بجائے اس کی والدہ نے جواب دیا:

’’پتر۔۔ تو ٹھیک کہتا ہے۔۔ تو سیانا ہے تو ہی اسے سمجھا۔۔ اس نے ہمارا دین اور دنیا دونوں خراب کر دئیے ہیں کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے بھی موت آ جاتی‘‘

’’ماں جی‘‘ میں نے کہا ’’میں اسی مقصد سے آیا ہوں گاؤں والے آپ لوگوں کا حقہ پانی۔۔‘‘

خالہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غراتی ہوئی میرے قریب آئی اور چیخنے کے سے انداز میں بولی

’’گاؤں والوں کو چھوڑ۔۔ تو اپنی کہہ‘‘

میں سہم گیا

وہ بولی ’’میں سمجھتی تھی تو پڑھا لکھا ہے انصاف کی بات کرے گا مگر تو بھی۔۔‘‘

اس کی آواز بھرا گئی آنسو پیتے ہوئے بولی

’’اس اجڑے گاؤں میں کیا کچھ نہ ہوا۔ یتیموں کی زمین لوگوں نے اپنے نام لگوا لی۔ قاتل دندناتے پھرتے رہتے اور بے گناہ سولی چڑھ چڑھ گئے۔ چوریاں، ڈاکے، شراب، جوا، اغوا۔۔ مگر ایک ہمارا نکاح نہ ہوا۔ ہم نے والدین اور گاؤں والوں کی منتیں کیں۔ سائیں چپ شاہ کے مزار پر چراغ جلائے۔ مولوی صاحب کے پاؤں پکڑے مگر انہوں نے کہا پنچائت نہیں مانتی۔۔ کیونکہ اس سے نئی رسم پڑنے کا ڈر ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیا تو نے بھی یہی کچھ پڑھا ہے؟‘‘

وہ بلند آواز میں رونے لگی

روتے روتے بولی سوچتی تھی ایک دن تجھے خیال آئے گا۔ تو آئے گا اور انصاف کرے گا مگر اجمیری تمام امیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔ میرا سارا مان ٹوٹ گیا ہے‘‘

وہ ہچکیاں لینے لگی

مجھے یوں لگا جیسے میرے اور اس کے درمیان کھڑی ان دیکھے خوف کی دیوار بھی ہچکیاں لینے لگی ہے۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر کو چھپائے دیر تک روتی رہی لگتا تھا اب کبھی چپ نہیں ہو گی۔

کسی انجانے خوف سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے اور دل و دماغ میں پٹاخے سے چلنے لگے پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ دیوار جس سے لپٹ کر وہ برسوں سے گریہ کر رہی ہے اس کے آنسوؤں سے آہستہ آہستہ کھرنے لگی ہے۔

***

دھُوپ، دھُوپ، دھُوپ

ایک رات اس کا باپ دیر تک گھر نہ لوٹا۔ مگر پھر بستی کے سب سے اونچے مکان کی چھت سے اس کی آواز سنائی دی وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

’’لوگو۔۔۔۔۔۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بستی وقت سے پیچھے نہ رہ جائے تو انصاف قائم کرو۔۔۔ انصاف ہی نیکی اور راست بازی ہے اور تم ظلم اور نا انصافی کرنے والے ہاتھوں کو پہچانو اور انہیں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہ دو ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں سے ہو گا۔‘‘

اس کا باپ گھر لوٹا اور اطمینان سے سو گیا۔

خلافِ معمول ہوا چل رہی تھی اسے بھی نیند آ گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی صبح کاذب کا وقت تھا۔۔۔۔ ہوا بند تھی اور اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اس کے باپ کا سراس کی گردن سے الگ پڑا ہوا تھا۔

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں مگر کسی نے اس کے گھر میں جھانک کر نہ دیکھا۔ اس نے بقایا رات روتے اور بین کرتے گزاری۔

اس کا خیال تھا کہ آج صبح نہیں ہو گی مگر وہ حیران ہوا۔ مرغ نے اسی طرح اذان دی جیسے ہر روز دیتا تھا اسی طرح پو پھٹی اور صبح ہوئی اور ہر روز کی طرح چڑیاں چہچہائیں، کوے منڈیروں پر آ بیٹھے اور مشرقی افق پر شفق نمودار ہوئی۔

اس کا خیال تھا کہ آج اسے بھوک نہیں ستائے گی اور پیاس نہیں لگے گی مگر اسے دہی کتا بھوک لگی اور پیاس نے ستایا۔ اس نے روٹی کے ٹکڑے کے لئے پاؤں چاٹتے کتے کو بار بار دھتکارا مگر وہ تھوڑی دور جا کر پلٹ آتا اور دم ہلانے اور پاؤں چاٹنے لگتا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ دن عام دنوں جیسا نہیں تھا مگر اسے سب کچھ معمول کے مطابق نظر آیا سوائے اس کے کہ جب دھوپ نکلی تو وہ غیر معمولی تیز اور سرخ تھی اتنی سرخ کہ ساری چیزیں لہو لہان معلوم ہوتی تھیں اس نے آسمان کی طرف دیکھا آسمان پر سرخ رنگ کی چمکیلی دھند چھائی ہوئی تھی اور سورج کسی خونخوار درندے کی طرح جبڑوں سے لگا خون چاٹتا چھسٹتا چلا آتا تھا۔

اس کا اندازہ تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ جوق در جوق اس سے تعزیت کرنے آئیں گے۔ اس کے باپ کی بے وقت اور درد ناک موت پر اظہار افسوس کریں گے اور اسے صبر کرنے کی تلقین کریں گے۔ مگر وہ یہ جان کر حیران ہوا کہ کسی نے بھول کر بھی اس کی خبر نہ ملی۔

اس کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ گذشتہ رات کے انتباہ کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھے سہے ہوئے بیٹھے رہیں گے اور اس وقت تک انہیں کوئی آہٹ نہیں چونکا سکے گی جب تک انہیں انصاف اور نیکی کا یقین نہ دلا دیا جائے مگر جب منشیوں، فورمینوں اور ٹائم کیپروں نے حاضر یوں کے رجسٹر کھولے اور ان کے نام پکارے تو ہر طرف سے حاضر جناب کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور اسے محسوس ہوا کہ وہ بستی میں اکیلا رہ گیا ہے۔

وہ بے حد پریشان ہوا وہ اکیلا کیا کرے کفن دفن کا انتظام کیسے کرے کسی کا میت کے پاس رہنا ضروری تھا اور ابھی بہت سے کام تھے قبر کھدوانی تھی کفن خریدنا اور سلانا تھا۔ میت کو غسل دینا اور جنازہ پڑھنا تھا اور جنازہ اٹھانے کے لئے کم از کم چار آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر وہ سب کام پر چلے گئے تھے پوری بستی مردوں سے خالی پڑی تھی اور عورتیں اور بچے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سہ پہر تک ان کی واپسی کا انتظار کرے اس کے سینے میں جتنی آہیں اور آنکھوں میں جتنے آنسو تھے وہ نچھاور کر چکے تھا اور اب خالی ذہن لئے میت کے پاس بیٹھا تھا، بیٹھے اچانک اسے خیال آیا کہ اگر وہ واپسی پر بھی اس کی مدد کو نہ آئے تو؟۔۔۔۔۔۔ کیوں نہ وہ بھی کام پر چلا جائے پوری دیہاڑی میت کے پاس بیٹھ کر ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ اور اب تو اسے پیسوں کی اور بھی زیادہ ضرورت تھی۔ اس طرح واپسی پر وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لیتا آئے گا اور سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے کفن دفن کا انتظام ہو جائے گا۔

جونہی اس نے کام کے بارے میں سوچا منشی کی آواز اسے گھر بیٹھے سنائی دینے لگی اور کوئی اس کے اندر حاضر جناب۔ حاضر جناب پکارنے لگا۔

اسے پتہ ہی نہ چلا کب اس نے مرے ہوئے باپ کی چارپائی گھسیٹ کر اندر کی، کب جوتا پہنا اور کب کام پر حاضر ہو گیا۔

منشی نے اسے دیکھتے ہی قہقہہ لگایا پھر ڈانٹ پلائی اور بولا

’’آج پھر ماتم ہو گیا؟‘‘

’’ہاں جی‘‘

’’یقیناً آج پھر تمہارا باپ قتل ہو گیا ہو گا‘‘

’’ہاں جی‘‘

’’رات اس نے پھروہی کیا ہو گا؟‘‘

’’ہاں جی‘‘

’’اچھا یہ بتاؤ---- قاتل کا کچھ پتہ چلا؟‘‘

’’نہیں جی‘‘

’’تمہیں کسی پر شک ہے؟‘‘

’’ہاں----- میرا خیال ہے اس نے خود ہی اپنے آپ کو قتل کر دیا۔‘‘

’’بیوقوف‘‘ منشی نے ہنستے ہوئے کہا ’’اسے خودکشی کہتے ہیں ‘‘

’’خود کشی نہیں جی---- قتل‘‘

’’اچھا اچھا---- قتل ہی سہی---- یہ بتاؤ کہ آج بھی اسے دفن کر کے آئے ہو یا نہیں ؟‘‘

’’نہیں جی‘‘

’’چلو شام کو دفنا لینا---- تم اچھا کرتے ہو دیہاڑی ضائع نہیں کرتے میں تمہاری حاضری لگا دیتا ہوں مگر پھر لیٹ نہ آنا آئندہ محتاط رہنا‘‘

’’جی میرا ایک ہی باپ تھا‘‘

’’بیوقوف‘‘ منشی کو بے طرح ہنسی آ گئی کہنے لگا ’’باپ تو ایک ہی ہوتا ہے‘‘ پھر ہنسی روک کر بولا لیکن نہیں---- شاید تم ٹھیک کہتے ہو ایک سے زیادہ باپ بھی ہو سکتے ہیں اچھا تم کام کرو لیکن یاد رکھو تمہیں چھٹی کے بعد کام کر کے لیٹ آنے کی کمی پوری کرنا ہو گی‘‘

’’اچھا جی‘‘

کام کرتے کرتے ہر روز کی طرح دوپہر ہو گئی لو چلنے لگی اور آسمان سے آگ سی برسنے لگی اس نے آسمان کی طرف دیکھا آسمان اب بھی سرخ تھا اور دھوپ غیر معمولی تیز تھی راج مچان پر بیٹھے اینٹوں سے چنائی کر رہے تھے وہ مچان پر کھڑے اپنے ساتھی کی طرف اینٹیں پھینکنے لگا جو انہیں پکڑ پکڑ کر مچان پر راجوں

کے استعمال کے لئے جمع کرتا جاتا۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی اور وہ تازہ دم تھا اینٹیں پکڑنے کے لئے ایک کی بجائے دو آدمیوں کو مچان پر کھڑے ہونا پڑا۔

سورج اب عین سر پر آ گیا تھا سر پر آ گیا تھا اب کھانے کی چھٹی ہو جانی چاہئے تھی مگر ٹھیکیدار کے منشیوں نے شاید آج بھی اپنی گھڑیاں وقت سے پیچھے کی ہوئی تھیں آج بھی بارہ بجنے کے باوجود بارہ نہیں بج رہے تھے دوپہر ہو گئی تھی مگر اس کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا کتنی دلچسپ بات ہے کہ اعلان نہ ہو تو خواہ سورج سر پر آ جائے دوپہر نہیں ہو سکتی اور گھڑیاں پیچھے کر لی جائیں تو وقت رک جاتا ہے۔ اسے اپنے باپ کی باتیں بے معنی معلوم ہونے لگیں۔

’’اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بستی وقت سے پیچھے نہ رہ جائے تو انصاف قائم کرو‘‘

پھر اسے یاد آیا کہ دیہاڑی پوری کرنے کے بعد اسے گھر پہنچنا اور کفن دفن کا انتظام کرنا ہے اس کے باپ کی اکیلی میت گھر میں پڑی ہے اسے افسوس ہونے لگا اسے باپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آنا چاہئے تھا مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے اس نے خود ہی سوچا۔۔۔۔ آدمی زیادہ سے زیادہ مر سکتا یا قتل ہو سکتا ہے اس کے بعد کوئی اس کا کیا بگاڑی سکتا ہے؟

اور شاید ابھی وقفے کا اعلان نہ ہوتا اگر اینٹیں ختم نہ ہو جائیں اس نے روٹی کی خوشبو سونگھ کر پاؤں چاٹنے والے کتے کو ایک بار پھر دھتکارا مگر وہ دم ہلانے اور اس کے پاؤں چاٹنے لگا اسے دل ہی دل میں ندامت ہو رہی تھی کہ اسے آج بھی بھوک لگی ہے آج۔۔۔۔جب اس کا باپ قتل ہو گیا ہے اور ابھی اس کی لاش بے گور و کفن گھر میں پڑی ہے۔ اس نے دوسروں سے نظر بچا کر قریبی کنٹین پر کھانا کھایا کھانا ختم ہو گیا تھا مگر اس کی بھوک آج بھی ختم نہ ہوئی تھی اس نے ہر روز کی طرح پانی سے کھانے کی کمی پوری کی اور قریبی سائٹ آفس کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگ کر دوپہر ڈھلنے اور وسل بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ سایہ اب سمٹتے سمٹتے دیوار کے ساتھ آ لگا تھا اس نے ٹانگیں اور سمیٹ لیں مگر تھوڑی ہی دیر میں دھوپ اور پھیل گئی اب دھوپ اور دیوار کے درمیان اس کے لئے گنجائش نہیں تھی وہ کہیں سایہ تلاش کرنا چاہتا تھا مگر اسی لمحے اینٹوں سے بھرے ہوئے بہت سے ٹرکوں کا شور سنائی دیا اور ساتھ ہی وقفہ ختم ہونے کی وسل سنائی دی شاید انہوں نے اپنی گھڑیاں آگے کر لی تھیں یا وہ خود بخود وقت سے آگے نکل گئی تھیں۔

دوبارہ کام پر آتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا آسمان دھوپ سے بھرا ہوا تھا سورج کسی آتش فشاں کی طرح مسلسل آگ اگل رہا تھا اور شکر دوپہر سروں پر تنی ہوئی تھی لو کے تھپیڑے اپنی پیاسی زبانوں سے حسن اور ہر بالی چاٹ رہے تھے اور ہر طرف دھوپ کے لہرئیے سانپوں کی بارش ہو رہی تھی۔ وہ سب بے سایہ دیواروں کی اوٹ سے نکل کر کام پر واپس آ گئے تھے سب کہ چہرے جھلسے ہوئے اور جسم نڈھال تھے۔ روٹی کھانے اور پانی پینے کے باوجود تازگی کا کوئی پھول ان

کے چہروں پر نہیں کھلا تھا اسے ان پر ترس آنے لگا۔ روٹی کھانے اور پانی پینے کے بعد وہ خود تازہ دم ہو گیا تھا حالانکہ آج اس کا باپ قتل ہو گیا تھا اور اسے اس کی بے وقت اور درد ناک موت کا صدمہ تھا۔

دیوار اب پہلے کی نسبت بلند ہو گئی تھی مگر اس کی اوپر پھینکی ہوئی اینٹیں پکڑنے اور انہیں راجوں کے قریب رکھنے کے لئے اب بھی دو آدمی مچان پر کھڑے تھے۔ مسلسل اینٹیں پھینکتے پھینکتے اس کے بازو شل ہو گئے اور کمر دکھنے لگی تو مچان سے ایک آدمی نیچے اتر آیا اور میٹ کے کہنے پر کدال لے کر مٹی کھودنے لگا۔

کام کرتے کرتے اس نے وقت کا اندازہ لگانے کے لئے قدموں میں سائے کو تلاش کرنا چاہا تو وہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سایہ کہیں نہیں تھا اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اوپر دیکھا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا اتنی دیر بعد بھی سورج کی ٹکیا ایک ہی جگہ پر عین سر کے اوپر ٹھہری ہوئی تھی اور ڈھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی شاید اسکا باپ ٹھیک ہی کہتا تھا اس نے سوچا وقت رک گیا تھا مگر کیوں ؟

اب وہ بہت تھک گیا تھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ مچان بھی اور اونچی ہو گئی تھی وہ اینٹ اٹھا کر مچان کی طرف پھینکتا تو وہ واپس آ جاتی اور اسے اپنا سر بچانا مشکل ہو جاتا مچان پر کھڑے ہوئے آدمی کا قہقہہ سنائی دیتا اور وہ دوسری اینٹ پھینکنے کے لئے پورا زور لگاتا۔

دوپہر ڈھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی مگر منشیوں نے سب کو پوری یا نصف دیہاڑی کی اجرت دے کر رخصت کر دیا تھا اب وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ صبح دیر سے کام پر آیا تھا اور ابھی تو اس کی نصف دیہاڑی بھی مکمل نہیں ہوئی تھی اسے مٹی کھودنے پر لگا دیا گیا۔

کام کرتے کرتے اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی اور حیران ہوا۔ مسلسل دھوپ اور شدید گرمی کی وجہ سے درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے اور وہ بے سایہ ہو گئے تھے چلچلاتی دھوپ دیواریں پھاند کر سائٹ آفس، سٹور اور زیر تعمیر عمارت کے اندر گھسنے لگی تھی۔ اسے اپنے باپ کی میت کا خیال آیا وہ آتی بار اس کی چار پائی گھسیٹ کر اندر کر آیا تھا لیکن کیا پتہ اس نے سوچا دھوپ برآمدے کی راہ کمرے میں گھس گئی ہو۔ مگر اسے کم از کم اپنی نصف دیہاڑی ضرور مکمل کر لینی چاہئے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔جب وہ کام کرتے کرتے نڈھال ہو گیا اور اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے تو منشی نے اسے آدمی دیہاڑی دے کر گھر جانے کی اجازت دے دی۔

وہ بستی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا بچے، جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کے بال دھوپ میں سفید ہو گئے تھے۔ گھروں کے اندر دھوپ گھس آئی تھی اور وہ گھبرا کر باہر آ گئے تھے مگر کہیں سایہ نہیں تھا شاید بستی وقت سے پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ لوگوں کو مدد کے لئے بلانے سے پہلے ایک نظر میت کو دیکھ لینا چاہتا تھا، وہ جلدی جلدی گھر پہنچا مگر یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ وہ چارپائی جس پر اس کے باپ کی لاش تھی خالی پڑی ہوئی تھی----- وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

***

دل کا بوجھ

مکان کی تعمیر کے لئے پلاٹ، روپیہ اور ارادے کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں اور لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً اینٹیں، سریا، لکڑی... قرض دینے والے با اثر احباب... اینٹیں، ریت اور بجری سپلائی کرنے والے ٹھیکیدار، راج، لوہار، ترکھان، پینٹر، پلمبر اور مزدور وغیرہ... لیکن مجھے بہت جلد پتہ چل گیا کہ سب سے اہم شخص ایک ایسا چوکیدار ہے جو کام کی نگرانی اور عمارت کی دیکھ بھال کر سکے دیانتداری اور فرض شناسی کے قحط کے اس دور میں گل باز خان کامل جانا میرے لئے خوش نصیبی کی بات تھی اس سے پہلے میں یکے بعد دیگرے تین چوکیداروں کو آزما چکا تھا۔ پہلا چوکیدار چند ہی روز میں مستریوں سے گھل مل گیا تھا اور سیمنٹ کی بھری ہوئی بوریوں کی جگہ خالی بوریوں کی تعداد ایک دم بڑھنے لگی تھی۔

دوسرا چوکیدار سیمنٹ نہیں بیچتا تھا۔ ریت اور بجری والے ٹھیکیدار سے مل گیا تھا اور ایک ٹرک ریت یا بجری کو دو جگہ اتارا اور گنا جاتا تھا۔ اس کا علم مجھے اس وقت ہو جب میں نے اس کی تصدیق پر ٹھیکیدار کو بل کی ادائیگی کی۔

تیسرا چوکیدار چوری نہیں کرتا تھا... کسی سے ملا ہوا بھی نہیں تھا۔پانچ وقت کا نمازی اور بے حد ایماندار تھا لیکن اسے چارپائی سے بڑی محبت تھی وہ چارپائی سے صرف نماز کے وقت تھوڑی دیر کے لئے نیچے اترتا تھا خوش اخلاق اور خدا ترس تھا اس لئے محلے کے لوگوں کو اینٹ، پتھر کڑاہی، بالٹی ریت یا چونے کسی چیز کی تکلیف نہیں ہونے دیتا تھا اور بسلسلہ خدمت خلق کچھ نہ کچھ خیرات کرتا رہتا تھا۔

گل باز خان کے آنے سے مجھے ایک نیا تجربہ ہوا۔ چوکیدار تو وہ تھا... دن بھر راج مستریوں کے ساتھ مزدور کا کام بھی کرتا۔ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے چوکیدار کے علاوہ مزدور کے طور پر کام کرنے کی دیہاڑیاں بھی لے گا لیکن جب میں نے اسے چھٹی کا وقت ہو جانے اور مستریوں کے چلے جانے کے بعد بھی کام کرتے دیکھا... تو میرا خدشہ جاتا رہا اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ فطرتاً ایک اچھا کارکن ہے۔ اس کے سامنے کام بھکرا ہو تو وہ ہر طرح کے حساب کتا ب سے بے نیاز ہو کر کام کرتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے راجوں اور ترکھانوں کے ساتھ کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد میں کم از کم دو آدمیوں کی کمی ہو گئی تھی۔ اگر وہ مجھ سے چوکیداری کے علاوہ وہ مزدوروں کی جگہ کام کرنے کی تنخواہ اور مانگ لیتا تو بھی... میرے خیال میں۔۔ یہ میرے ساتھ رعایت ہوتی لیکن وہ بے حد سیدھا سادہ

اور بھولا تھا۔ اسے تو اپنی چوکیداری کی تنخواہ اور دیہاڑیوں کا حساب بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں ہوتا تھے۔

وہ چترال کا رہنے والا اور اچھی طرح اردو بول اور سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ روپیہ کما کر اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے گھر سے اتنی دور آیا ہوا تھا مگر اسے پیسے کی ہوس نہیں تھی۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ روپے پیسے کو کنکر مٹی سمجھتا ہے میں اسے تنخواہ کی پوری رقم دیتے ہوئے کئی کئی بار نوٹ گنتا۔۔ وہ گنے بغیر جیب میں ڈال لیتا اور شکرئے کے طور پر دانت نکال کر سلام کرتا اور کام میں مصروف ہو جاتا۔

میں اکثر دل میں سوچتا تھا کہ جتنی رقم میں اسے ہر ماہ دیتا ہوں، اس سے دگنی رقم کا مقروض ہو جاتا ہوں اور حق و انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی ڈیوٹی سے زائد کام کرتا ہے میں بھی اسے مقررہ معاوضے سے زیادہ رقم ادا کروں لیکن میری یہ سوچ کبھی عملی جامہ نہ پہن سکی۔مکان کی تعمیر میں روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے۔ جتنے پیسے جیب میں ہوں۔ اس سے زیادہ پیسوں کی ضرورت رہتی ہے پھر بھی میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ مکان کی تعمیر مکمل ہونے پر زیادہ نہیں تو اس کو ایک ماہ کی زائد تنخواہ بونس یا انعام کے طور پر دونگا۔ سردیاں آ جائیں گی میں اسے نئے پڑے سلوا دوں گا اور لنڈے سے ایک آدھ اچھا سا کوٹ ا دوں گا اپنے پرانے جوتوں میں سے ایک آدھ جوڑا اسے دے دوں گا۔اس طرح شاید میرے دل کا یہ بوجھ کم ہو جائے کہ میں نے اس کی محنت کا پورا معاوضہ ادا نہیں کیا۔

مکان کی تعمیر میں کئی ماہ اور لگ گئے اس طرح میں گل باز کی مہربانیوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ ایک دفعہ میں نے صحن میں پڑا ہوا ملبہ اٹھانے کے لئے گدھوں والے سے اسی روپے میں ٹھیکہ طے کیا۔۔ لیکن گل باز خان نے اگلے روز گدھوں والے کو اندر نہیں گھسنے دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خود دو چار روز میں سارا ملبہ اٹھا کر باہر پھینک دے گا اسی طرح۔۔ رات کو وہ چھت پر ریت اور بجری کے ڈھیر لگا دیتا تاکہ اگلے روز چھت پر کام کرنے کے لئے راج کا وقت ضائع نہ ہو اور زائد مزدوروں کی ضرورت نہ پڑے۔

ایک مرتبہ لمبی سیڑھی کی ضرورت تھی اور اتنی لمبی سیڑھی کرائے پر بھی نہیں مل رہی تھی۔ گل باز خان پتہ نہیں کہاں سے ایک سیڑھی اٹھا لاتا۔ پوچھنے پر ہنسنے لگا۔پرہ چلا وہ جہاں سے سیڑھی مانگ لایا ہے وہاں اس نے بلا معاوضہ پھولوں کی کیاریاں بنا دینے کا عہد کیا ہے۔

راج ترکھان اور دوسرے کاریگر اس سے عاجز آ گئے تھے۔وہ ہر چیز کو خزانہ سمجھ کر اس پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہر وقت اس قسم کی شکایتیں ملتیں کہ اس نے پینٹر کو رنگ کا نیا ڈبہ نہیں کھولنے دیا۔۔ مسالہ ضائع کرنے پر راج سے الجھ پڑا ہے یا مالک کی پیشگی اجازت کے بغیر الیکٹریشن کو اس کے اوزار تک لے جانے سے روک دیا ہے۔

میر چھوٹی بچی کبھی کبھی اتوار کو میرے ساتھ چلی جاتی تو گل باز خان اسے دیکھ بہت خوش ہوتا اور منع کرنے کے باوجود اسے بسکٹ اور ٹافیاں لا دیتا جو خود اس نے شائد کبھی چکھ کر بھی نہ دیکھی تھیں اگر کسی اتوار کو وہ میرے ساتھ نہ جاتی تو وہ اس کی خیریت دریافت کرنا کبھی نہ بھولتا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے اس کے بچوں کے بارے مین پوچھوں لیکن پتہ کیسے ہر مرتبہ بات میرے ذہن سے اتر جاتی۔

مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہوتے پیسے کی بے حد کمی ہو گئی۔ میں جس قدر کفایت سے کام لینے کی کوشش کرتا اخراجات اسی قدر بڑھتے جاتے--- اور میں چاہتے ہوئے بھی گل باز خان کو بونس یا انعام کچھ بھی نہ دے سکا۔

پھر ہم کرائے کے مکان سے اٹھ کر اپنے نئے مکان میں آ گئے اور وہ کسی جھونپڑی میں منتقل ہو گیا۔ میں نے اسکی تنخواہ کی پائی پائی ادا کر دی لیکن میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا کہ میں ے اس کی محنت کا کم از کم دو تہائی حصہ غصب کر لیا ہے۔ اور اس طرح میں نے ایک روایتی بور ژوا ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک محنت کش کا استحصال کی اہے سردیاں آ گئی تھیں اور بچوں کی گرم یونیفارم اور سوئٹریں، بیوی کی شال اور اپنے نئے سوٹ پر بہت سے پیسے خرچ ہو گئے تھے اس لئے میں اسے کپڑے خرید، کر بھی نہ دے سکا۔ بیوی بچوں کے کپڑے خریدتے وقت بھی مجھے برابر اس کا خیال آتا رہا لیکن مہنگائی کا کیا کیا جائے، گنجائش نہ نکل سکی۔ تاہم میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ میرے پاس بہت سے پرانے کپڑے ایسے ہیں جن میں سے گل باز کے لئے بہت کجھ نکل آئے گا۔

گل باز خان رخصت ہونے لگا تو میں نے اپنی بیوی سے کہا وہ اسے میرے پرانے کپڑوں اور جوتوں میں سے کچھ نکال دے۔لیکن شفٹنگ اور نئے گھر میں سیٹنگ کی وجہ سے سارا سامان بکسوں اور صندوقوں میں تھا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ میں نے گل باز خان سے کہا کہ وہ اگلے اتار کو کسی وقت آئے کہ مجھے اس سے ایک ضروری کام ہے۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر اور حسب معمول ہنس کر سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ میں نے اس سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ اسے کہیں بھی ملا ہے؟--- لیکن اسے کام کی کیا کمی---- ایسے آدمی کی تو ہر جگہ اور ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

گل باز خان اتوار کو ہمارے ہاں آیا لیکن ہم اس روز اپنے ملنے والوں کے ہاں ان کی بچی کی سالگرہ کی تقریب میں گئے ہوئے تھے ورنہ اس روز میرے دل سے بوجھ کم ہو جاتا پھر بھی مجھے توقع تھی کہ وہ اگلے روز یا اگلے اتوار کو ضرور آئے گا۔ اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ وہ اگلے روز شام کو پھر آیا۔ لیکن اس وقت میری بیوی کی ایک عزیز سہیلی آئی ہوئی تھی اور وہ اس کی خاطر مدارات میں مصروف تھی۔

میں نے سوچا جہاں اتنے دن گزر گئے ہیں وہاں کچھ دن اور سہی۔ میں نے گل باز خان سے اتوار کو آنے کا وعدہ لیا۔ وہ حسب معمول ہنستے اور سلام کرتے ہوئے چلا گیا۔

میں نے اپنے کمرے میں آ کر ٹیبل ڈائری پر لکھ دیا کہ اتوار کو گل باز خان سے اپائنٹمنٹ ہے اور مجھے صبح اٹھتے ہی اس کے لئے چیزیں نکلوا کر رکھ دینا ہونگی۔

اتوار کی صبح کو میری آنکھ کھلی تو ریڈیو سیلون سے پرانی فلموں کے گیت نشر ہو رہے تھے میں نے بستر میں لیٹے لیٹے بیوی سے کو آواز دی اور گل باز خان کیلئے کپڑے نکالنے کو کہا، وہ سارے کام چھوڑ کر آ گئی اور صندوق کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔

کچھ ایسی بش شرٹیں تھیں جن کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے یا وہ سکڑ گئی تھیں۔ یہ گل باز خان کیلئے قطعی مناسب نہ تھیں۔ اس کے بھاری بھرکم جسم پر تو وہ بنیانیں معلوم ہوتیں کچھ پرانی گرم اور سرد پتلونیں تھیں مگر وہ شلوار پہنتا تھا، یہ بھی مناسب نہ تھیں۔ دو قمیضیں اچھی حالت میں تھیں لیکن ایک قمیض اگرچہ پرانی تھی پھر بھی گرے سوٹ کے ساتھ صرف وہی سجتی تھی۔ دوسری کا رنگ ہلکا ہو گیا تھا لیکن میری بیوی کے خیال میں پاجامے کے ساتھ کافی دنوں تک پہنی جا سکتی تھیں کہ میرے پاس صرف دو ہی نائیٹ سوٹ تھے۔

اس کے بعد کوٹوں کی باری آئی۔ نیلا چیک کوٹ میں نے پچھلے سال ہی پہننا چھوڑ دیا تھا لیکن میری بیوی کا خیال تھا کہ وہ اب بھی اوور کوٹ کے نیچے پہنا جا سکتا تھا۔ دوسرا ایک کوٹ بالکل فالتو تھا لیکن ہمیں یاد آیا کہ چھوٹے بھائی نے چند روز پہلے کوٹ کے کپڑے کے لئے رقم بھیجنے کا خط لکھا تھا۔ کفایت شعاری سے کام لیا جائے تو یہ کوٹ معمولی سے رد و بدل سے اس کے کام آ سکتا تھا اور نئے کوٹ کے کپڑے اور سلائی پر اٹھنے والی اچھی خاصی رقم بچائی جا سکتی تھی۔

جوتوں کی باری آئی تو اور بھی پریشانی ہوئی۔ کچھ جوڑے بالکل نئے تھے کسی تقریب میں پہننے کے لئے۔ دو ایک دفتر پہن کر جانے کے لئے یا پھر روزمرہ کے استعمال اور بارش میں پہن کر بازار وغیرہ جانے کے لئے دو ایک جوڑے تھے۔ ایک بھی تو فالتو جوتا نہ تھا اور جوتے اس قدر مہنگے ہو گئے تھے کہ سفید پوش طبقے کے لئے نیا جوتا خریدنا پورے مہینے کے بجٹ کو الٹ پلٹ کر دینے کے مترادف ہو گیا تھا۔

وہ تو اچھا ہوا کہ اس روز گل باز خان نہیں آیا۔ ورنہ مجھے بے حد شرمندگی اور پریشانی ہوتی اور ضمیر الگ ملامت کرتا رہتا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے مجھے اور مہلت مل گئی تھی میں نے سوچا جہاں مکان کے لئے اتنا خرچ کیا ہے وہاں سو پچاس اور سہی۔ اب کے وہ آئے گا تو میں اسے بازار لے جاؤں گا اور زیادہ نہیں تو چادر، شلوار اور قمیض کا کپڑا ضرور لے دونگا۔

جب اگلا اتوار بھی گزر گیا اور اس کے حصے کے پیسے جو میں نے الگ نکال کر رکھے ہوئے تھے خرچ ہونے لگے تو میں ایک روز اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے پہلی بار خیال آیا کہ میں نے اس سے کبھی یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں کام کرتا ہے پھر بھی میرا اندازہ تھا کہ شہر کے اس حصے میں جہاں کثرت سے نئے مکانات بن رہے ہیں وہ مجھے کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔

مجھے پہلی بار خیال آیا کہ میں نے اس سے کبھی یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں کام کرتا ہے پھر بھی میرا اندازہ تھا کہ شہر کے اس حصے میں جہاں کثرت سے نئے مکانات بن رہے ہی وہ مجھ کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔

میں دیر تک مختلف سڑکوں پر سکوٹر دوڑاتا اور اسے تلاش کرتا رہا لیکن اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

اور یہ اس سے اگلے روز کی بات ہے۔شام کے وقت میرے پاس اس کا ایک ساتھی آیا۔ وہ کچھ عرصہ اس کے ساتھ میرے ہاں کام کر چکا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا لفافہ میری طرف بڑھایا اور بولا ’’بابو صاحب۔۔ گل باز خان کا بیوی بیمار ہو گیا وہ جلتی جلتی وطن گیا، وہ بولتا تھا ہم کو چھوٹا بچی بہت اچھا لگتا۔ ہم اس کے واسطے توفہ بناتی۔بیگم صاحب اور صاحب کو سلام بولتی‘‘۔

میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک خوبصورت ریشمی فراک تھا۔

***

دنیا کا آخری بھوکا آدمی

ایسا ہوتا ہے۔

ایسا ہو جاتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آیا اور آپ نے سوچے سمجھے بغیر اپنے دفاع کے لئے اندر کے خسیس اور کمینہ خصلت منشی کو پکارنا شروع کر دیا اور جب منشی اور مہمان رخصت ہوئے آپ کو یاد آنے لگا کہ ضرورت مند شخص سے آپ کے کتنے دیرینہ یا گہرے تعلقات تھے۔ آپ پر اس کے کتنے احسانات تھے یا اس کی ضرورت کتنی جائز اور اہم تھی۔ اب آپ چاہتے ہیں اس کی تلافی ہو جائے مگر نہیں ہو پاتی کہ اس نے کسی اور ذریعے سے اپنی مشکل پر قابو پا لیا ہے اور آپ اب کف افسوس ملنے کے لئے رہ گئے ہیں۔

بس کچھ ایسا ہی ہوا۔

ہم ایک پر تکلف دعوت سے لوٹ رہے تھے، رات کے نو سوا نو بج رہے تھے۔ بازار میں زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ مگر بیکریوں، پان سگریٹ کے کھوکھوں، کھانے پینے کے اسٹالوں اور اوپن ایئر ریستورانوں پر ابھی تک رونق تھی۔

مجھے جمائیاں آ رہی تھیں مگر وہ ابھی تک چوکس اور ترو تازہ تھی کیونکہ اس نے خوبصورت لباس اور قیمتی زیور پہن رکھا تھا۔

گنجائش تو نہیں تھی لیکن آج کل شہر کے اس فیشن ایبل علاقے میں رات کو کاروں میں بیٹھ کر کھانا پینا، کھاتے پیتے لوگوں کا دستور ہے۔ خود کو اس طبقے میں شامل سمجھنے کے لئے ہمیں بھی یہ دستور نبھانا پڑتا ہے۔ میں نے اس کے لئے آئس کریم اور اپنے لئے کولڈ ڈرنک منگایا۔ اب صرف پان کی گنجائش رہ گئی تھی۔ میں منگا بھی سکتا تھا مگر سوچا اسی بہانے ٹہل لوں گا۔ بیٹھے بیٹھے پیٹ میں ہوا بھر گئی تھی۔ میں پان لے کر لوٹا تو وہ تنکوں کی تین ٹوکریاں اٹھائے اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ منع کر رہی تھی اور وہ اصرار۔۔ میں نے کوئی دخل نہ دیا۔ ہوٹل کے لڑکے کو ٹپ دی اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔ وہ بولی۔

’’اسے کچھ دے دیں کہہ رہا ہے بھوکا ہوں۔‘‘

’’کوئی بھوکا ووکا نہیں ہوتا۔‘‘ میں نے ریورس گیئر لگایا۔ ’’سب مانگنے کے بہانے ہیں۔‘‘

گاڑی ریورس ہوئی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔

’’وہ رو رہا ہے۔‘‘

’’کون رو رہا ہے؟‘‘

میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ ٹوکریاں زمین پر رکھے ننھے بچوں کی طرح روتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

’’بڑے مکار ہوتے ہیں یہ۔۔ فریبی۔‘‘

میں نے یہ الفاظ نسبتاً بلند آواز مگر کھوکھلے لہجے میں کہے کیونکہ میں خود کو ڈھارس دینا چاہتا تھا۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ پچپن ساٹھ برس کے ایک بزرگ صورت شخص کو اس طرح بلکتے دیکھ کر میرے اندر بہت کچھ آپ ہی آپ ٹوٹ گیا تھا۔ میں اسے کچھ دے سکتا تھا۔ دینا چاہتا تھا لیکن اب گاڑی سڑک پر آ چکی تھی۔ آگے پیچھے بھاری ٹریفک تھا۔ پھر وہ کیا سوچتی میں اندر سے اتنا کمزور اور زود پشیمان ہوں ؟ لیکن گھر پہنچتے پہنچتے مجھے لگا زار و قطار روتا وہ بوڑھا میرے ذہن سے چپک کر میرے ساتھ ہی چلا آیا ہے۔

میں نے کپڑے تبدیل کیے اور ٹیلی ویژن کھولا مگر بند کر دیا۔ کتاب لے کر لیٹا مگر پڑھنے میں جی نہ لگا۔ بار بار بوڑھے کا آنسوؤں سے تر چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ کاش میں نے اسے روپیہ دو روپیہ دے دیا ہوتا۔ یہ الجھن تو نہ ہوتی۔

روپیہ۔۔ جس کا میں نے پان چبا کر تھوک دیا تھا جسے میں سگریٹ کی صورت پھونک رہا تھا۔ جس کی قیمت کا سوڈا واٹر میں بوتل میں چھوڑ آیا تھا اور روپیہ۔۔ جو میں نے ہوٹل کے لڑکے کو ٹپ میں دے دیا تھا۔

کبھی خود پر غصہ آتا کبھی بوڑھے پر۔۔ طرح طرح سے جی کو بہلانے کی کوشش کی کہ ضرور اس کا تعلق پیشہ ور بھکاریوں کے کسی گروہ سے ہو گا اور اب تک اس کی اپنی گاڑی اسے لینے آ گئی ہو گی بلکہ اب تک وہ اپنے ڈیرے پر پہنچ کر دن بھر کی کمائی کا حساب لے یا دے رہا ہو گا۔ کیا پتہ وہ اس وقت کسی ریستوران میں بیٹھ کر چکن تکہ یا کڑاہی گوشت کھا رہا ہو یا چرس بھرے سگریٹوں کے کش لگا رہا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے آنسوؤں سے دھلا ہوا اس کا معصوم اور نڈھال چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا اور میں پریشان ہو جاتا۔

پریشانی سے بچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ میں واپس جاؤں اور اگر وہ بھوکا ہے تو اسے کھانے کے لئے کچھ پیسے دے آؤں یا اگر وہ کڑاہی گوشت کھا، یا سگریٹ پھونک رہا ہے تو اس پر لعنت بھیج کر واپس آ جاؤں اور مطمئن ہو کر سو جاؤں لیکن

میں اپنی ہر کمزوری اس سے چھپاتا رہا۔ اس لیے میں نے کسی ضروری کام کا بہانہ کیا اور گیراج سے گاڑی نکال کر بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔

جونہی میں گلی کا موڑ مڑ کر سڑک پر آیا مجھے دور پہاڑیوں میں واقع اس کا چھوٹا سا گھر دکھائی دینے لگا جہاں اس کی بیمار بیوی کھاٹ پر لیٹی کھانس رہی تھی اور زرد رو بیٹی بیٹھی تنکوں کی ٹوکری بنا رہی تھی۔ اس کی بیٹی کو اپنے کام میں بڑی مہارت ہے اور اسے اپنی بنائی ہوئی ٹوکریوں پر بڑا ناز ہے مگر اسے شکایت ہے کہ قصبے کا دکاندار اچھے دام نہیں دیتا وہ ہر بار بابا سے کہتی ہے کہ وہ ٹوکریاں شہر لے جا کر بیچے اور دیکھے کہ بیگمات ان کی کتنی قدر کرتی ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بل کھاتی پہاڑی سڑک پر وہ شہر کو جاتی بسوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ٹوکریاں اٹھائے پیدل چل رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شہر میں داخل ہوتے ہی جگہ جگہ بیگمات ٹوکریاں دیکھنے کے لئے کاریں روک لیں گی اور ہاتھوں ہاتھ خرید لیں گی۔ پھر وہ بیوی کی دوائی، بیٹی کے کپڑے اور بکری کی گانی خرید کر بس میں سوار ہو گا اور اپنے گھر واپس چلا جائے گا۔ مگر آج تیسرا روز ہے اور اس کی ایک بھی ٹوکری فروخت نہیں ہوئی شاید ان کا فیشن ختم ہو گیا ہے یا ڈیزائن پرانے ہو گئے ہیں وہ سڑکوں اور بازاروں میں ٹوکریاں اٹھائے بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا ہے۔

میں نے بازار کے اس حصے میں، جہاں تھوڑی دیر پہلے اسے روتا چھوڑ گیا تھا،پہنچ کر گاڑی روکی۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہیں کہیں آتی جاتی کاروں کے گرد منڈلاتا ہو گا۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ میری پشیمانی کیسے دور ہو گی۔

میں نے بازار میں گھوم پھر کر اسے تلاش کرنا شروع کر دیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ضرور وہ چھپ کر کسی ریستوران میں کھا پی رہا ہو گا۔ اگر میں اسے کھاتے پیتے دیکھ لوں تو مجھے کس قدر سکون ملے۔ دل میں چبھی ہوئی پھانس سی نکل جائے۔

ہوٹلوں اور ریستورانوں میں طرح طرح کے لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ گپ شپ کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں اس کی پوری شکل نہیں تھی لیکن اتنا ضرور یاد تھا کہ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی تھی اور وہ پچپن ساٹھ برس کا ایک دیہاتی بوڑھا تھا جس کے پاس تین ٹوکریاں تھیں۔ میں نے ایک ایک ہوٹل میں جا کر اسے تلاش کیا۔ لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ لوٹ جاؤں مگر مجھے اپنی طبیعت کا حال معلوم تھا۔ ذرا سی الجھن بھی ہو تو جب تک اس پر قابو نہ پا لوں یا اس کا حل نہ سوچ لوں چین نہیں آتا۔ میں نے اسے فٹ پاتھوں اور ملحقہ پارکوں میں سوئے یا سوتے جاگتے آدمیوں میں تلاش کیا۔ پھر قریبی مسجدوں میں جا کر دیکھا۔ رات کے بارہ بج گئے مگر اس کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ناکام واپس آؤں اور رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہوں۔

تو کیا وہ سچ مچ بھوکا تھا۔ بغیر کچھ کھائے پئے سو گیا۔ سویا کہاں ہو گا۔ خالی پیٹ نیند کہاں آتی ہے۔ بھرے پرے شہر میں بھوکا رہ کر وہ کیا سوچتا ہو گا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ لذیذ کیک پیسٹریوں سے بھری بیکریوں، خوش ذائقہ مٹھائیوں سے اٹی دکانوں، اناج سے بھرے گوداموں اور رنگا رنگ پھلوں سے آراستہ فروٹ شاپس کے سامنے یا کہیں آس پاس آدمی بھوکا پڑا رہے۔

رات بھر عجیب واہیات اور مکروہ خواب دکھائی دیتے رہے۔ کبھی میں دیکھتا، میں جس شخص کی برائیاں بیان کر رہا ہوں وہ عین میرے پیچھے کھڑا سن رہا ہے۔ کبھی دیکھتا کہ میں نے ایک بچے سے ٹافی چھین کر ہڑپ کر لی ہے اور وہ میرے سامنے زار و قطار رو رہا ہے۔ بار بار آنکھ کھلتی رہی۔ عجیب ندامت بھری رات تھی۔

صبح دفتر جاتے ہوئے میں نے بازار کا ایک لمبا چکر لگایا۔ فٹ پاتھوں، دکانوں کے تھڑوں اور ملحقہ پارکوں پر نظر دوڑائی۔ دفتر میں بھی بار بار مجھے اس کا خیال آتا رہا۔ دفتر سے واپسی پر بھی میں نے اس خیال سے بازار کا چکر لگایا کہ شاید وہ کہیں دکھائی دے جائے اور میں اسے روپیہ دو روپیہ دے کر اس خلش سے نجات حاصل کر سکوں جو مجھے گذشتہ شب سے اندر ہی اندر بے چین کر رہی تھی۔ لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ تاہم مجھے توقع تھی کہ شام کے بعد وہ ضرور اسی جگہ مل جائے گا جہاں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

میں نے شام ہونے کا بیتابی سے انتظار کیا اور کھانا کھائے بغیر ٹہلنے کے بہانے بازار کی طرف چل دیا۔ میں بڑی دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد گذشتہ رات والی جگہ کا چکر لگاتا مگر وہ نہ ملا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔

بدبخت تیری اتنی عمر گزر گئی لیکن تجھے خبر نہ ہوئی کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آخر تو اتنا عرصہ کیا کرتا رہا ہے کہ اس زمانے میں بھی بھوکا سوتا ہے جب اس موضوع پر شاعر نظمیں کہنا اور افسانہ نگار کہانیاں لکھنا ترک کر چکے ہیں۔ تیری زندگی میں کتنے ملک آزاد ہوئے کتنی نئی قومیں اور ملک معرض وجود میں آئے۔ کیا کیا ایجادات ہوئیں۔ کتنے علمی اور سائنسی انکشافات ہوئے۔ ٹیکنالوجی نے انقلاب برپا کیا۔ کلرک وزیر سفیر اور سپاہی جرنیل کرنیل بن گئے۔ دینو میراثی کا لڑکا پٹواری بن گیا۔ رحمو نائی کا بیٹا کلاس ون افسر لگ گیا۔ وسیم خان راج گیری کرتا تھا اب اے کیٹیگری گورنمنٹ کنٹریکٹر ہے۔ جمیل صاحب پروف ریڈنگ کرتے تھے اب پرنٹنگ پریس کے مالک ہیں۔ بشیرا ریڑھی لگاتا تھا اب ہول سیل فروٹ مرچنٹ ہے۔

بدبخت بوڑھے صرف تو رہ گیا۔ اتنی تبدیلیاں آئیں اور تجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ ٹھیکے، پرمٹ، لائسنس، نیلام، لاٹریاں،الاٹمنٹیں، وظیفے۔ پتہ نہیں تو کس کھوہ میں چھپا رہ گیا۔ تو نے اپنے پہاڑوں سے اتر کر کبھی دیکھا ہی نہیں۔ تو نے دھوپ میں بال سفید کئے۔ ساری دنیا آگے نکل گئی صرف تم پیچھے رہ گئے۔ میرا سکون غارت کرنے کے لئے۔

لیکن تم اگر بھوک سے مرتے ہو تو مرو۔ میری بلا سے۔ میری کیا ذمہ داری ہے اور کیا مجھ اکیلے کی ذمہ داری ہے۔

میں نے اسے اگلے روز اور اس سے اگلے روز بھی تلاش کیا۔ یقیناً وہ اپنے گھر واپس چلا گیا ہو گا۔ یہ سوچ کر میں دل کو تسلی دینا چاہتا لیکن ایک بوجھ سا تھا جو میں ہر وقت دل پر لیے پھرتا تھا۔ ایک بے کلی سی تھی۔ ایک خلش تھی جو مجھے بے چین کرتی رہتی تھی۔

پھر ایک روز میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی۔ ایک نامعلوم بوڑھا بس کے نیچے آ کر کچلا گیا تھا اور حالانکہ خبر میں ٹوکریوں کا ذکر نہیں تھا۔ لیکن میں نے یہ یقین کر لینے میں عافیت سمجھی کہ وہ وہی بوڑھا تھا۔ مجھے دکھ ضرور ہوا۔ لیکن اس رات میں چین اور سکون کی نیند سویا جیسے آخری بھوکا آدمی دنیا سے اٹھ گیا ہو۔

***

دو جمع دو

تیز گام رکتی ہے۔

پلیٹ فارم پر منتظر اور بے قرار ہجوم میں افراتفری پھیل جاتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے سارا ہجوم اے سی سی (ائیر کنڈیشنڈ کوچ) فرسٹ سیکنڈ اور تھرڈ چار حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

میں سامنے والے ڈبے کی طرف دیکھتا ہوں، گرمی سے میرا جسم جھلس رہا ہے۔ لیکن ایئر کنڈیشنڈ ڈبے پر نظر پڑتے ہی میں بدک جاتا ہوں اور ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ پھر فرسٹ اور سیکنڈ کے ڈبوں پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر میں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس جاتا ہو گی لیکن میری روح اب تک ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں اٹکی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر میں بدک گیا تھا۔

مجھے اے سی سی، فرسٹ اور سیکنڈ کے ڈبوں میں سوار ہونے والوں پر خواہ مخواہ غصہ آنے لگتا ہے جیسے انہوں نے اپنی اپنی جیب سے نہیں کاٹ کر ٹکٹ خریدے ہوں اور اپنے اپنے ڈبوں کی کھڑکیوں سے سر باہر نکال کر میر منہ چڑا رہے ہوں۔

تیز گام روانہ ہوتی ہے۔

پلیٹ فارم پیچھے رہ جاتا ہے ریلوے کوارٹر ساتھ ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ بڑے چھوٹے اور چھوٹے چھوٹے کوارٹر--- ایک بڑے کوارٹر میں کئی چھوٹے کواٹر سما سکتے ہیں۔

چھوٹے کوارٹروں میں چھوٹے ملازمین رہتے ہیں خواہ ان کے قد چھوٹے نہ ہوں اور ان کی تعداد بڑے کوارٹر والوں سے زیادہ ہو اور خواہ بڑے کوارٹر والوں کو ایک دوسرے کو تلاش کرتے وقت کتنے ہی ویران اور خالی کمروں سے گزرنا پڑتا ہو۔ بڑے کوارٹروں میں کمرے خالی پڑے رہتے ہیں۔ اور چھوٹے کوارٹر والوں کی چارپائیاں گلیوں میں بچھانا پڑتی ہیں۔

ائیر کنڈیشنڈ اور فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں سیٹیں خالی پڑی رہتی ہیں اور تھرڈ کلاس میں سانس لینا دو بھر ہو جاتا ہے۔ ہم سب مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم نے سرکاری ملازمتوں کو بھی چار بڑے بڑے درجوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اول، دوئم، سوئم اور چہارم۔

یہ تقسیم بڑی پرانی ہے۔

وہ جو سر سے پیدا ہوئے ایک کندھوں اور ہاتھوں سے پیدا ہوئے دو رانوں سے پیدا ہوئے تین اور وہ جو پاؤں سے پیدا ہوئے چار۔

مگر یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب ایک لمبی تاریک رات ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔درخت اور انسان زمین سے چمٹے ہوئے تھے اگر زہریلی سرد ہوائیں چلتی تھیں۔ ستاروں کی پھیکی پھیکی روشنی میں ہر چیز پر اسرار معلوم ہوتی تھی۔ سانپ، سنپولئے، اور ناگنیں درختوں کی شاخیں اور ٹہنیاں تھیں۔ کئی کئی ہاتھوں اور سروں والے دیوتا آلتی پالتی مارے جگہ جگہ نظر آتے تھے۔ مردوں کی زبانوں پر قفل اور پاؤں میں زنجیریں تھیں۔ چتاؤں کے بھسم کر دینے والے شعلوں کے خوف سے عورتوں کی زبانیں گنگ اور بدن حرارت سے محروم تھے۔

آدم خور حکمرانوں، خونخوار سرداروں، کئی کئی ہاتھوں اور گردنوں والے دیوتاؤں اور خود ساختہ مذہبی روایات کے آڑھیتوں اور اجارہ داروں کے خلاف بات کرنے یا سوچنے پر زبانوں میں سوراخ کر دیے جاتے۔ ان کر برابر بیٹھنے پر چوتڑ کاٹ دئیے جاتے تھے اور منہ میں لوہے کی گرم سلاخیں ٹھونکی جاتی تھیں۔

جگہ جگہ انسانی لاشوں کے ڈھیر آتے تھے۔ ان لاشوں کو بیتالیں اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے کھدیڑ کھدیڑ کر ان کا ماس کھاتی اور وحشیانہ رقص کرتی تھیں لیکن تفریق و تقسیم کا یہ عمل تو ختم ہو جانا چاہئے تھا۔

یہ اس دور کی بات ہے جب ایک کبھی نہ غروب ہونے والا سورج طلوع ہوا تھا۔ اور گھپ اندھیری رات یکایک تمام ہو گئی تھی۔

چتاؤں کے سامنے کھڑی بد حواس عورتوں کی جان میں جان آئی تھی۔

خود کشی پر مجبور انسان... امید کی کرنیں دیکھ کر مقدس دریاؤں کے کنارے سے پلٹ آئے تھے اور زبانوں پر لگے قفل ٹوٹنے لگے تھے۔

جسم آزاد ہوئے او ان میں روحیں پھڑ پھڑانے لگیں تھیں۔ لاشوں کے درمیان ناچتی چڑیلوں اور بد روحوں کو زمین کھا گئی تھی۔

انہوں نے روشنی کا خیر مقدم کیا اور اپنے آپ کو پہچانا۔

لیکن وہ ایک دوسرے کی پہچان سے پھر بھی عاری رہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے کافروں سے کہا کہ جب تم ان بتوں کو پکارتے ہو تو یہ تمہاری پکار کو سنتے ہیں یا تم کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو نہیں لیکن ہم نے اپنے باپ داد کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے‘‘۔ (الشعراء۵)

اور اس کے بعد...!

وہ سورج جس نے انہیں اندھیروں سے نجات دلائی تھی۔ اب بھی چمکتا تھا۔ لیکن انہوں نے دوسرے سورج خود بنا لئے تھے اور ان کی پرستش شروع کر دی تھی یہ سورج مادہ نخشب کی ترقی یافتہ صورت تھے۔ ان کی غیر فطری اور مصنوعی روشنی سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور وہ بصارت سے محروم ہو گئے۔

بصارت سے محروم ہو کر انہوں نے پھر سانپوں، اژدہوں، بد روحوں، سونے کے آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے دیو تاؤں اور عورتوں سونے کے آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے دیوتاؤں اور عورتوں کے ننگے کی پرستش شروع کر دی اور اپنے اپنے سورجوں کے حوالے سے مزید گروہوں اور ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ انہوں نے روشنی کا پیغام لے کر آنے والے روشن بدنوں کو لٹیرے اور حملہ آور قرار دیا اور وہ بھول گئے کہ خود انہوں نے کبھی یہاں آ کر زمینیں، عورتیں، اور بستیاں لوٹی تھیں۔ اگر انسانوں کو غلامی کی بیڑیاں پہنائی تھیں۔

وہ بہت کچھ بول گئے اور نہیں جانتے تھے کہ مصنوعی سورجوں کی غیر فطری تپش آنے والی کل کو ان کی فصلوں کے خوشوں کو سیاہ کر سکتی ہے اور ان کے کنوؤں کو خشک، زمینوں کو بنجر اور دریاؤں کو زندہ مچھلیوں سے محروم کر سکتی ہے۔

تیز گام فراٹے جا رہی ہے۔

کل اور آج دو ڈبوں کی طرح ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر اگلا ڈبہ اچانک رک جائے تو پچھلا ڈبہ اس کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔

کون جانے اگلا دبہ کب ٹکرا جائے اور اچانک رک جائے۔

کوارٹر بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ مگر شہر ساتھ ساتھ ہے۔ چھوٹے بڑے مکان ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے ہیں۔

یہ ہوٹل ہے۔ یہ لاریوں کا اڈہ ہے، اور یہ سینما ہے۔

''پتر پنج دریا واں دے'' فلم لگی ہے۔

کھڑکی توڑ ہفتے کا افتتاح ہو رہا ہے۔ ٹکٹ بلیک ہو رہے ہوں گے جیبیں کٹ رہی ہوں گی۔ تھرڈ کلاس کی کھڑکی کے سامنے بے حد رش ہے۔ وہ سب باہم دست و گریباں ہیں۔ یہ تھرڈ کلاس والے شائد اسی لئے تھرڈ کلاس والے ہوتے ہیں۔ تیز گام شہر سے باہر آ گئی ہے۔ اور کھلے میدانوں میں بھاگتی جا رہی ہے۔

کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے ہیں۔ فصلیں بیجنے کے لئے بیج، کھاد اور بیلوں کی خریداری ہوتی ہے اور فصلیں بوئے جانے سے پہلے نیلام ہو جاتی ہیں۔

کھاد مٹی میں مل جاتی ہے۔ بیلوں کو رسہ گیر ہانک کر لے جاتے ہیں۔ رہن رکھے ہوئے بیج اگ کر پودے بن جاتے ہیں۔ پودوں سے پھر بیج حاصل ہوتے ہیں۔

مجھے اپنا باپ یاد آنے لگا ہے۔ شائد میرے باپ کا سی طرح یاد آتا ہو لیکن شائد اپنے باپ کا باپ اور اپنے بیٹے کا بیٹا میں خود ہوں۔

مجھے یاد آتا ہے جب وہ اس وادی میں آئے۔ یہاں فصلیں لہلہاتی اور بھینسیں ڈا کرتی تھیں۔ عورتیں دودھ بلوتی اور بچے گیلی مٹی سے گھوڑے بناتے اور چولہے کی آگ میں پکاتے تھے۔

انہوں نے عورتوں، گھروں اور کھیتوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن وہ ہل چلانا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ہل چلانے والوں کو ملازم رکھا اور اپنے گھروں کو اناج سے بھر لیا۔

گودام اناج سے بھرتے رہے۔

کیڑے مکوڑے اور چوہے اناج کھا کھا کر اژدہے اور راکھش بن گئے اور ہر طرف اژدہوں کی پھنکاریں سنائی دینے لگیں جو اناج کے ڈھیر پر کنڈلی مار کر بیٹھ گئے تھے۔

ترمذی سے روایت ہے۔ ''ہماری امت میں مہدی آئے گا جو ایسے زمانے میں آئے گا جب دنیا مصائب و مشکلات کا شکا ہو گی۔ وہ امن قائم کرے گا۔ انصاف پھیلائے گا اور دولت کو لوگوں میں برابر تقسیم کرے گا۔''

تیز گام کا عوام ایکسپریس سے سامنا ہوتا ہے۔

***

دوپہر اور جگنو

اس کی بیوی اسے جگاتی ہے تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

’’کیا ہوا؟--- خیر تو ہے؟‘‘

’’چھ بج رہے ہیں اب اٹھ جائیے۔‘‘

’’اوہ میں سمجھا--- پھر کوئی بری خبر!‘‘

’’وہ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ پھر کہتا ہے‘‘

’’روز کہتا ہوں نیک بخت--- مجھے اس طرح نہ جگایا کرو‘‘

’’آپ تو یوں ہی بدک جاتے ہیں ‘‘ اس کی بیوی باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہتی ہے‘‘

’’پتہ نہیں ہر وقت کیا ڈراؤ نے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔‘‘

’’خواب؟ وہ خود سے سوال کرتا ہے۔ تو کیا یہ سب خواب تھا--- مگر کیسا بھیانک طویل اور مکروہ خواب۔‘‘

ہاں ! ہاں، یہ خواب ہی تو تھا--- ابھی ابھی جب اخبار آئے گا۔ اس پر دسمبر ۱۹۷۰ء کی کوئی تاریخ درج ہو گی۔

رضائی میں لیٹے لیٹے وہ دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی بیوی نے بتایا ہے کہ چھ بج گئے ہیں مگر ابھی چھ بجنے میں دو منٹ باقی ہیں سوئی چھ کے ہند سے کو چھو رہی ہے مگر ابھی چھ نہیں بجے--- یہ چھ اس وقت تک نہیں بج سکتے جب تک بڑی سوئی بارہ کے نقطے کو نہ چھولے۔ مگر یہ بڑی--- صرف نام کی بڑی ہے اسے بڑی پر ترس آنے لگتا ہے جو دائرے کا پورا چکر کاٹ کر آتی ہے۔ چھوٹی نے اس کے مقابلے میں بارہواں حصہ سفر طے کیا ہے لیکن ابھی ابھی جب گھنٹے بجیں گے تو اس کا سہرا چھوٹی کے سر ہو گا۔

چھ بجتے ہیں !

وہ ساتھ ساتھ گنتا جاتا ہے‘‘

اسے معلوم ہے کہ جب چھوٹی چھ پر اور بڑی بارہ پر ہے تو چھ ہی بجیں گے۔ لیکن پھر بھی اسے شک ہے کیا خبر گھڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہو اور آج وہ پانچ یا سات بجا دے۔ چھ تک گنتی پوری ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لینا چاہتا ہے کہ اس کی نظر روشندان پر لگے ہوئے خاکی رنگ کے کاغذوں پر پڑتی ہے ان کھرچے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر اسے بلیک آؤٹ یاد آتا ہے۔ پھر اس کے کان میں سائرن کی آواز گونجتی ہے۔

خندق--- دھما کہ--- خون---- لاشیں--- دھواں اور گھپ اندھیرا---''

''بنگلہ دیش''--- مکتی باہنی!!''

عجیب واہیات خواب تھا۔

لیکن یہ مکتی باہنی کیا ہوتی ہے یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے ذہن سے کیوں چپک گیا ہے۔ کہیں یہ خواب کی بجائے کوئی حقیقت نہ ہو کہ ہم جنگ ہار گئے ہیں--- اس کا دل ڈوبنے لگتا ہے خدا کرے یہ خواب ہی ہو--- خواب کی کرچیاں اس کے دل کو لہولہان کرنے لگتی ہیں۔

اس کے ذہن میں توپ دغنے لگتی ہے ''شکست--- شکست--- شکست'' دھماکوں کا دھواں کم ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں لفظ ابھرتے ہیں۔

''پاسپورٹ--- بائیس خاندان--- زر مبادلہ--- بنگلہ بندھو--- قومی ملکیت--- عوامی حکومت!''

عوامی حکومت کا خیال آتے ہی اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ خواب تھا وہ بیوی کو بلا کر شک دور کرنا چاہتا ہے کہ گلی میں ہاکر آواز گونجتی ہے۔ ''اخبار اے'' اس کے دھیان خواب کی باتوں سے ہٹ کر ہاکر نیوز ایجنٹ اور اخبار کے مالک کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس لمحے اس کا بڑا بچہ اخبار لا کر سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ اخبار اٹھا کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن کسی انجانے خوف سے اس کا ہاتھ لرز کر رہ جاتا ہے۔ پتہ نہیں آج کس ملک نے کس بڑی طاقت کے اشارے پر کس ملک پر حملہ کر دیا ہو؟

پتہ نہیں آج کسی ملک کی فوج نے وہاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا ہو اور کیا خبر وہ حکومت الٹے ہوئے تختہ کو پھر سیدھا کر کے اس پر بیٹھ گئی۔ یا ابھی تک تختے پر پڑی ہو۔

نہ جانے آج کہیں ہوائی جہاز گاڑی یا بس کا حادثہ ہو گیا ہو یا کہیں طوفان اور زلزلے کی وجہ سے ہزاروں انسان موت کی نیند سو گئے ہوں کسی کارخانے میں آگ لگ گئی ہو یا کسی دکان کو لوٹ لیا گیا ہو۔ کسی کی بہو بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہو یا اغوا کر لی گئی ہو۔

نہ جانے آج کس وجہ سے بھائی نے بھائی کا خون کر دیا ہو۔ باپ نے بیٹے کو عاق کر دیا ہو۔ اور کیا پتہ جب وہ اخبار اٹھا کر دیکھے اس میں جنوری ۱۹۷۲ء کے بجائے کوئی اور تاریخ چھپ گئی ہو۔

مگر نہیں۔۔۔ وہ تو خواب تھا۔۔۔ طویل بھیانک اور مکروہ خواب!

اسے شک دور کرنے کے لئے اخبار دیکھنا چاہئے۔

وہ اخبار دیکھتا ہے

اخبار میں سانپ لپٹا ہوا ہے۔ وہ چیخنا چاہتا ہے لیکن سانپ اس کے گلے کے گرد کنڈلی مار لیتا ہے اور اپنی دو شاخی زبان سے اس کا دماغ چاٹنے لگتا ہے۔ پھر اتر کر سیمنٹ کنکریٹ کے پکے فرش میں گھس جاتا ہے۔

وہ اخبار کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اخبار کورے کاغذوں کا پلندہ ہے اس پر کوئی سرخی، کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر آنکھیں ملتا ہے کہیں وہ اچانک بصارت سے محروم نہ ہو گیا ہو۔

وہ اخبار سے منہ ڈھانپ لیتا ہے۔

اس کے کانوں میں لاکھوں سسکیوں، آہوں، چیخوں اور دھماکوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے۔ پھر پورے زور سے چیخ کر کہتا ہے۔

’’ہاں ہم ہار گئے، ہار گئے!‘‘

اس کے ساتھ اس کی آنکھ سے کوئی آنسو نہیں گرتا۔

مگر اخبار کے اوراق پر آہستہ آہستہ الفاظ ابھرنے لگتے ہیں، سرخیاں شہ سرخیاں، تصویریں، خبریں، کالم، کارٹون، نظمیں اداریہ اور جنگی قیدیوں کی فہرست!

وہ خبروں کی سرخیاں یوں جلدی دیکھتا ہے جیسے بہت سے زخمیوں اور مرنے والوں میں اپنی لاش تلاش کر رہا ہو۔ دوسرے کمرے کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آتی ہے وہ اچھل پڑتا ہے۔

پھر چیخ کر کہتا ہے۔

’’ہزار بار کہا ہے دروازہ آہستہ بند کیا کرو۔‘‘

کچھ عرصہ سے اچانک شور یا آہٹ سے کا دل بری طرح دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کے قریب سوکھا پتہ گرے تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر نے سے یقین دلایا ہے کہ اس کا دل ٹھیک ہے۔ البتہ اسے اپنے دماغ کو صاف رکھنا چاہئے۔

دروازے پر کسی گداگر کی صدا گونجتی ہے ''اللہ کے نام پر روٹی کا سوال ہے''۔

اس کی چھ سال بچی منہ ہاتھ دھو کر جلدی جلدی آتی ہے اور باورچی خانے سے روٹی لے کر دروازے کی طرف جاتی ہے وہ تڑپ کر بستر سے نکلتا ہے اور بھاگ کر دروازے کی طرف آتا ہے۔ اس کے کندھے پر لمبے لمبے تھیلے لٹک رہے ہیں اور جیسے وہ ابھی ابھی بچی کو کلور و فام سنگھا کر اور اپنے تھیلے میں ڈال کر غائب ہو جائے گا۔ وہ لپک کر بچی کو بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لاتا ہے۔ پھر بیوی سے الجھ پڑتا ہے۔

تمہیں یعقوب علی کی بچی کے اغوا کا قصہ بھول گیا ہے کیوں بچی کو خیرات دینے کے لئے بھتیجی ہو۔''

نہا دھو کر جب وہ ناشتہ کرنے بیٹھتا ہے پھر اخبار اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے۔

''بیوی نے شوہر کو کھانے میں زہر دے دیا۔''

ڈبل روٹی کا ٹکڑا اس کے منہ میں ہے لیکن وہ چبا نہیں سکتا۔ اسی لمحے اس کی بیوی اندر آتی ہے۔ ''آپ کھاتے کیوں نہیں ؟''

اس کا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ وہ ناشتے کی چیزیں بیوی کے منہ پر دے مارنا چاہتا ہے لیکن پھر اسے ہنسی آ جاتی ہے۔

اس کے دفتر جانے سے پہلے بچے سکول چلے جاتے ہیں لیکن وہ اس کا ذہن بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ سکول کا راستہ خطرناک ہے۔ سڑکوں پر تانگوں، بسوں، اور کاروں کا دریا بہتا ہے۔ اس نے کئی بار سوچا ہے کہ بچوں کو موٹر سائیکل پر خود سکول پہنچایا کرے۔ لیکن اسے خوف آتا ہے کسی بچے کی ٹانگ پہئے کی تاروں میں نہ پھنس جائے۔ موٹر سائیکل کسی بس یا ٹرک پر بکھرنے کا تصور کر کے وہ کانپ جاتا ہے اور اب تو ڈاکٹر نے اسے موٹر سائیکل چلانے سے منع کر دیا ہے۔ وہ خود بھی کئی دنوں سے بس یا رکشہ سے دفتر جاتا ہے۔

دفتر جانے سے پہلے اسے قریبی دکان سے گوشت یا سبزی لانا ہوتی ہے۔ وہ لپک کر گوشت کی دکان پر پہنچتا ہے۔ اس نے ایک بار اخبار میں کتوں کا گوشت فروخت ہونے کی خبر پڑھی تھی دبنے تو آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں مگر کتوں اور بکروں میں تمیز کرنے کے لئے اسے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔

گھر سے نکلنے سے پہلے اس کی بیوی شاپنگ کیلئے اجازت مانگی ہے وہ مڑ کر حسرت بھری نگاہ اپنے مکان پر ڈالتا ہے۔ شائد وہ آخری بار اپنے گھر سے جا رہا ہے--- کیا معلوم وہ جس بس میں سوار ہو وہ حادثے کا شکار ہو جائے۔ جب اس کی لاش گھر لائی جائے اس کی ٹانگیں کٹ چکی ہوں۔ کھوپڑی کے دو حصے ہو گئے ہوں اور سڑک سے گھر تک کا سارا راستہ اس کے خون سے سر ہو گیا ہو۔ پھر اسے اپنے

بچوں اور اپنی بیوہ اپنے رشتہ داروں اور اپنی انشورنس پالیسی کا خیال آتا ہے۔ انشورنس پالیسی کا خیال آتے ہی پریمیم تنخواہ اور گھر کے اخراجات کا حساب کرنے لگتا ہے۔

آفس ٹیبل پر بیٹھتے ہی اس کی نظر اپنے نام ایک خفیہ پر پڑتی ہے اور جیسے کسی نے ملازمت کا دروازہ زور سے بند کر دیا ہو۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

کل وہ دو گھنٹے کی چھٹی لے کر ہسپتال گیا تھا وہاں رش ہونے کی وجہ سے دفتری اوقات میں واپس نہیں آ سکا تھا۔

پچھلے ہفتے اس کی میز سے ایک فائل چوری ہو گیا تھا۔

جنگ سے پہلے بڑے صاحب کا لڑکا ولایت سے لوٹا تھا تو وہ بیوی کی علالت کی وجہ سے بر وقت مبارک باد دینے نہیں جا سکا تھا۔

پچھلے برس آڈٹ والوں نے اس کے حساب کتاب میں غلطیوں کی نشان دہی کی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خفیہ خط (CONFIDENTIAL LETTER) کھولتا ہے یہ اس کی ترقی کے لئے دی ہوئی درخواست کا جواب ہے۔

''فی الحال یہ ممکن نہیں ''

اس کی جان میں جان آتی ہے۔ اسے یہ سوچ کر بے حد اطمینان ہوتا ہے کہ وہ خط اس کی جواب طلبی یا برطرفی کا نہیں ہے۔

بارہ بجے کے قریب اسے اپنا گھر بیوی اور بچے یاد آتے ہیں۔

کسی بچے کا سکول سے لوٹتے ہوئے ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔

اس کی عدم موجودگی میں کوئی ناپسندیدہ رشتہ دار مرد، مہمان بن کر گھر نہ آ گیا ہو۔

بیوی شاپنگ کر کے لوٹنے کی بجائے کسی کے ساتھ نہ چلی گئی ہو۔

اس کا جی چاہتا ہے دفتر سے چھٹی لیکر فوراً ہسپتال پہنچے جہاں اس کے حادثے میں زخمی ہونے والا بچہ آخری سانسیں لے رہا ہے لیکن فوراً ہی اسے خیال آتا ہے کہ اتنی دیر میں اس کی بیوی بھاگ جانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اسے سب سے پہلے سٹیشن یا بس کے اڈے پر پہنچنا چاہئے۔ ڈاکٹر کی ہدایات یا د آتے ہی وہ اپنی خود ساختہ پریشانیوں کو ذہن سے جھٹکنا چاہتا ہے کہ کنپٹی پر درد کی شدید ٹیس محسوس ہوتی ہے۔ کئی دن سے درد کی یہ لہر سر کے پچھلے حصے سے اٹھ کر کنپٹی اور بائیں آنکھ پر آ کر رک جاتی ہے۔ رضا صاحب کو بھی پہلے پہلے ایسی ہی شکایت

تھی۔ لیکن دماغ کی رگ پھٹ جانے کے خوف سے وہ جلدی جلدی ہسپتال پہنچنا چاہتا ہے۔

ہسپتال سے سکون اور نیند کی گولیاں لیکر وہ سیدھا بازار چلا جاتا ہے۔ بچوں کے ریڈی میڈ خوبصورت کپڑوں کی دکان دیکھ کر اسے اپنی بچی یاد آتی ہے۔ وہ بچی کے لئے ایک خوبصورت فراک پسند کرتا ہے۔ لیکن پیسے دینے سے پہلے اسے خیال آتا ہے کیوں نہ وہ گھر جا کر پہلے بچی کی خیریت معلوم کر لے۔ وہ فراک چھوڑ کر سیدھا گھر پہنچتا ہے۔

بیوی کھانا لاتی ہے۔ بچے سکول، کھیل، کتابوں اور امتحانوں کی باتیں کرتے ہیں اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب کبھی درد کی لہر اس کی کنپٹی تک نہ آئے گی۔

لیکن رات کو جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹتا ہے نظر نہ آنے والے ان گنت زہریلے چیونٹے اس کے جسم سے چمٹ جاتے ہیں پھر اس کے جسم اور کھوپڑی میں سوراخ کر کے اندر گھس جاتے ہیں۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ پھر خواب آور گولیاں کھا لیتا ہے۔

اب اسے نیند آنے لگتی ہے لیکن وہ اس نیند سے بے حد خوف زدہ ہے۔ یہ موت ایسی نیند زبردستی اس پر مسلط ہوئی جاتی ہے۔ وہ اٹھ کر بھاگنا اور گلاپھاڑ پھاڑ کر چیخنا ہے چاہتا ہے۔ ’’مجھے اس نیند سے بچاؤ‘‘ مگر وہ حرکت نہیں کر سکتا چیخ اس کے گلے میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ ایک دم گھونٹنے والا دھواں اس کے چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔

اس کے دماغ میں توپ دغنے لگتی ہے۔ ’’شکست... شکست... شکست‘‘ دھواں گہرا ہو جاتا ہے۔ کلوروفام کی سی بو سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے۔ اس کے دماغ کا آپریشن ہو رہا ہے۔

اس کے جسم کے سارے اعضاء الگ الگ کر دئے گئے ہیں۔ دونوں ٹانگیں مرجھائی مرجھائی کونے میں پڑی ہیں۔ دونوں بازو میز پر رکھے ہیں۔ اس کی کھوپڑی چیر کر اس میں سے موٹی موٹی گردنوں والے چیونٹے نکالا جا رہے ہیں وہ میز سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ ٹرے میں اس کا دل پڑا دھڑک رہا ہے۔ قریب ایک بوتل میں اس کی روح کلبلا رہی ہے۔ وہ بوتل کا ڈھکنا کھول دینا چاہتا ہے لیکن نرس بوتل چھین کر الماری میں بند کر دیتی ہے۔

اسی لمحے ڈاکٹر خوش ہو کر کہتا ہے۔

’’یہ رہا درد۔‘‘

’’ڈاکٹر درد کو چمٹی سے پکڑ کر اسے دکھاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا نوکیلا سا پتھر ہے۔ سیاہ۔۔۔ بھورا۔۔ یا شائد گہرے سبز رنگ کا۔

ڈاکٹر کہتا ہے۔

’’یہ درد ہے۔۔۔ یہ تمہاری کھوپڑی سے نکلا ہے۔ آج کل جو ہوا چلتی ہے۔ اس میں ایسے بہت سے باریک باریک ذرات ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ کھوپڑی میں جمتے رہتے ہیں اور پھر درد کا نو کیلا پتھر بن جاتے ہیں۔ تمہیں آئندہ احتیاطاً سانس نہیں لینی چاہئے۔‘‘

اس کی بیوی اسے جگاتی ہے تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

’’کیا ہوا۔۔۔۔ خیر تو ہے؟‘‘

’’چھ بج رہے ہیں اب اٹھ جائیے‘‘

’’اوہ۔۔۔۔ میں سمجھا شائد پھر کوئی بری خبر۔۔۔؟‘‘

وہ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔

***

الہام

دوپہر کے کھانے میں جب اتنا کم وقت رہ گیا کہ گاؤں سے کوئی سندیسہ شہر نہ پہنچ سکے تو چودھری رمضان نے اپنے گھر کے کشادہ صحن میں کھڑے ہو کر منادی کرنے کے سے انداز میں اطلاع دی۔

’’فوجی آ رہے ہیں ‘‘

’’کب؟‘‘

’’آج‘‘

’’آج؟‘‘

’’ہاں دوپہر کو۔۔۔ کھانے کی تیاری کرو‘‘

راجاں سمجھ تو گئی کہ چودھری نے پہلے کیوں نہیں بتایا مگر ایسے خاص مہمانوں کا کھانا پکانے کے لئے اب وقت ہی کتنا رہ گیا تھا۔ بولی

’’اطلاع کب آئی؟‘‘

’’کل شام کو‘‘

’’مجھے تو بتا دیتے‘‘ راجاں نے شکایت آمیز لہجے میں کہا،’’کیامجھ پر بھی اعتبار نہیں رہا ‘‘

’’میں نے سوچا‘‘ چودھری بولا ’’اس بار شک و شبے کی گنجائش نہ رہے‘‘

’’کتنے لوگ ہیں۔۔۔ کیا کچھ پکانا ہو گا؟‘‘

’’پانچ وہ، دو تین ڈرائیور۔۔۔ وہی سب کچھ پکا لو۔۔۔جو پکایا کرتی ہو‘‘

’’میں نے مشینیں نہیں لگا رکھیں ‘‘

’’وہ بھی لگ جائیں گی بھاگوان‘‘ چودھری مسکرایا ’’فکر کیوں کر تی ہو۔ یہ کمی کاری کس لئے ہیں ‘‘

''آج دن کیا ہے؟'' راجاں کو سعد اور نحس دنوں اور گھڑیوں کا بہت خیال رہتا تھا۔

''بدھ'' چودھری نے داد طلب انداز میں جواب دیا ''کم سدھ''

''انشاء اللہ ''راجاں نے زیرِ لب کہا

''یوں تو فکر کی کوئی بات نہیں چودھری بولا۔ لیکن پھر بھی اس پر نظر رکھنا۔ کیا کرتی ہے''

''اس بے چاری نے کیا کرنا ہوتا ہے '' راجاں بولی ''اسی اونترے کو الہام ہو جاتا ہے اور عین موقعے پر پہنچ کر رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے''

''دیکھتے ہیں '' چودھری کسی انجانی خوشی کا لطف لیتے ہوئے بولا ''اس بار اسے کیسے الہام ہوتا ہے''

''مجھے تو یقین ہے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اچانک آ ٹپکے گا اور مہمان بد دل ہو کر چلے جائیں گے''

''یہ فوجی لوگ ہیں '' چودھری نے تسلی دی ''ایک بار آ جائیں تو اتنی آسانی سے نہیں جاتے''

''کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔ کیا حرج ہے۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو ہم یہ کڑوا گھونٹ پی کیوں نہیں لیتے''

چودھری نے غصے سے راجاں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تم چاہتی ہو۔۔۔سب کچھ اسے دان کر دیں۔ اپنی بیٹی، خاندان کا نام اور زمین جائیداد؟''

''کیا حرج ہے۔ہم نے اسے بیٹا بنایا ہے''

''ہم نے اسے لا وارث سمجھ کر پناہ دی، پالا پوسا اور پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ کیا یہ کم ہے''

''دل تو میرا بھی نہیں مانتا پتہ نہیں کیسے ماں باپ کی اولاد ہے اور دنیا کیا کہے گی مگر''

''اگر مگر چھوڑو۔۔۔ وقت کم ہے۔ کھانے کی تیاری کرو''

تھوڑی دیر بعد حویلی کے صحن سے دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔ چولھوں پر کڑھائیاں اور دیگچے چڑھ گئے۔ مرغ روسٹ ہونے لگے، کباب تلے جانے لگے اور ہر طرف زردے، بریانی اور قورمے کی خوشبوئیں اٹھنے لگیں اور سورج ڈھلتے ڈھلتے کمی کاریوں کے شور، برتنوں کے کھڑکنے اور نگرانی کرتی راجاں کے بول بلا رے میں کاروں جیپوں کی گھوکر شامل ہو گئی۔ چودھری رمضان ٹھنڈی بوتلوں

کے ساتھ نلکیاں بھجوانے کی تاکید کر کے ڈیرے کی طرف دوڑا۔ اس کے پہنچتے پہنچتے چھاؤنی آ لگی تھی۔

لڑکے کا والد راجہ جہان خان روایتی لباس میں اور چچا میجر سلطان خان وردی میں تھے۔ خود لفٹین صاحب بھی وردی میں تھے اور نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ اسے پتہ تھا چچا بھتیجے کو ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔ ایک تو بڑے زمیندار پھر فوجی۔ اوپر سے مارشل لاء کا زمانہ۔ چودھری فخر سے پھولے نہ سماتا تھا۔ باری باری سب سے گلے ملا۔ پھر اس کی نظر کار کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھی دو ادھیڑ عمر کی گوری چٹی خواتین پر پڑی۔ فوراً پہچان گیا۔ ان میں ایک لڑکے کی والدہ اور دوسری پھوپھی تھی۔ ملازمین کو مہمانوں کی خاطر تواضع کا اشارہ کر کے چودھری کار کے قریب آیا اور سلام دعا کے بعد مہمان خواتین کو گھر پہنچانے اور تعارف کرانے کے لئے ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

گھر سے واپس ڈیرے پر آنے سے پہلے اس نے راجاں کو ایک طرف لے جا کر پوچھا ''نازو کہاں ہے؟''

''ادھر ہی ہے گھر میں۔ اوپر اپنے کمرے میں گئی ہے۔ ابھی بلاتی ہوں ''

''اسے نہیں بلاؤ۔ خود جا کر دیکھو۔ کیا کر رہی ہے''

''کپڑے بدل رہی ہو گی اور کیا کرے گی؟''

کوئی عمل ؟کوئی ٹونا؟''

''عمل ٹونا تو خیر کیا کرے گی۔مگر مجھے لگتا ہے ساری خرابی اس پڑھائی لکھائی کی وجہ سے ہے''

''مہمانوں کے سوا اسے کسی سے ملنے نہ دینا''

''اچھا''

ظہر کے وقت جب سب لوگ کھانے کے کمر ے میں بڑی میز کے گرد جمع ہو گئے تو راجہ صاحب نے ادھر ادھر نظر یں دوڑاتے ہوئے چودھری رمضان سے پوچھا

''بھئی بیٹی کہاں ہے؟''

''جی وہ اوپر والے کمرے میں ہے وہیں کھا لے گی'' راجاں نے کہا

''بھابی ہم صرف کھانا کھانے نہیں آئے۔ بیٹی سے ملنے آئے ہیں۔ بلاؤ اسے''

راجاں نے پریشان ہو کر چودھری کی طرف دیکھا۔ وہ کان کھجانے میں مصروف تھا۔ بولی

''بہت شرماتی ہے''

''آپ بسم اللہ کریں راجہ صاحب'' چودھری بولا ''میں آپ سے ملا دوں گا''

'' اور میجر صاحب اور عثمان خان؟''

''میجر صاحب سے بھی ملا دیں گے''

''لیکن چودھری صاحب... اصل معاملہ تو لڑکی لڑکے کی ملاقات کا ہے'' راجہ صاحب نے لفظ ملاقات پر زور دے کر کہا

''میں معافی چاہتا ہوں راجہ صاحب'' چودھری بولا ''ہمارے ہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا''

''عجیب رواج ہے'' راجہ صاحب سٹپٹا گئے ''یعنی لڑکی لڑکا جنہوں نے ایک ساتھ زندگی گزارنی ہے سب سے مل سکتے ہیں مگر ایک دوسرے کو دیکھ اور مل نہیں سکتے''

''زمانہ بدل گیا ہے بھائی صاحب'' بیگم راجہ بولیں ''اب وہ پرانے رسم و رواج نہیں رہے''

''بھابی یہاں گاؤں میں زمانہ نہیں بدلا'' چودھری بولا ''لوگ سنیں گے تو باتیں بنائیں گے''

''زمانہ تو یہاں بھی بدل گیا ہے'' میجر صاحب بولے ''مگر سمجھنے کی ضرورت ہے''

''یہ میز کرسیاں، پلیٹیں، بجلی، پنکھا اور فریج'' عثمان خاں کی پھوپھی بولیں ''یہ سب پہلے کہاں تھے گاؤں میں ''

''یہ روشنی کا زمانہ ہے'' کرنل صاحب نے کہا۔ نئی نئی چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں۔ جن سے فاصلے سمٹ گئے اور رسم و رواج بدل گئے ہیں۔ اب شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کا ایک دوسرے کو دیکھنا اور پسند کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے''

''ہاں ذہنوں میں بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ اب شادی بیاہ کے معاملے میں زبردستی ممکن نہیں '' میجر صاحب نے لقمہ دیا۔'' چند برسوں میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے''

راجاں اور چودھری نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر چودھری مری ہوئی آواز میں راجاں سے مخاطب ہوا

''جاؤ... اسے لے آؤ''

راجاں چلی گئی تو چودھری نے کہا

''آپ کھانا شروع کریں راجہ صاحب۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ نازو ابھی آ جائے گی''

''ہم تو اپنی بیٹی کے ساتھ کھائیں گے'' راجہ صاحب نے اپنائیت سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب گلابی سوٹ میں ملبوس جھینپی جھینپی سی نازو ماں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور سلام کیا تو تینوں مہمان مردوں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ خواتین سے وہ کچھ دیر پہلے مل چکی تھی انہوں نے دعا دی اور اپنے پاس بٹھا لیا۔وہ مہمان عورتوں کے درمیان سہم سکڑ کر بیٹھ گئی تو راجہ صاحب راجاں کی طرف دیکھ کر بولے۔

''بھابی آپ کو غلطی تو نہیں لگ گئی''

''کیا بھائی صاحب'' راجاں پریشان ہو گئی۔راجہ صاحب نے خوشدلی سے کہا

''بیٹی کی بجائے گلاب کا پھول لے آئیں ''

سب ہنسنے لگے۔ چودھری اور راجاں کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔

کچھ دیر ایسی ہی خوشگوار باتوں کے بعد کھانا شروع ہوا۔کھانا اتنا اچھا اور لذید تھا۔سب نے باری باری اس کی تعریف کی۔مگر لیفٹین صاحب کو کھانے کا کہاں ہوش تھا۔وہ نازو کے بے پناہ حسن میں گم ہو گئے تھے۔ اچانک پانچ ہارس پاور کی موٹر سائیکل کی آواز نے چودھری اور راجاں کو یوں دہلا دیا۔۔۔ جیسے خان کھیوے کے گھر کے پچھواڑے مرزا جٹ کی بکی آ ہنہنائی ہو۔(سم بکی دے کھڑکدے،جیوں آہرن پین ودان)

مہمان یوں چونکے جیسے محاذ جنگ سے دشمن کے حملے کی اطلاع آئی ہو۔ مگر ہونے والی سسرال کی عورتوں کے درمیان سکڑی سمٹی، گن گن کر نوالے لیتی اور لفٹیننٹ عثمان خان کی تحسین آمیز اور بیباک نظروں سے سہمی ہوئی نازو اس پھٹپھٹاہٹ سے جیسے سوتے سے جاگ اٹھی۔ نہیں مرتے سے زندہ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک اور چہرے پر اعتماد کی روشنی پھیل گئی۔ اس تبدیلی کو محسوس کر کے فوجی لوگ چونکے جیسے خطرے کا بگل بجنے لگا ہو اور اس سے پہلے کہ چودھری یا چودھرانی کمرے سے باہر جا کر خطرے کو وہیں روک دیتے، وہ موٹر سائیکل ہی کی رفتار سے اندر داخل ہو گیا۔

چودھری اور راجاں نے پریشان ہو کر پہلے ایک دوسرے کی، پھر اس کی طرف دیکھا۔

اس کے بال ضرور بکھرے ہوئے تھے مگر اس کے لباس اور چہرے سے اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ سو ڈیڑھ سو کلو میٹر کا سفر طے کر کے آ رہا ہے۔

(سے کوہاں دا فاصلہ،بکی دتی دھوڑ دھما)

''اسلام علیکم''

''وعلیکم سلام'' مہمان آوازیں منمنائیں

''امی-- میں زیادہ لیٹ تو نہیں ؟'' وہ بے تکلفی سے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''نہیں---'' راجاں نے ڈوبی ڈوبی آواز میں جواب دیا۔

''یہ غلام رسول ہے'' چودھری نے ندامت اور معذرت کے ملے جلے لہجے میں کہا ''ہمارا بیٹا''

''آپ کا بیٹا؟'' راجہ صاحب نے حیرت سے پوچھا ''آپ نے تو بتایا تھا آپ کی ایک ہی اولاد ہے''

''منہ بولا'' راجاں چودھری کی کمک کو آئی ''بیٹوں کی طرح پالا ہے''

''جی ہاں انکل'' غلام رسول نے پلیٹ میں بریانی لیتے ہوئے کہا ''انہوں نے مجھ یتیم اور لا وارث کو پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا اور میں بھی انہیں سگے ماں باپ ہی سمجھتا ہوں ''

''کیا کرتے ہو؟'' میجر صاحب نے انٹرویو لینے کے انداز میں پوچھا

''الیکٹرانکس میں ڈپلوما کیا ہوا ہے۔ ایک موبائل فون کمپنی میں کام کرتا اور کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔ چھٹی والے دن ملنے آ جاتا ہوں۔ آج آپ لوگوں کی وجہ سے آنا پڑا''

''لیکن چودھری صاحب نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا'' کرنل صاحب کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بتایا تو مجھے بھی نہیں '' غلام رسول ہنسنے لگا ''ابا کو بھولنے کی عادت ہے''

''تو پھر تمہیں کیسے پتہ چل گیا،؟، میجر صاحب نے کرید کی۔

''گھر میں میری جب بھی ضرورت ہو مجھے اطلاع مل جاتی ہے'' غلام رسول نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے بولا ''امی کہتی ہیں مجھے کشف یا الہام ہو جاتا ہے--- ہے نا امی'' وہ ہنسنے لگا

مہمانوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو خطرے سے آگاہ کیا اور محفل کا رنگ تبدیل ہو گیا

''شادی ہو گئی تمہاری؟'' بیگم راجہ نے تنکے کا سہارا تلاش کرنا چاہا۔

’’شادی کے لئے نہیں مانتا‘‘ راجاں نے آخری پتہ پھینکا ’’کہتا ہے پہلے بہن کی رخصتی ہو جائے‘‘

راجاں نے یہ کہہ کر داد طلب نظروں سے چودھری کی طرف دیکھا مگر وہ شاید پیشانیوں کے بل گننے میں مصروف تھا۔

’’آپ کی اتنی زمین ہے‘‘ میجر صاحب چودھری سے مخاطب ہوئے ’’ اور آپ کا منہ بولا بیٹا آپ کا ہاتھ بٹانے کی بجائے شہر میں معمولی ملازمت کرتا ہے‘‘

’’ہم نے تو بہت کہا‘‘ چودھری بولا ’’مگر اسے گاؤں کی بجائے شہر میں رہنا بسنا پسند ہے‘‘

کھانے کا ذائقہ تو غلام رسول کی آمد سے ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ اب مہمانوں کی بے چینی میں بھی ہر لمحے اضافہ ہونے لگا۔ نازو اور غلام رسول کی نظروں کے باہمی سگنلز کسی سے پوشیدہ نہیں تھے--- نہ ہی انہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

کھانے کا فطری دورانیہ مختصر ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ مہمان کھانے کی میز سے اٹھ کر سیدھے کاروں جیپوں میں بیٹھ جانے کا بہانہ سوچتے۔ وائرلیس پر راجہ صاحب کے لئے پیغام آ گیا اور ان کا اٹھنا اور جانا آسان ہو گیا۔

رخصت ہوتے وقت راجہ صاحب نے چودھری رمضان کو اپنے قریب بلایا اور موبائل فون دکھاتے ہوئے آہستہ سے بولے۔

’’یہ کشف یا الہام نہیں چودھری،نئی نئی چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے چودھری۔ہمیں بھی وقت کے ساتھ تبدیل ہو جانا چاہئے۔ خدا حافظ‘‘

***

انجن کے بغیر گاڑی کا مسافر

اگرچہ ڈبے کے اندر۔۔ باہر کی نسبت زیادہ اندھیرا ہے مگر اندر داخل ہو کر وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ اب اس کا پیچھا۔۔ اس سے چھوٹ جائے گا جو اسے ہر کہیں نظر آتا اور پریشان کرتا رہتا ہے۔ وہ اندھیرے میں ٹٹول کر ایک خالی سیٹ تلاش کرتا اور اس پر دراز ہو جاتا ہے۔ دور سے انجن کی سوں سوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر شاید گارڈ وِسل دیتا ہے یا روشنی دکھاتا ہے وہ سن یا دیکھ نہیں سکا مگر گاڑی کو کھینچنے کے لئے انجن کی جو چیخیں سی نکل رہی ہیں وہ صاف سنائی دیتی ہیں۔
گاڑی کے حرکت میں آتے ہی ڈبہ روشن ہو جاتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ پورا ڈبہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور اس سیٹ کے سوا جس پر وہ لیٹا ہے کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ کچھ لوگ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے سامان اٹھائے سیٹوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ایک نوجوان جوڑا جن کی نئی نئی شادی ہوئی لگتی ہے اس کے قریب ہی کھڑا حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ نوجوان کچھ کہنا چاہتا ہے مگر شاید اس کے قیمتی لباس اور پر وقار شخصیت سے مرعوب ہو کر اسے ہمت نہیں ہو رہی۔ وہ دل ہی دل میں نوجوان کی بز دلی پر ہنستا اور لطف اندوز ہوتا ہے پھر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور اُن کے لئے جگہ بناتا ہے۔ لڑکی تشکر کی اُچٹتی ہوئی ایک میٹھی نظر اس پر ڈالتی اور نوجوان کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور ابھی وہ لڑکی کی تشکر آمیز میٹھی نظر کو جو لوگوں کی بھیڑ میں کھو گئی ہے تلا ش کر رہا ہوتا ہے کہ وہ۔۔ ہاتھوں کے بل چلتا اور گھسٹتا ہوا ڈبے میں داخل ہوتا ہے۔

''اللہ کے نیک بندو۔۔ میں غریب محتاج۔۔ دونوں ٹانگوں سے معذور۔آنے دو آنے کا سوال ہے۔''

وہ غصے اور نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے وہ سننا نہیں چاہتا۔۔ وہ یہ الفاظ سن سن کر تھک گیا ہے اسے اس کی صدا کے یہ الفاظ نہ صرف ازبر ہو گئے ہیں بلکہ اس کی زبان پر چڑھ گئے ہیں اور اکثر بے خیالی میں ادا ہو جاتے ہیں۔ کل چوک میں سے گزرتے ہوئے زیبؔ بو نے اس سے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟'' تو اس کے منہ سے نکل گیا ''آنے دو آنے کا سوال ہے۔''

اسے غصہ آ جاتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ اُسے اٹھا کر چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دے۔ مگر وہ رینگتا ہوا ہاتھ کے پنجوں کے بل چلتا دوسرے ڈبے میں چلا جاتا ہے اور وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

’’کھانا گرم۔۔۔ چائے گرم‘‘ بیرے کی آواز سنائی دیتی ہے

اسے یاد آتا ہے اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بیرے کی آواز سن کر اس کے اندر اونگھتی ہوئی بھوک اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور ضد کرنے لگتی ہے۔ وہ بیرے کو کھانا لانے کا آرڈر دیتا ہے۔ بیرا فوراً کھانا لے آتا ہے اور وہ بریانی میں مرغ کا شوربہ ملا کر کھانے لگتا ہے مگر ابھی اس نے ایک ہی چمچہ منہ میں ڈالا ہے کہ اس کی آواز پھر سنائی دیتی ہے۔

’’اللہ کے نیک بندو۔۔۔ میں غریب محتاج۔۔۔ دونوں ٹانگوں سے معذور‘‘

وہ چمچہ ٹرے میں رکھ کر ہاتھ سے اپنی ٹانگوں کو ٹٹول کر دیکھتا ہے پھر مطمئن ہو کر بریانی کھانے لگتا ہے۔

کھانے کھانے کے بعد وہ ہاتھ نہ صاف کرنے چلا جاتا ہے مگر واپس آ کر کیا دیکھتا ہے کہ اس سیٹ پر کٹی ہوئی ٹانگوں والا وہ۔۔۔ بیٹھا اپنے غلیظ ہاتھوں سے جلدی جلدی بچا کھچا کھانا کھا رہا ہوتا ہے۔

’’غلیظ۔۔ ندیدہ۔۔۔ کمینہ‘‘ وہ غصے سے کہتا ہے مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ دانت نکال کر اس کی طرف دیکھتا ہے پھر زبان سے پلیٹ چاٹنے لگتا ہے۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آتا وہ اس مکروہ شخص سے کیسے پیچھا چھڑائے۔ لمحہ کے لئے سوچتا ہے پھر ایک کر اگلے ڈبے میں چلا جاتا ہے۔ اگلے ڈبے کے لوگ اس کی وضع قطع اور اس کے لباس کو دیکھ کر اس کے لئے جگہ بناتے ہیں ایک بزرگ اسے اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں اور نہایت اپنائیت سے پوچھتے ہیں ’’آپ کو کہاں جانا ہے؟‘‘

’’میں۔۔۔ مجھے‘‘ وہ یار کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے لیکن ابھی تک اُس کم بخت کی وجہ سے اُس کا ذہن کام نہیں کر رہا، اُسے فوراً یاد نہیں آتا کہ اُسے کہاں جانا ہے مگر پوچھنے والے کو مطمئن کرنے کے لئے کہتا ہے

’’جہاں تک گاڑی جائے گی‘‘

’’اچھا اچھا۔ پھر تو آپ کا سفر خاصا طویل ہے‘‘

’’ہاں بہت طویل ہے‘‘ وہ کہتا ہے

’’آپ نے برتھ کی ریزرویشن کر بھی سفر کر سکتے ہیں ‘‘

’’میں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں۔۔۔ ایک بیٹا ڈاکٹری پڑھ رہا ہے دوسرا دوبئی میں انجینئر ہے۔

’’آپ کیا کرتے ہیں ؟‘‘

اس کی سمجھ میں نہیں آتا، کیا جواب دے۔ اُسے خود یاد نہیں آ رہا کہ وہ کیا کرتا ہے اور شاید ذہن پر زور دینے سے اسے یاد آ جاتا مگر وہ اپنی کٹی ہوئی ٹانگیں گھسیٹتا اس کے پیچھے پیچھے اس ڈبے میں بھی آ جاتا ہے اور اس کی ذہن کو اپاہج کر دیتا ہے۔

''اُلّو کا پٹھّا'' وہ دل ہی دل میں گالی دیتا ہے

''اللہ کے نیک بندو۔''

''میں غریب محتاج'' وہ اُس کی نقل اُتارتا ہے

''صاحب بھک منگے بہت سو گئے ہیں ''

''جی ہاں۔۔ انہوں نے تو شریف لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے''

''سنا ہے بڑے مالدار ہوتے ہیں یہ مانگنے والے''

''خیر مالدار کیا ہوں گے صاحب۔۔ بس ہڈ حرامی ہے''

''نہیں صاحب۔۔ محض ہڈ حرامی نہیں بڑی کمائی کرتے ہیں یہ لوگ۔ اب اس لولے کو لیجئے آپ کے خیال میں اس کی روزانہ آمدنی کیا ہو گی؟''

''پانچ سات نہیں صاحب۔۔ پچاس ساٹھ کہئے''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔ یہ لوگ فلمیں دیکتے، اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے اور چرس افیون کا نشہ کرتے ہیں۔ بعض شہروں میں تو ان کے نہایت منظم گروہ ہیں۔ وہ ٹیلی ویژن پر آپ نے ڈرامہ نہیں دیکھا؟''

اس سے رہا نہیں جاتا۔۔ کہتا ہے

''دوسروں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا مگر اس کا تو مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔''

''آپ اسے جانتے ہیں ؟''

''ہاں '' وہ انکار نہیں کر سکتا ''یہ کی برسوں سے گاڑیوں میں بھیک مانگتا پھرتا ہے اور مشکل سے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے''

''بیوی بچے؟''

''ہاں۔۔ پہلے اس کی ٹانگیں سلامت تھیں ''

''پھر؟''

''پھر وہ مشین میں آ کر کٹ گئیں۔ اس کے بعد اُس نے گاؤں جانا چھوڑ دیا۔ ان کھیتوں کو دیکھ کر جن کے کنارے وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا اور ان تالابوں کو دیکھ کر جن میں وہ تیرا اور نہایا کرتا تھا اُسے اپنے اپاہج ہونے کا احساس شدید ہو سکتا تھا۔ شروع میں اس کی بیوی تھوڑے تھوڑے عرصے بعد بچوں کو ملانے کے لئے اس کے پاس لے آتی تھی مگر اب یہ وقفے طویل ہوتے جا رہے ہیں اور وہ انہیں دیکھنے کے لئے تڑپتا رہتا ہے۔ لیکن اس کی بیوی شاید ٹھیک ہی کہتی ہے۔ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں اور باپ کو اس حال میں دیکھ کر ان پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔''

''صاحب معاف کیجئے گا۔۔ آ پ کو اتنی بہت سی باتوں کا کیسے پتہ چلا؟''

''میں '' وہ کوئی جواب سوچنا چاہتا ہے مگر یہ دیکھ کر گھبرا جاتا ہے کہ سب لوگ اُسے شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک آدمی دوسرے کے کان میں کچھ کہتا ہے۔وہ سن تو نہیں سکا مگر سمجھ جاتا ہے۔کالے چشمے والا آدمی جو کسی سرکاری دفتر میں بڑے عہدے پر جائز معلوم ہوتا ہے چشمہ اُتار کر اس کی طرف گھورتا چلا جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے ''صاحب۔۔ معاف کیجئے آپ دونوں کی شکل بہت ملتی ہے!''

''وہ اور گھبرا جاتا ہے۔ اُسے اسی بات کا خدشہ تھا۔نفرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے

''شکل اس قدر ملتی ہے کہ لگتا ہے جیسے جڑُواں بھائی ہوں ''

''اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر آواز اس کے گلے میں پھنس جاتی ہے۔

''اچانک قریب سے دوسری گاڑی گزرتی اور وِسل سنائی دیتا ہے۔

اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔کیا دیکھتا ہے کہ دن نکل آتا ہے۔وہ حسب معمول یارڈ میں کھڑے پرانے ڈبے سے نکل کر پنجوں کے بل چلتا پلیٹ فارم کی طرف چل پڑتا ہے۔

***

گھر سے باہر ایک دن

اندر سخت تاریکی، گھٹن اور اس کی اپنی ہی سوچوں کا تعفن پھیلا ہوا تھا۔

اگر اس اندھیرے میں گھڑی کے ڈائل کی طرح چمکتا اس کی بیوی کا وجود نہ ہوتا تو وہ کب کا گھٹ کر مر گیا ہوتا۔ اس کی بیوی اپنے معطر بدن کے علاوہ جہیز میں اپنے ساتھ سلائی مشین بھی لائی تھی اور اب سلائی کرتے کرتے اس کی ہڈیوں پو لپٹا ہوا دھاگہ پتہ ہو چلا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کی خوبصورت کشتیوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو گئے تھے۔ وہ ایک عرصے سے گھر کر ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ وہ جب بھی باہر نکلنا چاہتا دیواروں سے لپٹا ہوا خوف اتر کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیتا لیکن پھر ایک روز اس کے پڑوس علی احمد نے اسے اپنے گھر بلا کر ہدایت کی کہ وہ پر منٹ کے لئے درخواست دے۔ اسے شک گزرا۔ کہیں علی احمد نے اس کی بیوی کی ڈبڈبائی آنکھیں نہ دیکھ لی ہوں۔ پھر بھی گھر کی تاریکی دور کرنے اور بیوی کو مشین بن جانے سے بچانے کے لئے اس نے شک کا گلا گھونٹ دیا اور درخواست دے دی۔ علی احمد کسی بڑے دفتر میں تھا اس نے اسے چند روز بعد دفتر میں آنے کی ہدایت کی اور وہ ایک صبح دیواروں سے اتر کر بازوؤں میں جکڑ لینے والے خوف سے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

گھرکی دہلیز سے آگے خلاء تھا۔ وہ دور تک مکڑی کی طرح اپنے ہی تاگے سے لٹکتا چلا گیا۔ پتہ نہیں زمین کہاں تھی--- تھی بھی یا نہیں۔ یا اس کے اندر تاکہ ختم ہو گیا تھا۔ بڑی دیر بعد اس کے پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرائے۔ شاید یہ زمین ہی تھی اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اس نے علی احمد سے ٹیلیفون پر وقت ے لیتا مناسب سمجھا۔ ٹیلی فون کرنے کے لئے دس دس پیسے کے سکوں کی ضرورت تھی۔ اس نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور ریز گاری تلاش کرنے لگا۔ وہ بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر دکاندار کے سامنے گڑ گڑایا مر اسے ریز گاری نہیں ملی۔ آخر ایک بھکاری سے د پیسوں کے عوض اسے ریز گاری مل گئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ بھکاری نے بیس یا تیس پیسے نہیں کاٹ لئے۔

ٹیلی فون بوتھ کی رف جاتے جاتے اس نے ایک راہ گیر سے وقت پوچھ لیا۔ راہ گیر رک گیا پھر اپنے گھڑی والے ہاتھ کو غرور سے اور اسے حقارت سے دیکھ کر بولا۔

’’معاف کیجئے۔ یہ گھڑی میں نے اپنے لئے فارن سے منگائی ہے‘‘

اسے ہنسی آ گئی۔ راہ گیر نے اس کا گریباں پکڑ لیا اور بولا۔

’’تم نے ضرور وقت دیکھ لیا ہو گا‘‘

اس کا جی چاہا وہ رو پڑے اور اسے بتائے کہ اسے وقت کا کچھ پتہ نہیں اور وقت کی چکنی دم زندگی بھر اس کے ہاتھ نہیں آئی مگر اس نے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ وہ گریباں راہ گیر کے ہاتھ میں چھوڑ کر بازار کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا مگر اس کا دل اس خیال سے مسرور تھا کہ اب بار بار گریبان میں جھانکنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی لمحے اس کی نظر آدمیوں کی ایک قطار پر پڑی۔ اس نے دیکھا قطار ہر لمحہ لمبی ہوتی جا رہی تھی اور اس سے پہلے کہ قطار اور لمبی ہو جاتی وہ بھاگ کر قطار میں شامل ہو گیا۔ پھر دیکھتے ہ دیکھتے اس کے آگے اور پیچھے اس کے آگے اور پیچھے ایک جیسی قطار لگ گئی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس نے قطار میں شامل ہونے کا سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ایک اچھا فیصلہ کی وجہ سے زندگی کی قطار میں کبھی ٹھیک جگہ پر کھڑا نہیں ہوا تھا اور تو اور شادی کے فوراً بعد وہ بیوی کو فلم دکھانے لے گیا تھا۔ مگر جب وہ کھڑکی تک پہنچا ٹکٹ ختم ہو گئے تھے۔ اگر اس کی بیوی جلدی سے مستورات والی کھڑکی سے ٹکٹ نہ خرید لیتی تو وہ پہلی اور آخری فلم کبھی نہ دیکھو سکتا۔

قطار آگے کھسک رہی تھی۔ ہر پانچ منٹ بعد ایک آدھ قدم کا فاصلہ طے کر کے اسے لگ رہا تھا کہ وہ چاند اور ستاروں کو چھو لینے کے لئے بلند ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ آسمان سے ستارے توڑ لائے اور اپنی بیوی کا دامن بھر دے۔ اس کی سمجھ میں یہ رات کبھی نہ آئی تھی کہ وہ ان ستاروں کا کیا کرے گی۔اس نے گھوم کر دیکھا۔ اس کے پیچھے قطار دور تک چلی گئی تھی۔ اس نے قطار کے اگلے سرے کا جائزہ لیا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ قطار میں صحیح مقام پر تھا لیکن اسی لمحے جیسے کسی ریلوے انجن نے پیچھے سے ٹکر ماری ہو بڑے زور کا دھکا لگا۔ اس نے بے حد منت سماجت کی مگر اسے دوبارہ قطار میں گھسنے نہیں دیا گیا کافی دیر تک وہ قطار کے باہر کھڑا رہا پھر بادل نخواستہ وہاں سے چل دیا۔ ایک بار اسے خیال آیا وہ پتہ تو کرے کہ قطار کس سلسلے میں لگی ہوئی تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ جب وہ قطار میں شامل ہی نہیں رہا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہاں مٹی کا تل ملتا ہے۔شکر ملتی ہے، آٹا ملتا ہے یا بس کے ٹکٹ ملتے ہیں۔ بس کے ٹکٹوں کا خیال آتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے سوچا کہ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ قطار سے باہر آ گیا ورنہ اگر وہ بس کے ٹکٹ خرید لیتا تو پتہ نہیں۔ بس اسے کس شہر میں اور کہاں لے جاتی!

ٹیلیفون بوتھ پر بھی قطار لگی تھی مگر وہ اتنی لمبی نہیں تھی۔ بوتھ کے اندر والا شخص ٹیلیفون پر کسی کو الجبرے کے سوال حل کرا رہا تھا۔ قطار میں شامل لوگ بھی اپنی اپنی نوٹ بکوں پر سوال حل کر رہے تھے اس کے پاس قلم تھا نہ نوٹ بک۔ نا چار اسے اپنی یاد داشت پر بھروسہ کرنا پڑا۔ پھر جب اندر والے نے سوال کا جواب لا

مساوی صفر نکالا تو باہر کھڑے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ اس کے پیچھے والے کا جواب لا مساوی سات تھا شاید اس لئے کہ وہ ساتویں نمبر پر کھڑا تھا۔ اس کے آگے والے کا اصرار تھا کہ لا مساوی پانچ درست جواب ہے۔ اس اختلاف نے جلد ہی جھگڑے کی صورت اختیار کر ل اور شاید صورت حال بے حد ناک ہو جاتی اگر کہیں سے ہوائی حملے کے خطرے کا سائرن نہ بجنے لگتا۔ اس اتنے معمول جھگڑے پر ہوائی حملے کا سائرن سن کر اسے حیرت ضرور ہوئی مگر حیران ہونے سے پناہ لیتا زیادہ بہتر تھا۔ اسے نہیں پتہ اندر والا اور باہر والے کدھر گئے اور کن پناہ گاہوں میں چھپے، وہ ٹیلیفون بوتھ کے عقب میں زمین پر چت لیٹا ہوا تھا اور اسے اپنی بیوی اور وہ بچے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے یاد آ رہے تھے اور اس کا دل خوف اور صدمے سے کانپ رہا تھا۔ اسی لمحے کوئی قریب سے گزرا اور ہنس کر بولا۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سائرن ٹیسٹ کئے جا رہے ہیں ''

اس کی جان میں جان آئی۔ وہ بھاگ کر ٹیلیفون بوتھ میں گھس گیا ور سکے ڈال کر نمبر ڈائل کرنے لگا جواب میں کسی خاتون نے اسے گندی گالی دی اور فون بند کر دیا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ کسی بہرے شخص نے ٹیلیفون پر پانچ سات مرتبہ ہیلو ہیلو کہا اور فون بند کر دیا۔ تیسری بار اس نے وقت بتانے والی انکوائری کا نمبر ملایا اور خوبصورت نسوانی آواز کا لطف اٹھانے لگا۔کافی دیر بعد جب باہر لمبی قطار لگ گئی اور طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں تو وہ گھبرا کر باہر آ گیا۔ باہر آ کر اسے یاد آیا اس نے وقت تو نوٹ ہی نہیں کیا۔

گھر سے نکلے اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور اب بھوک ستا رہی تھی وہ کسی سستے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتا تھا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ سستے ہوٹلوں پر مردہ گدھوں، گھوڑوں اور کتوں کا گوشت اور ناقص غذا فروخت رہتی تھی۔ اس لئے حکومت نے تمام سستے ہوٹلوں کو قانوناً بند کر دیا تھا اور اب شہر میں صرف مہنگے اور اعلیٰ درجے کے ہوٹل تھے جہاں عام آدمی ہفتے میں ایک وقت کا کھانا کھاتا اور باقی دن اس کی جگالی کر کے گزارتا تھا۔ یا پھر دودھ دہی اور مٹھائی کی دکانیں تھیں۔ جہاں گاہک کی آنکھوں کے سامنے دودھ میں پانی ملایا اور منہ مانگی قیمت وصول کی جاتی تھی۔ اعتراض کرنے پر پہلوان کڑچھا مار کر سر توڑ دیتے تھے۔ کھانے پینے کا خیال تک کر کے وہ علی احمد کے دفتر کی جانب چلنے لگا۔

دفتر کے صدر دروازے پر چوکیداروں کا پہرہ تھا۔ اس نے انا شناختی کارڈ دکھایا۔ شناختی کارڈ پر اس کی دو سال پہلے کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ دو سالوں میں اس کی صورت اس قدر مسخ ہو چکی تھی، اس کا اسے اس وقت پتہ چلا جب اسے مشکوک سمجھ کر گرفتار کیا جانے لگا۔ لیکن اسی لمحے دو میں سے ایک چوکیدار کی نظر اس کے شناختی کارڈ پر درج لفظ ''مور'' پر پڑ گئی۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

''مور کو حاضر کیا جائے''

مور جیسا قیمتی اور نایاب پرندہ وہ زندگی بھر حاضر نہیں کر سکتا تھا وہ پریشان ہو گیا لیکن پھر فوراً ہی اسے یاد آ گیا۔ اس نے آستین اوپر چڑھائی اور بازو پر کھدا ہوا مور دکھایا اور یہ جان کر کہ چوکیدار مطمئن ہو گیا ہے اور اس نے زندہ مور حاضر کرنے پر اصرار نہیں کیا، اسے اطمینان ہوا لیکن اسی لمحے دوسرے چوکیدار نے کہا۔

''ابے یہ تو مورنی ہے''

''مورنی کے اتنے بڑے پر نہیں ہوتے'' پہلے نے جواب دیا۔

''ہوتے ہیں یہ مورنی ہے''

''مور ہے''

''مورنی ہے''

''مور تمہارا چاچا لگتا ہے''

''مورنی تمہاری بے بے لگتی ہے''

دونوں نے ایک دوسرے پر مکے تان لئے۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور بھاگ کر اندر چلا گیا۔

کاریڈوروں میں چپڑاسی، فراش اور دفتری بیٹھے تاش کھیل رہے تھے ساتھ ساتھ دفتر کی چٹھیوں اور فائلوں پر تبصرے کر رہے تھے ا نے انہیں سلام کیا اور علی احمد کا پتہ پوچھا مگر کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا وہ خود ہی ایک ایک کمرے میں علی احمد کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کچھ لوگ حاملہ فائلوں کے بوجھ تلے پڑے کراہ رہے تھے کچھ موٹی موٹی لغاتوں میں کسی اجنبی زبان کے لفظوں کے ہجے اور معنی تلاش کر رہے تھے کسی کسی کوئی خاتون بھی نظر آ جاتی تھی جو بانجھ فائلوں کے انبار پر نیم دراز افسروں کے سروں کی مالش کرنے یا پاؤں میں گدگدیاں کرنے میں مصروف ہوتی۔

آخر اس چپڑاسی نے جس کی محلے میں اسٹیشنری کی دوکان بھی تھی اسے پہچان لیا اور علی احمد کے کمرے تک پہنچا دیا۔

علی احمد نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ پھر اس کی فائل منگائی اور بتایا کہ ضابطہ نمبر ۱۵ کی شق نمبر آٹھ کے جزو نمبر پانچ الف الف بے کی رو سے اس کی درخواست نامکمل ہے۔ ضابطے کی ترمیم نمبر ۱۱ کی رو سے اسے بیان حلفی اور ترمیم نمبر چھ جیم کی و سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ درخواست کے ساتھ منسلک کرنا ہو گا۔ نیز وضاحت نمبر ۹ اور نظر ثانی شدہ ترمیم نمبر چار کے تحت سرکاری خزانے

میں سو روپے فیس جمع کرانی ہو گی جو میں ہیڈ سات سو چھیاسی اور سب ہیڈ پینتالیس الف الف دال کے تحت جمع ہو گی۔

سو روپے کا نام سن کر وہ پریشان ہو گیا۔ علی احمد نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور بولا! ''کوئی بات نہیں میں خود جمع کرا دوں گا، اب تمہارے دن پھر جائیں گے مگر تمہیں معاہدہ کرنا ہو گا''

''کیسا معاہدہ؟''

''تمہاری ہر چیز میں میرا حصہ پچاس فیصد ہو گا''

ایک ناگوار سی سوچ، مکھی کی طرح اس کے چاروں طرف بھنبھنانے لگی اس نے پوچھا۔

''ہر چیز میں ؟''

''ہاں ہر چیز میں ''

اس نے فائل سے درخواست نکال کر پھاڑ دی اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار نے اسے ٹکر مار دی اور اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کی پسلیاں چٹخنے لگیں اور گھٹنے کے نیچے ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کار والا کار روک کر قریب آیا اور بولا ''حرام زادے اگر ڈانٹ پڑ جاتا تو؟''

اسے خون کی قے ہو گئی۔ کار والا ناک پر رومال رکھ کر اور نفرت سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ پھر ایک ٹیکسی قریب آ کر رکی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی حالت دیکھ کر کہا ''ہسپتال لے چلوں ؟''

''ہاں آپ بڑی مہربانی''

''مہربانی نہیں۔۔۔ پچاس روپے لگیں گے''

''ڈیڑھ دو میل سفر کے لئے یہ تو بہت زیادہ ہیں ''

''اس مہنگائی کے دور میں ایسے موقعوں پر ہی تو ہمیں بھی چار پیسے بچتے ہیں ''

''میرے پاس کل بیس روپے دس پیسے ہیں جو میری بیوی نے''

''چلو تم بیس روپے دس پیسے ہی دے دو۔ لیکن پیشگی۔ کیا پتہ تم راستے میں مر جاؤ اور جیبوں کی تلاشی لینے پر کچھ بھی نہ ملے''

’’ہسپتال کے بستر پر لیٹ لیٹے اس نے ڈاکٹر کی آواز سنی۔

سسٹر اس کی صرف ایک ٹانگ ٹوٹی ہے۔ ہوشیار رہنا کہیں آٹھ نمبر کی طرح یہ بھی بستر کی چادر اور تکیہ لے کر غائب نہ ہو جائے‘‘

پھر اس نے پانچ نمبر کی چیخ سنی ’’ہائے میرا گروہ‘‘

’’تمہارے گردے کو کیا ہوا ہے؟‘‘

’’پیٹ کے آپریشن کے دوران انہوں نے میرا گروہ چوری کر کے کسی اور کو لگا دیا ہے۔ ان کی ماں کی‘‘

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی ٹانگوں، کانوں، آنکھوں اور بازوؤں کو چھوا اور پھر یہ جان کر کہ اس کے تمام اعضاء موجود ہیں، اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔شام کو ہسپتال میں اور بہت سے سیریس کیس آ گئے تو انہوں نے اسے اچانک فارغ کر دیا۔ تاہم ایمبولینس کے ذریعے اسے اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔

وہ گھر پہنچا۔

اس کی بیوی جس کی ہڈیوں پر لپٹا ہوا دھاگہ ختم ہو چلا تھا مگر س کی ڈبڈبائی آنکھیں اندھیرے میں گھڑی کے ڈائل کی طرح چمکتی تھیں اسے اس حالت میں دیکھ کر رو پڑی۔ اس نے کہا ’’بھاگوان یہ رونے کا نہیں خوش ہونے کا موقع ہے۔ میں حادثے میں مر بھی تو سکتا تھا لیکن میں زندہ ہوں۔ اٹھو اور شکرانے کے نفل ادا کرو۔‘‘

***

غروب ہوتی صبح

عجیب دروغ بھری صبح طلوع ہوئی ہے کہ پتہ ہی نہیں چل رہا وہ جاگ گیا ہے یا ابھی تک سو رہا ہے۔ اگر وہ سو رہا ہے تو سامنے والی خالی کھڑکی اسے کیسے نظر آ رہی ہے اور اگر وہ جاگ رہا ہے تو اسے اپنے خراٹوں کی آواز کیسے سنائی دے رہی ہے۔ ان خراٹوں کے ساتھ ساتھ اسے ان شارکوں کا شور بھی سنائی دے رہا ہے جو اسے نظر تو نہیں آ رہیں مگر خالی کھڑکی کے چھجے پر بیٹھی عجیب و غریب آوازیں نکال کر آپس میں اظہار محبت کر رہی ہیں یا شاید لڑ جھگڑ رہی ہیں۔ اچانک اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ گہرے پانی میں غوطے کھانے لگتا ہے عجیب کیفیت ہے، وہ سوچتا ہے کہ وہ ڈوب بھی رہا ہے اور خود کو ڈوبتے ہوئے دیکھ بھی رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ ڈوب گیا تب بھی کچھ نہ کچھ بچ جائے گا۔ اسی لمحے آپس میں لڑتی جھگڑتی یا شاید چہلیں کرتی شارکوں میں سے ایک ایسی عجیب و غریب آواز نکالتی ہے جیسے ہنس رہی ہو۔ دوسری آہستہ سے کچھ کہتی ہے۔ پھر پہلی زور سے چلاتی ہے۔

’’جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ۔‘‘

اس کے بعد دونوں میں سے کوئی جیسی بھی آواز نکالتی اور کچھ بھی کہتی ہے، دوسری زور زور سے چلانے لگتی ہے۔ ’’جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ۔‘‘

پڑوس سے خوشی کے گیتوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ جواب میں شارکیں کورس میں جواب دیتی ہیں

’’مکر مکر مکر،دھوکا دھوکا دھوکا‘‘

شاید اب اس کا ذہن کچھ بیدار ہو گیا ہے کہ خراٹوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی اسے یاد آتا ہے رات وہ دیرتک اپنے پسندیدہ گیتوں کا کیسٹ لگا کر سنتا رہا تھا،وہ ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دباتا ہے

’’الفت کی نئی منزل کو چلا‘‘

مگر جونہی گیت ختم ہوتا ہے ایک شارک کی آواز سنائی دیتی ہے۔’’جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ۔‘‘

دوسری کہتی ہے ''دھوکا دھوکا دھوکا''

اس کے بعد وہ جو بھی گیت سنتا ہے۔ دونوں شارکیں یا ان میں سے کوئی ایک جھوٹ جھوٹ اور دھوکا دھوکا کی گردان کرنے لگتی ہے۔

وہ ٹیپ ریکارڈ بند کر دیتا ہے اور ریڈیو سے خبریں سنتا ہے۔ شارکیں اب بھی باز نہیں آتیں۔ وہ لیٹے لیٹے پاؤں کی ٹھوکر سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیتا ہے۔ پٹ کے زور سے بند ہونے کی آواز سن کر شارکیں اڑ جاتی ہیں۔ اب ہنسنے کی اس کی باری ہے۔

تکئے کے نیچے ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے۔ سگریٹ منہ میں لے کر سلگانے لگتا ہے مگر پھر اسے یاد آتا ہے کہ آج چھٹی کا دن ہے اور باؤ جی ابھی تک گھر پر ہوں گے۔ سگریٹ کی خوشبو سے انہیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ اس نے پھر سے سموکنگ شروع کر دی ہے۔ کیا مصیبت ہے وہ جھنجھلا کر سوچتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سگریٹ بھی نہیں پی سکتا۔ گردن کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھ کر لیٹ جاتا ہے اور دن بھر میں پیش آنے والے متوقع واقعات اور اپنی مصروفیت کا جائزہ لیتا ہے۔ ابھی جب وہ نیچے جائے گا۔ اسے بیکری سے انڈے اور ڈبل روٹی لانے کو کہا جائے گا پھر اسے سبزی یا گوشت کی دکان پر بھیج دیا جائے گا۔ مگر شاید آج نہیں کہ سب کا دوپہر کا کھانا پڑوس والوں کے ہاں ہے۔ البتہ جب وہ ناشتہ کر رہا ہو گا تو ہر ایک کو اپنے اپنے کام یاد آنے لگیں گے۔ فلاں کے ہاں سے سلے ہوئے کپڑے لا دو، فلاں کے گھر یہ پیغام دے آؤ۔ فلاں کو چھوڑ آؤ، فلاں کو لے آؤ۔ وہ موٹروں، تانگوں، بسوں، رکشاؤں اور ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے سائیکل سواروں سے بچتا بچاتا، بڑی مشکل سے ایک مہم سے واپس آئے گا تو اسے کسی دوسری مہم پر روانہ کر دیا جائے گا۔ اسے آج پہلی بارا حساس ہو رہا ہے کہ وہ یہ مہمیں سر کرتے کرتے اکتا چکا ہے اسے لگتا ہے جیسے وہ ان سب کا بیٹا، بھائی، دیور اور چچا نہیں زر خرید غلام ہے، باؤ جی تو پھر باپ ہیں انہوں نے اسے پیدا کیا ہے۔ اگرچہ کچھ احسان نہیں کیا۔ مگر حد یہ ہے کہ ان کے دوستوں کے دوست بھی اس پر حق رکھتے ہیں اور جب اور جہاں چاہتے ہیں اسے بیگار میں پکڑ کر بھیج دیتے ہیں، وہ جیب خرچ سے بچا کر چند لیٹر پٹرول موٹر سائیکل میں ڈلواتا ہے کہ کہیں گھوم آئے مگر اسے بھابی کا سندیسہ لے کر ان کے میکے جانا پڑ جاتا ہے اور جب وہ ان کے میکے جاتا ہے تو بھابی کی بھابی اسے اپنی بھابی کے ہاں کسی کام سے روانہ کر دیتی ہے اور تو اور منی اور پپو بھی اس پر حکم چلا لیتے ہیں۔ چچا ہمیں سیر کرا دو۔ ہمیں چڑیا گھر لے چلو، ہمیں آئس کریم کھلا دو۔

اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ وہ دکھ سے سوچتا ہے۔ گھر ہو یا دفتر ہر جگہ اس کے بہت سے آقا موجود ہیں جو اسے اپنا غلام سمجھ کر احکامات جاری کرتے رہتے ہیں۔ اور جیسے اس کی اپنی کوئی پسند یا مرضی نہ ہو۔اس کی اپنی کوئی شخصیت نہ ہو۔ہر کوئی اس پر اپنی پسند اور مرضی ٹھونسنا چاہتا ہے۔ گھر میں جو پکا ہے وہ کھانا پڑتا ہے جو دوسرے چاہیں وہ کرنا پڑتا ہے۔ دفتر کے جیسے بھی ضابطے ہوں یا ان میں کیسی بھی ترامیم ہوتی رہتی ہوں اسے موسٹ اوبیڈینٹ سرونٹ بن کر ان کی تعمیل

کرنا پڑتی ہے۔ تو کیا وہ اوروں کے احکامات بجا لانے اور ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے پیدا ہوا ہے؟ خود اس کا اپنے اوپر کوئی حق نہیں ! اسے کسی بات کا اختیار نہیں ! افسوس اس نے آج سے پہلے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ کسی کو اس کے جذبات و محسوسات جاننے کی پروا ہ نہیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ وہ انہیں بتائے گا کہ اس کی اپنی آزاد اور خودمختار شخصیت ہے اور کسی کو اس کی آزادی سلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ چونکتا ہے منی اخبار لے کر اندر آتی ہے اور تپائی پر رکھ کر چلی جاتی ہے وہ اخبار اٹھا کر شہ سرخی پڑھتا ہے۔ شاید شارکیں کہیں پڑوس کے کسی چھجے پر جا بیٹھی ہیں دور سے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

’’جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ۔‘‘

وہ اخبار اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا ہے اور سگریٹ سلگا کر پینے لگتا ہے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا ہو اپنے بہت سے آقاؤں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا ہو اسی لمحے سامنے کے مکان کے چھجے پر ایک موٹا تازہ کوا آ بیٹھتا ہے اور بلند آواز سے کہتا ہے ’’دروغ‘‘

وہ اٹھ کر کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی بند کر دیتا ہے۔ پٹ بند ہونے کی آواز سے کوا اڑ جاتا ہے لیکن اسے لگتا ہے جیسے وہ چھجے سے اڑ کر اس کے اندر کی کسی منڈیر پر آ بیٹھا ہو اور اس کی ہر بات اور سوچ پر دروغ دروغ کی رٹ لگا کر پانی پھیرنے لگا ہو۔

تب بھابی اندر آتی ہیں اور ایک نظر اسے دیکھ کر کمرے میں بکھری چیزوں کو ٹھیک کرنے لگتی ہیں، وہ اخبار میں پناہ لیتا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ ’’اچھا ہوا تم جلدی اٹھ گئے، ناشتہ کر کے مجھے آپا کے ہاں سے کپڑے لا دو انہوں نے ٹانک دئیے ہوں گے؟‘‘

اس کا جی چاہتا ہے وہ ان سے پوچھے کہ کپڑے کس کے ہیں ؟ لیکن پھر اسے خیال آتا ہے کہ جب اسے لا کر دینے ہی نہیں ہیں تو اسے اس سے کیا غرض کہ کپڑے بھابی کے اپنے ہیں یا انہوں نے پڑوس والوں کے لئے بنائے ہیں۔

’’بھابی آپ کسی اور سے منگوا لیجئے مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔‘‘

’’ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا ہے تجھے آج کے دن؟‘‘

’’کیوں آج کیا کوئی انوکھا دن ہے؟‘‘

وہ اس کی طرف غور سے دیکھتی ہیں تو اسے شک گزرتا ہے کہیں اس کی آواز بھرّا تو نہیں گئی تھی!؟

''آج۔ تمہیں پتہ تو ہے بھیا۔ آج کیا ہے۔ پڑوس میں تمہاری ضرورت ہو گی۔''

''میری کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔''

''پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ محلے داری ہے آخر''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ رکھائی سے کہتا ہے۔ ''آج مجھے فراغت نہیں''

بھابھی کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر کہتی ہیں :

''تم مرد لوگ بہت بے حوصلہ ہوتے ہو اور خود غرض بھی۔''

''کیا مطلب؟''

''ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو اور بے چاری عورت۔''

''پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ رات تمہارے بھائی جان کے سر میں درد تھا۔ ساری رات خود سوئے نہ مجھے سونے دیا۔ حالانکہ جب کبھی رات کو مجھے پتے کا شدید درد بھی ہوتا ہے میں محض اس لئے ہائے وائے نہیں کرتی کہ ان کی نیند خراب نہ ہو۔''

''آپ بھائی جان کا غصہ مجھ پر اتار رہی ہیں ! کیسے ہیں وہ؟''

''اب مزے سے سو رہے ہیں مجھے سر درد میں مبتلا کر کے۔''

''اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دے۔ لیکن اس خیال سے کہ بات بڑھ نہ جائے وہ نرم لہجے میں کہتا ہے۔''

''میں جلد واپس آ جاؤں گا۔''

''اچھا چلو نہا دھو کر ناشتہ کر لو۔''

''میں ناشتہ بھی وہیں کروں گا۔ مجھے جلدی ہے۔''

''اچھا جیسے تمہاری مرضی۔ مگر موٹر سائیکل نہ لے جانا۔ تمہارے بھائی جان کو ضرورت ہو گی۔''

''جی اچھا۔''

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتا ہے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتا اور باہر جانے لگتا ہے اس کی والدہ کہتی ہیں :

''جلدی آ جانا بیٹے۔ بہت سے کام ہیں۔''

''کام کام کام'' وہ زیر لب بڑبڑاتا ہے اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل جاتا ہے گلی میں ابھی سے بہت شور اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی ہے۔ شامیانے لگ رہے ہیں۔ قناتیں تانی جا رہی ہیں۔ پیاز چھیلے جا رہے ہیں اور اینٹیں جوڑ کر بڑے بڑے چولہے بنائے جا رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی کوئی اسے آواز دے کر بلا لے گا۔ وہ جلد از جلد ان آشنا لوگوں اور آوازوں سے دور چلا جانا چاہتا ہے۔

تھوڑی دور جا کر گلی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے وہ پہلے دائیں جانب کو قدم بڑھاتا ہے پھر کچھ سوچ کر بائیں جانب کو مڑ جاتا ہے۔ ابھی دکانیں نہیں کھلیں۔ ویسے بھی آج چھٹی کا دن ہے صرف دودھ دہی، بیکری، قصاب اور حجاموں کی دکانیں کھلی ہیں۔ دینو حلوائی کی دکان پر نہاری اور حلوہ پوری خریدنے والوں کا ہجوم ہے۔ اس کا جی نہاری کھانے کو چاہتا ہے مگر وہ جلد از جلد اپنی آزادی میں مخل ہونے والے جان پہچان کے لوگوں سے دور نکل جانا چاہتا ہے۔

سڑک پر پہنچ کر اپنی طرف والے بس اسٹاپ پر کھڑا ہو جاتا ہے مگر پھر یہ دیکھ کر کہ دوسری جانب والی بس پہلے آ گئی ہے۔ وہ سڑک پار کر کے جلدی سے بس پر سوار ہو جاتا ہے۔ بس کنڈیکٹر ٹکٹ کے لئے کہتا ہے تو فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس جگہ کا ٹکٹ خریدے لیکن ساتھ والا مسافر ریلوے سٹیشن تک کا ٹکٹ مانگ کر اس کی مشکل آسان کر دیتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے فٹ پاتھ پر چلتے ایک میلا کچیلا لڑکا جس کے جسم پر صرف ایک قمیص ہے۔ اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

''کیوں مانگتے ہو؟''

''بھوکا ہوں۔''

''کیوں بھوکے ہو؟''

''میرے ماں باپ نہیں ہیں۔''

''اچھا ہے نہیں ہیں۔'' وہ کہتا ہے۔ ''اگر ہوتے تو تم اپنی مرضی سے بھیک بھی نہیں مانگ سکتے تھے''

وہ لڑکے کو کچھ پیسے دیتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر بہت رونق ہے۔ لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ انکوائری سے معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ قلیوں کو پیسے دے رہے ہیں۔ عزیز و اقارب سے گلے مل رہے ہیں۔ وہ مختلف گاڑیوں کے اوقات اور کرائے نامے پڑھنے لگتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کسی اپ ٹرین میں بیٹھ کر چچا کے ہاں چلا جائے۔ لیکن پھر اس خوف سے

کہ اس کے پاس اپنی چچا زاد کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں، وہ ارادہ بدل لیتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ کسی ڈاؤن ٹرین کے ذریعے ماموں کے ہاں چلا جائے۔ مگر پھر اسے ممانی کی تیوری کے بل یاد آ جاتے ہیں اور وہ کچھ بھی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر آ جاتا ہے اور ایک پورا چکر لگاتا ہے پھر چائے کے اسٹال پر کھڑے ہو کر ناشتہ کرتا ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ایک بنچ پر آ بیٹھتا ہے اور گاڑی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی آ جاتی ہے۔ وہ ہجوم سے ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور چڑھنے اور اترنے والوں کو خالی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے پھر جب گاڑی چلی جاتی اور پلیٹ فارم خالی ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ اسی بنچ پر آ بیٹھتا ہے اور دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں سوچ کا ایک چیونٹا کلبلاتا ہے کہ جب اسے معلوم ہی نہیں کہ اسے کہاں جانا ہے تو وہ ایک گاڑی کے چلے جانے کے بعد دوسری اور پھر تیسری گاڑی کا انتظار کیوں کر رہا ہے۔ وہ اٹھ کر ریلوے اسٹیشن سے باہر آتا ہے۔ چوک پر پہنچ کر کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر بڑے بازار کی طرف چل دیتا ہے۔

تھوڑی دور جا کر اسے اپنا ایک دوست مل جاتا ہے علیک سلیک کے بعد وہ اس سے ضروری کام کا بہانہ کر کے جلد جلد رخصت ہوتا ہے۔ اور کھلی اور بند دکانوں کے آگے سے گزرتا بڑے چوک پر آ جاتا ہے۔ یہاں پرانی کتابوں کے اسٹال ہیں وہ ایک اسٹال پر رک کر کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے۔ پھر دو رویہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلنے لگتا ہے۔

چڑیا گھر کا بورڈ دیکھ کر رک جاتا ہے پھر ٹکٹ خرید کر چڑیا گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ چڑیا گھر میں جانوروں اور پرندوں کو کٹہروں اور پنجروں میں بند دیکھ کر اس کا دم سا گھٹنے لگتا ہے وہ جلد از جلد اس ماحول سے نکل جانا چاہتا ہے کہ شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ شیر کی آواز سن کر چاروں طرف سے تماشائی اس کے کٹہرے کے سامنے جمع ہونے لگتے ہیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ شیر فرش پر بیٹھا تماشائیوں کے ہجوم اور قید کی ایک جیسی زندگی سے اکتا کر زور زور سے دھاڑ رہا ہے وہ تماشائیوں سے جس قدر بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اتنے ہی زیادہ تماشائی جمع ہو جاتے ہیں پھر ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ شیرنی اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور اس کے قریب آ کر اپنا سر اس کے سر سے رگڑتی ہے جیسے دلاسہ دے رہی ہو اور شیر کی آواز رفتہ رفتہ تھم جاتی ہے۔ اسے بھابی کی بات یاد آتی ہے کہ تم مرد لوگ بہت بے حوصلہ ہوتے ہو۔ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو اس کا جی چاہتا ہے تمام پنجروں کے پٹ کھول کر چڑیا گھروں کے سبھی جانوروں اور پرندوں کو آزاد کر دے مگر پھر اسے کمزور جانوروں کا خیال آتا ہے جو کٹہروں سے نکلتے ہی طاقتور درندوں پرندوں کا لقمہ بن جائیں گے۔ وہ آگے بڑھتا اور ہرنیوں کو ریلنگوں اور خاردار تاروں سے گھرے جنگلے میں بے فکری سے ٹہلتے دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ جنگل کی نسبت یہاں کس قدر محفوظ ہیں۔ کسی چیتے کی گھات کا ڈر نہ کسی شکاری کی بندوق کا خوف، تو کیا کمزوروں کی بقا صرف قید اور غلامی میں ہے۔ وہ آزادی کا

ایک دن بھی چین اور اطمینان سے نہیں گزار سکتے؟ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا اور جھنجھلا کر باہر نکل آتا ہے۔

دوپہر ڈھلنے لگی ہے اور اسے بھوک ستا رہی ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ پھر سگریٹ کے کش لگاتا ہوا باہر آتا اور سڑک کے کنارے ایک اونچی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگاتا اور گزرنے والی گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں پڑھنے لگتا ہے۔

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ وہ حساب لگا کر دیکھے ایک گھنٹے میں مختلف اقسام اور ماڈلوں کی کتنی گاڑیاں وہاں سے گزرتی ہیں۔ اس سے چوبیس گھنٹوں میں وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں کا اوسط نکالنے میں آسانی رہے گی۔ پھر وہ ایک ماہ اور پھر ایک سال کا اوسط نکالتا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ان اعداد و شمار کا کیا کرے؟

دیوار پر چڑھ کر بیٹھے بیٹھے اور گاڑیوں کی تعداد گنتے گنتے سہ پہر ہو جاتی ہے، درختوں کے سائے لمبے ہو جاتے اور گرمی کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ وہ ایک طرف کو سایہ دار درختوں کے نیچے چلتا رہتا ہے اور شہر کی سب سے بڑی سیر گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ سیر گاہ میں خوش لباس لوگ اور خوبصورت بچے ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اسے بچے اچھے لگتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مصنوعی آبشاروں سے گرتا پانی اور چاروں طرف کھلے ہوئے رنگ برنگ خوشنما پھول دیکھ کر اس کے اندر کی گھٹن کم ہونے لگتی ہے۔ اسی لمحے ایک خوبصورت عورت اس کے قریب سے گزرتی ہے اور اسے میٹھی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ یقیناً وہ بھی اس کی طرح تنہا اور ویران ہو گی اور اس نے بھی انہی دنوں اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا ہو گا۔ مگر پھر اسے مصنوعی جھیل کی طرف پرواز کرتے پرندوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

''مکر مکر مکر''

''جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ۔''

''ریا۔ ریا۔ ریا''

''دروغ۔ دروغ۔ دروغ۔''

اس کے اندر درد کی ٹیسیں جاگتی ہیں۔ وہ پھولوں اور بچوں کی طرف توجہ دینا چاہتا ہے۔ مگر درد کی ٹیسیں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ وہ تھکے ہوئے پاؤں اٹھاتا مین گیٹ کی طرف چل دیتا ہے۔

اس کی جیب میں کرایہ موجود ہے لیکن وہ پیدل چلتا ہے۔ سڑکوں بازاروں اور گلیوں میں گھومتا مکانوں پر لگی نیم پلیٹوں اور دکانوں کے سائن بورڈ پڑھتا چلتا رہتا ہے۔ پھر اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے وہ دروغ بھرے دن کے غروب ہونے پر

اپنے گھر کی گلی میں داخل ہو گیا۔ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکتا ہے پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلنے لگتا ہے۔ گلی میں آوارہ کتے جگہ جگہ ہڈیاں چچوڑ رہے ہیں۔ شامیانے اور قناتیں ہٹائی جاچکی ہیں اور اس کے گھر کے سامنے والے چھجے پر کوئی پرندہ موجود نہیں ہے۔ وہ تھکا ہارا نڈھال سا گھر میں داخل ہوتا ہے تو سب لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

''کہاں تھے تم؟'' والدہ پوچھتی ہیں۔

''سارا دن کہاں غائب رہے؟'' بہن کہتی ہے۔

''ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا تھا؟'' بھائی گرجتا ہے۔

باؤ جی غصے میں کمرے سے باہر آتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''صبح کے گئے ہوئے تم پورا دن ضائع کر کے اب آر ہے ہو تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

''شرم کس بات کی باؤ جی۔'' وہ غصے سے کہتا ہے۔ ''کیا مجھے اپنی زندگی کا ایک دن بھی اپنی مرضی سے گزارنے یا ضائع کرنے کا اختیار نہیں ''

بھابی قریب آتی ہیں اور چڑیا گھر کی شیرنی کی طرح اس کے سر کے ساتھ اپنا سر جوڑ کر کہتی ہیں۔ ''تم تو مرد ہو دل بڑا کرو بھیا۔۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اب کیا رہ گیا ہے جو ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ ضبط کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر کئی دنوں کا روکا ہوا رونا ضبط کے سارے بندھن توڑ دیتا ہے۔ گھر کے لوگ سہم جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں ان پوچھے سوالوں کا جواب تلاش کرنے لگتے ہیں۔

***

ہاری ہوئی جیت

ریلوے اسٹیشن پر ایسی بھیڑ تھی جیسے آج شہر کی ساری خلقت کو سفر درپیش ہو۔

پلیٹ فارم پر بے شمار بوگیوں والی گاڑی آدمیوں عورتوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور انجن لگنے کا انتظار کر رہی تھی۔اس کے پاس واپسی کا ٹکٹ موجود تھا وہ متعلقہ بوگی میں سیٹ نمبر تلاش کر کے کھڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا تھا اور حالانکہ ابھی رخصتی میں چار مہینے پڑے تھے۔مگر وہ آنے والے اس لمحے کا تصور کر کے آبدیدہ ہو گیا۔

گاڑی میں سوار ہوتے ہی اس کا ذہن رواں ہو گیا اور بیس بائیس برس پہلے کا وہ دن یاد آنے لگا تھا جب اسے اسی شہر سے اس کی ولادت کی اطلاع ملی تھی۔اس سے پہلے وہ بیٹے کی پیدائش کی خوشی کا ذائقہ چکھ چکا تھا مگر بیٹی کی پیدائش کی خبر میں ایک اور طرح کی خوشی اور عجیب سا احساس چھپا ہوا تھا جس کی صحیح نوعیت وہ نہ جانتا تھا۔اسے لگتا جیسے وہ اچانک معزز اور مکمل ہو گیا ہو اس کے سر پر فضیلت کی دستار بندھ گئی یا جیسے اس پر بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ آ پڑا ہو۔خوشی کے ساتھ ساتھ آزاد ی چھننے اور پابندی لگنے کا احساس۔

اسے یاد آیا وہ دن بھر اسی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔اس کا اصل نام تو جو بہت خوبصورت اور انوکھا ہو گا خوب سوچ سمجھ کر رکھنا ہو گا مگر تب تک اسے کس نام سے پکارا جائے۔چندا،تارا،رانی۔گڈّی،چھوٹی، بے بی،نکی،بلی، مانو؟اس نے کتنے ہی نام سوچے مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔پتہ نہیں وہ کیسی ہو گی؟کس پر گئی ہو گی ؟اسے پیغام براہ راست نہیں ملا تھا اس لئے وہ کچھ پوچھ اور جان نہ سکا تھا وہ کیسی تھی۔ اس کا بیٹا اس کی کاربن کاپی تھا مگر پتہ نہیں وہ اپنی تیکھے نقوش والی ماں پر گئی تھی یا اپنے گول مٹول سے بھائی پر۔ اس کا دل اسے دیکھنے کو بے تاب ہونے لگا۔کاش وہ اسے فورا!دیکھ سکتا مگر دفتر سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔وہ بار بار اس کے چہرے کا تصور کرتا۔اپنی اور بیوی کی صورتوں کو ملا کر ایک نئی طرح کی تیسری صورت تراشتا مگر زیادہ غور کرنے سے وہ تازہ تازہ تخلیق کیا ہوا چہرہ دھندلا سا جاتا اور کوئی واضح صورت ذہن میں محفوظ نہ رہ پاتی۔پھر جب کئی روز بعد اس نے اسے لاہور جا کر دیکھا تھا تو پریشان ہو گیا تھا۔غریب آدمی کے لئے ایسی بیٹی ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ کچھ دنوں بعد وہ اپنی ماں کے ہمراہ اپنے گھر آ گئی تھی اور یہ جانے بغیر کہ وہ اپنے باپ کی شفیق گود میں ہے معصوم ہنسی کے پھول کھلانے لگی تھی۔اس کی قلقاریوں سے اس کا دل اور گھر آباد ہو گئے۔پھر آنگن میں ہر سو اس کی توتلی باتوں کے جگنو اور مسکراہٹوں کی تتلیاں اڑنے لگیں۔پھر وہ گڑیوں سے کھیلنے اور ان کے بیاہ رچانے لگی اور وہ اس کے لئے طرح طرح کی گڑیاں کھلونے اور ملبوسات لاتا رہتا تھا اور جب وہ باہر سے تھک کر گھر آتا اور وہ ''میلے ابو آ گئے ''کا ورد کرتی،خوشی سے اچھلتی اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتی اس کے کندھوں پر چڑھ جاتی تو سارے دن کی تکان لمحہ بھرمیں دور ہو جاتی۔ زندگی کی ساری کلفتیں راحتوں میں تبدیل ہو جاتیں اور اس کا گھر محبت کے پھولوں سے مہکنے لگتا۔ کاش وقت رک جاتا اور زندگی اسی طرح بیت جاتی مگر وقت کبھی رکتا ہے۔رفتہ رفتہ وہ بڑی ہوتی گئی اور وہ ا س کے بچھڑنے اور گھر سے چلے جانے کے غم میں مبتلا رہنے لگا۔اس کی بیوی بہت ہی گرہستن اور منتظم قسم کی عورت تھی۔اس نے ابھی سے جب وہ میٹرک میں تھی اس کی رخصتی کی تیاری شروع کر دی تھی اور اسے طعنے دیتی اور یاد دلاتی رہتی تھی کہ اسے بیٹی کی کوئی فکرنہیں تھی۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ اس کے بچھڑنے کے خیال سے اس کی نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔(ہائے او میریا ڈاہڈھیا ربا۔کنھاں جمیاں کنھاں نے لے جانیاں)۔ مگر جب تک وہ سکول اور کالج جاتی رہی جدائی کے خیال کی ناگن جیسے پٹاری میں بندرہی۔مگر جس روز وہ بی اے کا آخری پرچہ دے کر آئی وہ رات اس نے زہریلے کانٹوں پر گزاری تھی۔ اس نے اس کے سارے چھوٹے چھوٹے کام اپنے ذمے لے رکھے تھے۔وہی اسے بتاتی اس کے کپڑے اب میلے ہو گئے ہیں اور اسے دھلائی کے لئے اتار دینا چاہئیں۔وہ اسی کے مشورے پر عمل کرتا کہ اسے کون سے موقع پر کون سا لباس پہننا چاہئے۔اس کی پسند کی چیزیں پکاتی،اسکے کپڑے دھوتی،استری کرتی، قمیض کا ٹوٹا ہوا بٹن لگاتی اور اس کی چیزوں اور کتابوں کو سنبھال کر رکھتی۔اسے گھر میں جس چیز کی ضرور ت ہوتی وہ اسے آواز دیتا۔اس کی بیوی بڑبڑاتی

''کبھی خود بھی اٹھ کر کچھ کر لیا کرو''

مگر دوسرے ہی لمحے نازو اس کی مطلوبہ چیز لئے سامنے کھڑ ی ہوتی۔اس نے سچ مچ اسے کاہل اور نکما بنا دیا تھا۔ وہ اس کے بغیر اپنے گھر کا تصور کرتا تو اسے ہول آنے لگتا۔ ایسا لگتا جیسے اسے دیکھے بغیر صبح طلوع نہ ہو گی۔اس کے ہاتھ کی روٹی کے بغیر بھوک نہ مٹے گی۔اس کی آواز سنے بغیر چین نہ آئے گا۔اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا اور کرتا۔ایک بار کہنے لگا:

''جب تم بیاہ کر اپنے گھر چلی جاؤ گی میں تمہارے گھرکے پاس ہی کرائے کا گھر لے لوں گا۔اور دن بھر دروازے پر بیٹھا رہا کروں گا۔کیا پتہ تمہیں کب ضرورت کی کوئی چیز منگانا پڑ جائے''

اس نے تو یہ بات یوں ہی دل لگی کی خاطر کی تھی مگر وہ پہروں روتی رہی۔''ابو مجھ سے اتنا پیار نہ کیا کرو۔میں کیسے جیوں گی''

اس کی بیوی اس کی اسے طعنے دیتی ''شادی کا سارا خرچہ تو بیٹا کر رہا ہے تم صرف باتیں کئے جاؤ''

یہ ٹھیک تھا کہ اس نے بہن کے جہیز کی تیاری میں خوب ہاتھ بٹایا بلکہ اپنی شادی پس پشت ڈال دی تھی مگر بیٹے کی کمائی میں اس کا بھی تو کچھ حصہ ہو گا۔آخر اس کی پڑھائی بھی تو اسی کی آمدنی سے ہوئی تھی مگر وہ اسے نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔کیا پتہ ساری بیویاں جب ان کے ہونہار بیٹے جوان ہو جائیں شوہروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی ہوں۔ اس نے تو اس کی شادی طے کرتے وقت بھی من مانی کی تھی ورنہ وہ ایسے لالچی لوگوں سے کبھی رشتہ نہ جوڑتا اور اب وہ جلد از جلد شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھی اور اسی نے ا سے شادی کی کوئی قریبی تاریخ مقرر کرنے کے لئے بھیجا تھا۔مگر اسے فتح محمد کا مطالبہ پورا کرنے کے لئے مزید چار ماہ کی مہلت مانگنا پڑ گئی۔مگر وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا وہ ناراض ہو گی اور اسے جلی کٹی سنانے کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔مگر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ روپوں کا انتظام کر کے ہاری ہوئی بازی جیتنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔اسے ریلوے اسٹیشن کی چہل پہل میں فتح محمد کی وہ سرگو شی بار بار یاد آئی جو اسے صور پھونکے جانے کی طرح معلوم ہوئی تھی۔

'' ہم انتظار کریں گے''

اس نے فتح محمد کے آگے سر جھکا دیا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا مگر اسے نہیں معلوم تھا وہ اس کا اتنا بڑا مطالبہ کیسے پورا کرے گا۔اس کے چلے جانے کے کتنی دیر بعد تک وہ زمین میں گڑا رہا۔اور گھر کی بیچی جانے والی چیزوں کی فہرست بناتا رہا۔جب انجن آ کر گاڑی سے لگا وہ بہت سی چیزیں بیچ چکا اور اب میزان کرنے میں مصروف تھا۔زور کا دھکا لگنے سے منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔بعض دوسرے مسافر جو غفلت اور بے خیالی میں بیٹھے تھے سیٹوں سے نیچے گر گئے۔مگر زیادہ تر مسافروں کو یہ دھکا خوشگوار معلوم ہوا اس کا مطلب تھا انتظار ختم ہو ا اور منزل کی طرف روانہ ہونے کا وقت قریب آ گیا۔

ہر مسافر کو منزل پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے اور وہ اپنے سفر کا آغاز دعاؤں سے کرتا ہے۔بعض دور اندیش اور ہوشیار آدمی اللہ سے اگلے پچھلے سارے گناہوں کی معافی مانگ لیتے اور آئندہ کے لئے توبہ بھی کر لیتے ہیں۔کیا پتہ یہ آخری سفر ہو اور کوئی حادثہ ہو جائے اور موقع نہ ملے مگر اللہ کو پتہ ہوتا ہے۔کس کس کی نیت میں کھوٹ ہے اور کن لوگوں نے منزل پر پہنچتے ہی سب کچھ بھلا دینا ہے مگر وہ رحیم اور کریم پھر بھی ڈھیل دیتا رہتا ہے۔

رات کا وقت تھا اور سخت سردی پڑ رہی تھی۔کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آتے تو مسافر کپکپانے لگتے۔مگر گاڑی ابھی روانگی کے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ اس کے ڈبے میں آگ لگ گئی

اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلے اٹھنے لگے۔ رفتار زیادہ ہونے کی وجہ سے ہوا سے بھڑکتی آگ ایک ڈبے سے دوسرے کو لگتی چلی گئی۔ اور تھوڑی سی دیر میں پوری بوگی دھڑ دھڑ جلنے لگی۔اب جہاں بڑے بڑے قومی سانحات پیش آنے کے اسباب کا کبھی پتہ نہ چل سکا ہو وہاں اس چھوٹے سے حادثے کی کیا حیثیت ؟ اس لئے شاید ہی کبھی پتہ چل سکے کہ آگ کیسے لگی۔باہر سے آئی یا اندر سے لگی جیسے کبھی کبھی گھر کو گھر کے چراغ سے لگ جاتی ہے۔کیا معلوم کوئی چلم الٹ گئی۔کسی نے سگریٹ بجھانے میں لاپرواہی کی۔کسی نے سردی سے گھبرا کر موت کو گلے لگا لیا۔ کوئی سٹوو یا گیس سلنڈر پھٹ گیا یا کسی نے سامان یا سیٹ کے نیچے بم رکھ دیا تھا۔ممکن ہے کسی مسافر کے سامان میں جلدی آگ پکڑنے والی کوئی چیز موجود ہو مگر یہ ضروری بھی نہیں۔کیونکہ جب ایک بار آگ لگ جائے تو پھر ہر چیز اس کا ساتھ دیتی اور اس کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔لوہے جیسی سخت چیز بھی آگ کے آگے نرم پڑ جاتی ہے بلکہ آگ سے زیادہ جلانے والی چیز بن جاتی ہے۔

آگ لگنے سے ہر ڈبے میں قیامت مچ گئی۔شور و غل،افراتفری اور نفسا نفسی۔لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے اور کچلتے ہوئے کھڑکیوں دروازوں کی طرف لپکے۔سردی اور رات کی وجہ سے زیادہ تر کھڑکیاں دروازے بند تھے جنہیں کھولنے کے لئے کتنوں کو جانوں کا نذرانہ دینا پڑا۔ دروازے تو پھر بھی کچھ لوگوں کو کچل اور دھکیل کر کھل گئے۔مگر کھڑکیاں مشکل اور دیر سے کھلیں۔جس نے بھی کھولنے کیلئے ہاتھ یا سر باہر نکالا اس کا ہاتھ یا سر دھڑ سے الگ ہو کر باہر ہی رہ گیا۔ جس کسی کو آگ ایک بار پکڑ لیتی وہ دوسروں کیلئے بم بن جاتا۔مگر اس سے بچنے کا راستہ نہ ملتا۔دھکے لگنے سے چیخیں مارتے لوگ اس کے اوپر آ گرتے اور خود بم بن جاتے۔کچھ بچے قدموں کے نیچے آ کر کچلے گئے۔بعض کو انکی ماؤں نے تب تک اپنے نیچے پناہ دیئے رکھی جب تک وہ خود لاشوں کے پہاڑ کے نیچے آ کر دب نہ گئیں یا چولھے کی جلتی لکڑی بن کر جلنے نہ لگیں۔بعض عورتوں نے بچوں کو چلتی گاڑی سے باہر پھینکنے کی کوشش کی مگر شاید ہی کوئی سالم باہر آ سکا۔زیادہ تر بچوں کے ٹکڑے ہی باہر گرے۔جن لوگوں کو باہر دھکیلا یا پھینکا گیا یا جنہوں نے خود چھلانگیں لگائیں ان میں سے بھی بہت کم زندہ بچے۔کیونکہ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔دوسرے گاڑی بہت تیز بھاگ رہی تھی۔جو گرتا یا کودتا سخت زخمی ہو جاتا۔بعض گاڑی کی لپیٹ میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ اور اگر کوئی گاڑی کے نیچے آ کر کٹنے سے بچ بھی جاتا وہ زخمی ہو کر فوراً یا کچھ دیر بعد سردی سے ا کڑ کر مر جاتا۔بچوں،عورتوں،بوڑھوں اور کمزوروں میں سے اسکے سوا شاید ہی کوئی زندہ بچا ہو۔زیادہ تر جل کر راکھ ہو گئے یا دوسروں کی لاشوں کے نیچے دب کر لاش بن گئے۔ اسے یاد ہے بھیڑ اسے روند رہی تھی جب کوئی سخت چیز اس پر گری اور وہ جل کریا دب کر مر نے سے بچ گیا۔مگر ناقابلِ بیان حدت کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا۔

اسے ہو ش آیا تو کچھ دیر کے لئے وہ فیصلہ نہ کر سکا،زندہ ہے یا مر چکا۔ اور اگلی یا پچھلی کون سی دنیا میں ہے۔وہ دیکھ سکتا تھا نہ اپنے جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت دے سکتا تھا۔پتہ نہیں جسم تھا بھی یا نہیں ؟کیا پتہ اب وہ محض روح

کی صورت باقی بچا ہو اور اس کا حساب کتاب ہونے والا ہو۔پھر اسے کراہنے والوں کی ایسی باتیں سنائی دیں جیسے جہنم کہیں قریب ہی ہو اور گناہ گاروں کو عذاب دیا جا رہا ہو مگر پھر پچھلے جہان کے آدمیوں جیسی دو آوازیں سنائی دیں۔وہ حادثے کی انکوائری کی باتیں کر رہے تھے۔جس کا صاف مطلب تھا وہ مرا نہیں زندہ ہے۔مگر شائد ہسپتال میں پڑا اور بہت سی نلکیوں،نالیوں اور پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے۔پتہ نہیں اس کا جسم کس حالت میں ہے اور اس کا زندہ بچنا خوش نصیبی کی بات ہے یا بدنصیبی کی؟۔اسے ہمیشہ سے اپاہجوں کی سی زندگی جینے سے جس میں آدمی دوسروں کا محتاج ہو بہت ڈر لگتا تھا۔ ایسے جینے کو وہ مرنے سے بدتر سمجھتا تھا۔مگر کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس کے کون کون سے اعضا ساتھ ہیں اور کون سے کٹ گئے۔

اسے اپنے گھرکے لوگ یاد آئے۔ بیٹا جس کی شادی کی خوشی دیکھنے کا اسے بہت ارمان تھا مگر اس نے بہن کی خاطر اسے موخر کر دیا تھا۔نازو جس کے بیاہ کی تاریخ لینے وہ گھر سے نکلا اور حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور بیوی جو ہر وقت جھگڑا کرتی اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی مگر جب کبھی وہ کہیں چلا جاتا تو کھانا پینا تک چھوڑ دیتی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کا سر سلامت ہے کیوں کہ وہ سوچ سکتا ہے اور یاد کر سکتا ہے مگر خدا جانے اس کا چہرہ سلامت ہے یا بگڑ چکا ؟۔مگر بگڑے ہوئے چہرے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ہاتھوں اور پیروں کی سلامتی زیادہ ضروری ہے۔مگر اسے معلوم نہ تھا وہ ہیں یا نہیں۔مگر پھر باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں آدمی جنہیں پہلے وہ منکر نکیر سمجھا تھا قریب آ گئے۔وہ شاید ڈاکٹرز تھے اور مختلف زخمیوں کو دیکھتے ہوئے اس کے قریب آ رہے تھے۔یقیناً ان کی گفتگو سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس کی حالت کیسی ہے مگر وہ پاس ہی کے کسی مریض سے فارغ نہیں ہو پا رہے تھے۔

''اچھا ہوا'' ایک آواز آئی ''زیادہ سیریس مریضوں کو بڑے ہسپتال بھیج دیا گیا ورنہ بہت پرابلم ہو جاتی''

''ہاں '' دوسری آواز نے جواب دیا ''یہاں تو اب اور خون کا انتظام بھی نہیں تھا''

''خون کا انتظام تو ہو سکتا ہے۔ابھی صبح کے اخباروں اور نیوز بلیٹن سے ان کے وارثوں اور پبلک کو حادثے کا پتہ چل گیا ہو گا۔تم دیکھنا اب تھوڑی دیر میں یہاں خون کے عطیات دینے والوں کی بھیڑ لگ جائے گی مگر یار عملہ کم پڑ رہا ہے''

''سنا ہے دوسرے ہسپتالوں سے کچھ سٹاف بلایا گیا ہے۔شائد دوپہر تک کچھ لوگ پہنچ جائیں ''

''یار پتہ نہیں چل سکا یہ حادثہ ہوا کیسے ہوا۔سب سے عجیب بات یہ ہے کہ پوری تین بوگیاں جل گئیں اور گارڈ ،ڈرائیور اور فائرمینوں کو پتہ ہی نہ چلا''

’’نہیں یہ ڈرائیور کا بیان ہے۔اس کا کہنا ہے کہ انجن کا اپنا شور اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ دوسرا کوئی شور یا چیخ سنائی نہیں دیتی۔لیکن گارڈ کا بیان ہے کہ اسے پتہ تو چل گیا تھا مگر وہ جنگل میں گاڑی رکوا کر آگ تو نہیں بجھوا سکتا تھا۔اس نے جلدی سے جلدی کسی قریبی اسٹیشن پر پہنچنا ضروری سمجھا‘‘

’’ایک عینی شاہد بتا رہا تھا گاڑی کی تیز رفتاری کی وجہ سے آگ پھیلتی چلی گئی‘‘

’’ را ت کے وقت جلتی ہوئی بوگیوں والی گاڑی کا منظر کتنا عجیب اور خوفناک ہو گا‘‘

’’یہ بابا خوش نصیب ہے اتنے زخموں اور چوٹوں کے باوجود جان بچ گئی‘‘

وہ چونک پڑا۔وہ اسی کا معائنہ کر رہے تھے۔یقیناً انہوں نے اسے چھو کر بھی دیکھا ہو گا مگر اسے چھوئے جانے کا بالکل احساس نہیں ہوا تھا۔ یہ سوچ کر وہ دہل سا گیا کہ اس کا جسم بے حس یا سن ہو چکا ہے۔کیا پتہ بالکل بیکار ہو چکا ہو

پھر انھوں نے کسی تیسرے کو جو آواز سے نرس معلوم ہوئی ہدایت کی کہ وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھے کہ انجکشن کا اثر ختم ہونے اور ہوش میں آنے کے بعد مریض بے چینی کے عالم میں ہاتھ مارکر سانس کی نالی نہ ہٹا دے۔اسے یہ جان کر تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ کم از کم اس کا ایک ہاتھ ضرور موجود تھا۔

پھر وہ آگے بڑھ گئے مگر اسے ان کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ان کی گفتگو سے اسے بہت سی باتوں کا پتہ چلا۔معمولی زخمی ہونے والوں کو مرہم پٹی کر کے فارغ کر دیا گیا تھا۔ مرنے اور شدید زخمی ہونے والوں میں سے جن لوگوں کی شناخت ہو گئی تھی ان کے لواحقین کو اطلاع کر دی گئی تھی۔بے شناخت لاشوں کو سرد خانے میں رکھوانے کا انتظام ہو رہا تھا اور حکومت کی طرف سے زخمی اور مرنے والوں کے معاوضے کا اعلان ہو چکا تھا۔مگر یہ سوچ کراس کے دل کو دھچکا سا لگا کہ اس معاوضے کی نسبت ایک اور چار کی تھی۔اور یہ کیسا عجیب اتفاق تھا کہ مرنے کے معاوضے کی رقم فتح محمد کے مطالبے کے عین مطابق تھی۔مگر قسمت نے یہاں بھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

اچانک وہ کسی خیال سے چونک پڑا۔اس نے ٹانگوں کو ہلانے جلانے کی کوشش کی مگر اسے پتہ نہ چل سکا وہ ساتھ تھیں یا نہیں۔اس نے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر وہ اب تک بے حس پڑا تھا۔تاہم کچھ دیر کی کوشش کے بعد وہ دائیں ہاتھ میں تھوڑی سے جنبش پیدا کرنے اور آکسیجن کی نالی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

***

جیکو پچھے

ایک روز وہ پڑھائی اور کام کاج سے فارغ ہو کر گھر جانے لگی تو انہوں نے کچھ پرانے کپڑے دئیے۔ ان کپڑوں میں زہر مہرہ رنگ کا ایک مردانہ کرتہ بھی تھا۔ اس کرتے کو دھوتے ہوئے کئی بار اس کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی تھی۔

’’بی بی جی۔۔ یہ بھی؟‘‘

’’ہاں لے جاؤ، تمہارا بھائی پہن لے گا۔‘‘

وہ سلام کر کے جلدی جلدی گھر آئی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی قیمتی خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔

’’جے کو پُچھے ایہہ خزانہ کتھوں لبھا۔ توں آکھ جی، بی بی جی نے دتا۔‘‘

مارے خوشی کے وہ ہنستی چلی گئی اس کی ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

’’کیا بات ہے بیٹی۔۔ اتنی خوش کیوں ہو؟‘‘

جواب میں اس نے بہت سے کپڑے ماں کے سامنے ڈھیر کر دئیے وہ دعائیں دینے لگی۔

’’اللہ انہیں بیٹے کی خوشیاں دکھائے۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔‘‘

اس کی ماں نے ایک ایک کپڑے کو کھول اور الٹ پلٹ کر دیکھاپھر خوش اور مطمئن ہو کر بولی

’’تو ان کی خدمت کرتی رہا کر، تیرے دین اور دنیا دونوں سنور جائیں گے۔‘‘

’’ماں ‘‘ اس نے لجاجت سے کہا۔

’’کہو۔‘‘

اور جیسے کوئی شہزادی اپنی ملکہ مال سے نیا باغ لگوا دینے یا بارہ دری تعمیر کرا دینے کی فرمائش کر رہی ہو۔ اس نے کہا۔

’’یہ کرتہ مجھے دے دو۔‘‘

’’یہ؟‘‘ اس کی ماں نے کہا۔ ’’یہ تو مردانہ ہے اور بڑے ناپ کا؟‘‘

’’میں سی لوں گی۔۔ تم دے دو نا۔‘‘

’’اچھا۔‘‘

وہ خوشی سے کھل اٹھی اور کرتہ لے کر بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی جیسے اسے ڈر ہو کہ ماں اپنا ارادہ نہ بدل لے۔

یوں تو بی بی جی سب سے محبت کرتی تھیں مگر اس پر بہت مہربان تھیں اور اس کا خاص خیال رکھتی تھیں۔اسے اکثر بچا کھچا سالن، دودھ یا لسی اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں گھر لے جانے کے لئے دیتی رہتی تھیں اور اپنی اور بیٹے کی اترن تو وہ ہمیشہ اسی کے گھر بھجواتی تھیں۔ وہ بھی ان کی خدمت سب سے زیادہ کرتی۔سب سے پہلے آتی، گھر کی صفائی کرتی، برتن دھوتی، مرغیوں کو دانہ ڈالتی، گھڑوں میں تازہ پانی بھرتی، پھر جب دوسری لڑکیاں آ جاتیں تو ان کے ساتھ ننگے پاؤں زمین پر بیٹھ کر سبق یاد کرتی۔

’’جے کو پُچھے توں بندہ کس دا ہیں توں آکھ جی، اللہ تعالیٰ دا۔‘‘

سبق پڑھنے اور یاد کرنے کے بعد سب لڑکیاں چلی جاتیں مگر وہ اپنے لئے کوئی نہ کوئی کام نکال لیتی۔ یوں تو بی بی جی کے سارے کام کرنے میں خوشی محسوس ہوتی تھی مگر کپڑے دھونا اسے بہت اچھا لگتا تھا خاص طور پر جب ان کا بیٹا شہر سے آیا ہوتا۔۔ بی بی جی اس کی دھلائی کی بہت تعریف کرتی تھیں اور لانی اور کھار سے اپنے گھر والوں کے موٹے، پھٹے پرانے اور کھردرے کپڑے دھونے کے مقابلے میں اسے صابن سے یہ رنگ برنگے ریشمی کپڑے دھونا بہت اچھا لگتا تھا۔ ان سے ایسی مہک آتی جو اس کے لئے بہت انوکھی تھی۔ نمبرداروں کے باغ میں کھلنے والے گلاب اور چمبے، ہاتھوں میں رچی مہندی، بور پر آئے آم کے پیڑوں اور بارش کے بعد زمین سے اٹھنے والی مٹی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو سے مختلف اور اس قدر مدھم اور ملائم کہ ایک بار جی بھر کے سونگھ لینے سے ختم ہو جائے مگر پھر کئی کئی دنوں تک سونگھنے والے کے اندر سے اٹھتی رہے۔ وہ ان کپڑوں کو چھوتی تو اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ وہ ان پر صابن رگڑتی تو اسے لگتا وہ خود بھی کھرنے لگی ہے۔ لذت کی جھاگ سے اس کے ہاتھ لتھڑ جاتے۔ کپڑوں کو دھو اور نچوڑ کر رسی پر لٹکاتی تو اسے لگتا اس کی اپنی روح کا میل بھی اتر گیا ہے اور وہ دھل کر نکھر گئی ہے۔ سب کچھ اجلا اجلا اچھا اچھا لگنے لگتا۔

جس رات اس نے کرتہ مکمل کیا اس رات اسے مارے خوشی کے دیر تک نیند نہ آئی۔اسے لگتا تھا جیسے وہ کرتہ پہن کر ہوا میں اڑنے لگے گی۔اس کا جی چاہا وہ اسی وقت ہوا میں اڑنے لگے۔گاؤں کے لوگ اسے حیرت سے تکتے رہیں اور وہ رخت ہلاتی،ہوا میں اڑتی، چاندنی میں تحلیل ہو جائے۔ اس رات اس نے عجیب و غریب خواب دیکھے، جڑاؤ تخت، مورچھل، کنیزیں !!

صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ تھکی تھکی سی تھی۔ ماں آٹا گوندھ رہی تھی اور بھائی لکڑیاں چیر رہا تھا۔ اچانک اسے کرتے کا خوشگوار خیال آیا اور اسے لگا جیسے اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھی اور ہاتھ منہ دھو کر اندر چلی آئی مگر جونہی کرتہ اس کے جسم سے مس ہوا سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے گھبرا کر اسے وہیں چھوڑا اور باہر آ گئی۔

اس روز جب وہ بی بی جی کے ہاں پہنچی تو اس نے خوشی کی ایک اور خبر سنی۔ ان کا بیٹا امتحان سے فارغ ہو کر گاؤں واپس آ رہا تھا مگر اس خوشی کی خبر کا تعلق تو بی بی جی سے تھا جو اپنے بھائی کی بیٹی سے اس کا بیاہ کرنا اور اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ یا پھر اللہ وسایا سے تھا جس کے سالم تانگے میں بیٹھ کر وہ آئے گا یا پھر گلیوں کے آر پار کچی پکی دیواروں سے تھا جن کے درمیان سے گزر کر وہ گھر تک پہنچے گا پھر وہ کیوں خوش ہو رہی تھی؟

''آج میرے ساتھ کون کام کرائے گی؟''

''میں۔''

''میں۔''

''میں۔''

مگر وہ چپ رہی اس کے دل پر چوٹ سی لگی تھی بی بی جی اس کے ہوتے ہوئے دوسریوں سے کیوں پوچھ رہی تھیں۔

''عنائتی۔۔ تم دکان سے زردہ رنگ لے آؤ۔''

''آمنہ۔۔ تم مرغی ذبح کرا لاؤ۔''

''اختری۔۔ تم چاول صاف کرو۔''

'' اور میں کیا کروں ؟'' اس نے تلملا کر دل میں کہا۔ ''اپنا سر؟''

'' اور تم'' بی بی جی کو اس کا خیال بھی آ ہی گیا۔ انہوں نے اسے لمحہ بھر کے لئے ایسی نظروں سے دیکھا جو اس کے آر پار ہو گئیں اسے لگا جیسے انہوں نے اس کے اندر کا سارا حال پڑھ لینا چاہا ہو مگر اس کے اندر کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں تھا بس زیادہ سے زیادہ وقت ان کے پاس رہنے اور ان کے کام کرنے کی خواہش تھی یا پھر وہ ان کے بیٹے کے بیاہ کی بات سوچ کر خوش ہوتی تھی۔ خوش ہونا تو کوئی جرم نہیں تھا؟

''تم گھر جاؤ۔'' بی بی جی نے کہا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ مگر بی بی جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

’’تھوڑی دیر بعد، جب یہ سب چلی جائیں گی ماں سے پوچھ کر آ جانا۔‘‘

اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا جی چاہا ان کے پاؤں چھو لے مگر بی بی جی برا مان جاتیں۔

’’جے کو ُپچھے توں اینی خوش کیوں ایں توں آکھ جی۔۔ خورے کیوں ؟‘‘

اور حالانکہ بی بی جی جانتی تھیں کہ وہ شام کو پہنچے گا مگر انہوں نے ابھی اس سے اس کا انتظار شروع کر دیا تھا اور مختلف بہانوں سے چھت پر آنے جانے لگی تھیں۔اس کا اپنا جی چاہ رہا تھا۔ وہ چھت پر جائے اور کابک کی طرح وہیں گڑی رہ جائے۔

سہ پہر تک سارے کام ختم ہو گئے۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔اس کا جی چاہتا تھا وہیں رہ جائے مگر بی بی جی نے اسے گھر بھیج دیا۔ کاش وہ اس کی موجودگی میں آتا اور وہ دیکھ سکتی کہ بی بی جی کس محبت سے اس کی پیشانی چومتی ہیں۔ پیشانی چومنے کے خیال سے اس کی کوکھ میں ٹیس سی اٹھی اور اس کا سارا اندر مامتا کے جذبات سے بھر گیا۔

ماں نے اسے تنور گرم کرنے کو کہا، وہ چھت پر ایندھن لینے کے لئے گئی تو اس نے دیکھا گاؤں کی اونچی منڈیریں، درخت اور مسجد کے میناروں پر بیٹھے ہوئے کبوتر سبھی شہر سے آنے والی سڑک کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور وہ خود؟۔ اس کے من میں کیا ہے؟ اس نے خود سے پوچھا۔

’’جے کو ُپچھے تیرے اندر کیہ اے توں اکھ جی تنور‘‘

تنور میں روٹیاں لگاتے ہوئے اسے بار بار احساس ہوتا رہا اس کے اندر بھی روٹیاں لگی ہیں جو پک پک کر جھلسنے لگی ہیں مگر کوئی اتارتا نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر میں تھی مگر اس کا دل اور دماغ بی بی جی کے ہاں رہ گئے تھے۔ اسے بی بی جی کے ہاں دوبارہ جانے کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں اسے بے پناہ حجاب آ رہا تھا حالانکہ چند ماہ پہلے وہ چھٹی گزار کر گیا تھا تو وہ بی بی جی کے ساتھ اسے سیم نالے کے پل تک چھوڑنے گئی تھی اور اسے کچھ بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی پتہ نہیں پچھلے چند دنوں میں ایسا کیوں ہو گیا تھا کہ اس کے ذکر اور تصور سے اس کے گال دہکنے اور کانوں کی لویں جلنے لگتیں۔

رات کو چھت پر جا کر سونے سے پہلے اس نے اندر جا کر ریشمی کرتہ پہنا اور اسے یہ جان کر بہت اطمینان ہوا کہ اس کے جسم میں سنسنی کی لہر نہیں دوڑی بلکہ یوں لگا جیسے کسی تپے ہوئے برتن کے گرد ٹھنڈا بھیگا ہوا غلاف چڑھا دیا جائے۔

گاؤں کے سارے لوگ چھتوں پر سو رہے تھے اس کے قریب ہی اس کی ماں اور بھائی کی چارپائیاں تھیں مگر اسے ڈر لگ رہا تھا جیسے سوتے میں کوئی دیو اسے اٹھا کر لے جائے گا یا کوئی جن بھوت نتھنوں کی راہ اس کے اندر حلول کر جائے گا۔

وہ بار بار سونے کی کوشش کرتی رہی مگر اس کا دھیان بی بی جی کے گھر کی طرف چلا جاتا۔ اب وہ اسے کھانا کھلا رہی ہوں گی،اب اس کا بستر بچھا رہی ہوں گی۔ اب اس کے قریب بیٹھ کر اس سے باتیں کر رہی ہوں گی۔ اچانک وہ چونک پڑی۔

اسے لگا کوئی آہستہ آہستہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔خوف سے اس کا جسم لرزنے لگا۔چور، ڈاکو، جن بھوت۔ کئی طرح کے وسوسوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس نے چاہا ماں کو آواز دے، بھائی کو پکارے مگر خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی اور آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس نے دل کڑا کر کے، آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کی لباس چیخ نکل گئی کہ وہ اس کی پائنتی کی طرف کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس کی ماں اٹھ کر اس کے قریب آئی۔

''ابھی ابھی کوئی یہاں کھڑا تھا۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کا بھائی جاگ گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر اور نیچے صحن میں جھانک کر دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔

''تو نے خواب دیکھا۔'' ماں نے کہا۔ ''آیت الکرسی پڑھ کر سو جا۔''

اس نے آیت الکرسی اور بہت سی دعائیں جو اسے یاد تھیں، پڑھیں اور چادر میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اسے نیند نہ آئی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔اس نے پشیمانی سے سوچا مگر اسے بھی تو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بی بی جی اتنی نیک اور اچھی ہیں سارا گاؤں ان کی عزت کرتا ہے۔ مگر وہ ان کی عزت کو خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ اگر اس کا بھائی دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر وہ ایسا تو نہیں تھا ہاں اسے شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔ پتہ نہیں کیسی بری بری باتیں سیکھ گیا ہو۔ وہ دیر تک سوچتی رہی۔

سیڑھیوں پر پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے منہ سے چادر ہٹائی۔ شک دور کرنے کے لئے کان لگا کر سنا۔ دھیمے قدموں سے کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ چاپ قریب آتی گئی پھر ایک ہاتھ بلند ہوا، پھر سر دکھائی دیا پھر چہرہ، کندھے اور پھر پورا جسم۔۔ اس نے دیکھا وہ بالکل وہی تھا، بی بی جی کا بیٹا۔ پھر وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ گیا اور اسے اشاروں سے اپنی طرف بلانے لگا۔وہ تھر تھر کانپنے لگی۔اس نے چاہا چیخ پڑے مگر آواز اس کے گلے میں پھنس گئی۔ اس نے چادر سے اپنا سارا وجود اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔وہ خشک پتے کی طرح لرز رہی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

پھر وہ دیر تک چادر کے کونے پکڑ کر کھینچتا اور اسے ستاتا رہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کو خبر ہو۔وہ چپ چاپ لیٹی رہی پھر تنگ آ کر اٹھی اور بھاگ کر ماں کے پاس چلی گئی اور ننھی بچی کی طرح اس سے لپٹ کر سو گئی۔

صبح اٹھ کر اس نے رات کے واقعہ کو یاد کیا تو اس کے دل کا غبارہ رنج و غم کی ہوا سے بھر گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بی بی جی سے ضرور شکایت کرے گی اور اس کے بعد بھی وہ ان حرکتوں سے باز نہ آیا تو اپنے بھائی کو بھی سب کچھ بتا دے گی۔

نیچے آ کر اس نے سب سے پہلے ریشمی کرتہ اتار کر پھینک دیا اور اپنے معمولی اور پرانے کپڑے پہن لئے۔پھر منہ ہاتھ دھو کر بی بی جی کے ہاں چل دی۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جاتے ہی سب کچھ کہہ ڈالے گی اور سبق پڑھے اور کام کاج کئے بغیر الٹے قدموں واپس آ جائے گی۔

بی بی جی صحن میں بچھی اپنی اور اپنے بیٹے کی چارپائیوں سے بستر لپیٹ رہی تھیں وہ شاید حسب معمول کھیتوں کی طرف ہوا خوری کے لئے نکل گیا تھا۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور چھوٹتے ہی بولی۔

’’بی بی جی۔۔ آپ کا بیٹا۔۔!‘‘

بی بی جی نے اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

’’خدا کرے خیریت سے ہو۔۔ پتہ نہیں کیوں نہیں آیا؟‘‘

وہ حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی۔

***

جھڑ بیری

عورت کا دل رازوں کا ایسا سمندر ہوتا ہے۔جس کی ا تھاہ کا دیکھنے والوں کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔

جوانی ڈھلنے تک وہ اتنے حادثات سے دو چار ہو چکی ہوتی ہے کہ اب چھوٹی موٹی چوٹ اور صدمے سے اس کی روح پر کوئی نئی خراش نہیں پڑتی۔راہ چلتوں نے کیسے کیسے خفی اور جلی اشارے کئے۔موقع ملتے ہی اپنوں اور بیگانوں،دیوانوں اور فرزانوں،رشتے کے بھائیوں اور باپ دادا معلوم ہونے والوں نے کیا کیا حرکتیں کیں۔گھورا گھاری۔چٹکیاں اور دست درازیاں۔ ایسی باتیں کہ ان کا صرف اسے ہی علم ہوتا ہے۔ اور جن کا ذکر وہ قریب ترین رشتے دار یا راز دار سہیلی سے بھی کرنا پسند نہ کرے۔ایسے ایسے ناقابل یقین واقعات کہ کبھی شکایت کرنا چاہے تو الٹا کوئی اور بہتان لگ جانے،تہمت گلے پڑ جانے کا خدشہ ہو۔شوہر کے ساتھ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی خاتون کو قریب سے گزرنے والی کار کا ڈرائیور،یا کار سے جھانکتی عورت کو کوئی موٹر سائیکل سوار فحش اشارہ کر کے گزر جائے تو وہ سوائے صبر کے اور کیا کر سکتی ہے۔ہر عورت کے دل میں ایسے ایسے راز کہ انہیں ڈی کوڈ کرنے کا کوئی الیکٹرک آلہ دریافت ہو جائے تو بہت سے گھر اور دل ٹوٹ جائیں یا ان میں دراڑیں پڑ جائیں۔ہر سو نا اعتباری کی ہوائیں چلنے لگیں اور آدمی آدمی سے بدکنے لگے۔لیکن کبھی کبھی قدرت ناشکرے انسانوں کی سرزنش اور عبرت کے لئے رافعہ جیسی عورتیں بھی پیدا کر دیتی ہے۔

اس روز وہ سکول سے لوٹ رہی تھی،سہ پہر کا وقت تھا۔یہ محلے کی ایک پر رونق گلی تھی،جہاں ٹریفک کا دریا بہتا تھا۔اچانک وہ رک گئی۔ اور بلند آواز میں چیخنے چلانے لگی۔دکان داروں،راہ چلتوں اور تھڑوں پر بیٹھے ہوؤں نے دیکھا۔ایک جوان لڑکی ادھیڑ عمر کے ایک آدمی کا راستہ روکے اس پر برس رہی تھی۔ اور محلے کے معزز اور متمول ترین بزرگ شیخ عبدالواحد آڑھت والے، دو بیویوں کے شوہر،صوبائی اسمبلی کے امیدوار، حواس باختہ،خشک ہوتے لبوں پر بار بار زبان پھیرتے آنکھوں میں التجا اور پیلے پڑتے چہرے پر ندامت کا پسینہ لئے مجرموں کی

طرح کھڑے بیٹی بیٹی کہہ کر وضاحتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے خیال نہیں اس کا حال پوچھا تھا۔

ٹریفک کا دریا پل بھر کو رکا تو جیسے طغیانی سی آ گئی۔ہر طرف آدمی ہی آدمی۔آنکھیں ہی آنکھیں۔دکانوں،تھڑوں پر لین دین موقوف،کھانا پینا ختم اور مول تول ملتوی،دونوں اطراف کے چوباروں اور کئی کئی منزلہ مکانوں کی کھڑکیوں کو کھلنے کا بہانہ مل گیا۔چھتوں پر پتنگیں اڑاتے اور لوٹنے کی آس میں بانس اور ڈنڈے لئے مارے مارے پھرتے لڑکے پردہ دیواروں پر اوندھے ہو کر لٹکنے جھانکنے لگے۔مانو بازار میں ٹریفک روک کر بندر کا تماشا ہو رہا ہو۔

کیا ہوا؟---بندہ کون ہے؟---زنانی کس گھر کی ہے---؟ٹھیک کیا ہے---بہتان ہے---کلجگ ہے---الیکشن سٹنٹ ہے

طرح طرح کی بھنبھناہٹیں،ٹھٹھا بازی اور بغل بغل گدگداتی فحش ہنسی۔فرار کا کوئی راستہ تھا نہ زمین پھٹ رہی تھی کہ عبدالواحد اس میں سما جاتے۔تماشائیوں میں ان کی جان پہچان والے یا جن کا کوئی مفاد ان سے وابستہ تھا،ان کے طرفدار بن گئے مگر ایسے موقعوں پر، زور آوروں سے بار بار پٹی ہوئی خلق خدا کی اکثریت عام طور پر کمزور فریق کے ساتھ ہوتی ہے۔اگرچہ یہاں کمزور فریق اتنا کمزور بھی نہیں تھا۔

اور اس سے پہلے کہ پولیس یا اخبار والے آ جاتے اور شیخ عبدالواحد کی رہی سہی عزت بھی نیلام ہو جاتی،پھجو فالودے والا ریٹائرڈ بابو کرم علی کو ان کے گھر سے بلا لایا۔ وہ پہلے تو یہی سمجھے حادثہ ہو گیا اور وہ سکول سے واپسی پر کسی گاڑی تلے آ کر زخمی ہو گئی یا کچلی گئی۔مگر صورت حال جان کر زیادہ افسوس ہوا کاش ایسا ہو جاتا۔لگا،وہ خود کسی تیز رفتار بس ٹرک کے نیچے آ گئے ہیں۔ہجوم کو چیر کر آگے بڑھے اور اس ناہنجار کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے یوں لے چلے جیسے بھیڑیا بھیڑ کا کان منہ میں دابے اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لے جاتا ہے۔

شیخ عبدالواحد اور ان کے کنبے پر کیا گزری یا ان کے انتخابی حریفوں نے کیا کیا جشن منائے اور کرم علی نے رافعہ کے ساتھ کیا سلوک کیا ان اب باتوں کا تصور آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔مگر اس واقعے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جس طرح کسی غنڈے کی سر عام چاقو زنی اور مار دھاڑ کے مظاہرے سے علاقے میں دھاک بیٹھ جاتی ہے،بابو کرم علی کی استانی بیٹی کی بھی محلے میں خوب دھاک بیٹھ گئی۔گلی بازار کے لوگ اس سے یوں بدکتے جیسے علاقے کے ایس ایچ او کو دیکھ کر کنی کتراتے تھے۔مگر اس واقعے سے ناصرہ پھپھو کے مردہ تن میں جان سی پڑ گئی۔ اور وہ قبر ایسی جھلنگا چارپائی میں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔دیر تک اس کے زخموں نیلوں کو انگلیوں سے چومتی اور روتی رہیں۔ اس قدر ضعف نہ ہوتا تو وہ اسے کبھی پٹنے نہ دیتیں۔مگر ان کے آنسو محض دکھ کے نہیں تھے ان کی آنکھوں میں ایک

عجیب فاتحانہ چمک بھی تھی جیسے اس نے ساری دنیا کے مردوں سے اپنا ہی نہیں ان کا بدلہ بھی لے لیا ہو

ناصرہ پھپھو کو بیاہ کے صرف ایک ماہ بعد طلاق ہو گئی تھی۔ اور حالانکہ وہ پڑھی لکھی،کماؤ، اور قبول صورت تھیں مگر نو دولتیے شوہر نے صاف صاف نا پسندیدگی کی مہر لگا کر اس بیرنگ خط کی طرح لوٹا دیا جس پر ڈاکئے کے ریمارکس درج ہوں ''مکتوب الیہ لینے سے انکاری ہے واپس کیا جائے''

تھوڑی سی غصیلی،زود رنج اور سرکش وہ پہلے ہی تھیں اس ہتک آمیز سلوک نے انہیں سر تا پا آگ بنا ڈالا۔جدھر سے گزرتیں ہر چیز کو بھسم کرتی چلی جاتیں۔اڑوس پڑوس،بہن بھائی،ماں باپ اور بھابی سبھی ان کی بد زبانیوں سے پناہ مانگنے لگے۔شروع شروع میں ماں باپ اور بھائی نے چند ایک بار ان کے عقد ثانی کی بات چھیڑی مگر وہ شادی کے نام پراس قدر بھڑک اٹھتیں کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ان کا بس چلتا تو وہ ساری دنیا کی بیویوں کو بیوہ بنا ڈالتیں یا طلاقیں دلوا دیتیں۔اپنی شادی تو دور کی بات تھی وہ بیاہ شادی کی کسی تقریب میں شامل ہونا بھی پسند نہ کرتیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اندر زیادہ زہر بھرتا گیا اور آہستہ آہستہ وہ عورت مرد کے تعلق ہی سے متنفر ہو گئیں۔یوں تو گھر میں آئے روز لڑائی جھگڑا ہوتا ہی رہتا مگر جس روز بھابی،رافعہ کی امی صبح اٹھ کر غسل کرتیں،اس روز تو کسی بہانے گھر میں خوب ہی ہنگامہ ہوتا۔بوڑھے والدین بیٹی کا گھر اجڑنے کے صدمے اور اس کی بد زبانیوں اور بدسلوکیوں کی تاب نہ لا کر جلد ہی رخصت ہو گئے اور کرم علی اور رافعہ کی امی کو ایک نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا کر گئے۔دن میں کئی کئی بار لڑائی جھگڑا ہونے لگا۔مکان میں ان کا بھی حصہ تھا،یوں بھی وہ کہیں اور جا کر اکیلی کیسے رہ سکتی تھیں اور کیوں جا کر رہتیں۔تاہم مالی طور پر وہ کسی پر بوجھ نہ تھیں۔ایک سرکاری ہسپتال میں سٹاف نرس تھیں اور معقول تنخواہ ملتی تھی۔

ہر انسان کی طرح وہ بھی اگر بعضوں کے لئے بری تھیں تو بعضوں کیلئے اچھی بھی تھیں۔رافعہ سے انہیں شروع ہی سے پیار تھا بلکہ اسے ایک طرح سے انہوں نے ہی پالا تھا۔وہ زیادہ تر انہی کے پاس رہتی۔وہی اسے صبح سکول کے لئے تیار کرتیں۔رات کو ہوم ورک کرواتیں۔اس کے لئے اچھے اچھے کپڑے اور کھلونے خرید کر لاتیں۔وہ ان کی ساری محبت اور مامتا کا مرکز تھی۔وہ بھی ان سے بہت پیار کرتی۔اکثر انہی کے پاس سوتی اور کہانیاں سنتی اور امی اور پھپھو کی لڑائی میں ان کا ساتھ دیتی۔شروع شروع میں اس کی امی کو برا لگتا مگر جب اور بچے ہو گئے اور اخراجات پورے کرنا مشکل ہو گیا تو ان کی مامتا کو غنیمت معلوم ہوتا کہ رافعہ کو اس کی پھپھو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتی۔

ظاہر ہے رافعہ کی تربیت اس کی پھپھو نے اپنے ڈھنگ پر کی تھی چھوٹی سی عمر میں اسے بڑی بڑی باتوں کا علم ہو گیا تھا۔سر کے عقب میں اور کنپٹیوں پر ایک ایک فالتو آنکھ اگ آئی تھی۔سارے حواس شدید ہو گئے تھے۔سونگھ کر بتا سکتی تیسرے گھر میں کیا پک رہا ہے۔محلے کے انکل نما دکاندار کم سن لڑکیوں پر

جھونگے انوسٹ کرتے اور بطور سند انہی کے بدنوں کے بہی کھاتے پر چٹکیاں رقم کر دیتے۔لیکن دوسریوں کے بھلاوے میں جب پہلی بار چٹکی اس کے ہاتھ آئی تو اس نے تلی پر رکھ لی اور ہر آتے جاتے کو اس وقت تک دکھاتی پھری جب تک کہ پھپھو نے بس میری جان اتنا کافی ہے کہہ کر منع نہ کر دیا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے اپنی جسمانی ضرورتوں کا احساس نہ ہویا اس کے اندر کبھی کوئی لطیف جذبہ پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ محبت سے کوئی دل خالی نہیں ہوتا مگر پھپھو جو کہتی تھیں سچ ثابت ہوا۔انہی کی طرح اس کی محبت کے گلابوں کو بھی ایک سؤر نے ابتدا ہی میں ایسا تہس نہس کر ڈالا کہ پھر کبھی کوئی کونپل نہ کھل سکی اور اس کے اندر کانٹے ہی کانٹے اگنے لگے۔یہاں تک کہ اب وہ ایک کٹھ بیری کے جھاڑ کی صورت اختیار کر گئی تھی جو قریب سے گزرنے والوں کا دامن تار تار کر دیتا ہے۔مگر کوئی نہ جانتا تھا رات کی تنہائیوں میں کبھی کبھی اس جھاڑ سے کسی زخمی پرندے کے کراہنے کی آواز سنائی دیتی رہتی تھی۔

یہ بہت دن پہلے کی بات ہے۔

اس کے بال و پر نکلے۔اڑنے چگنے کا موسم آیا تو پھپھو نے نصیحت کی

''میں صدقے ذرا دیکھ بھال کر،ہر طرف ہمرنگ زمین جال بچھے ہوتے ہیں کہیں پاؤں نہ پھنسا لینا۔جال سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ایک بار پاؤں الجھ گیا تو الجھ گیا۔پھر واپسی مشکل ہو جاتی ہے''

کبھی کبھی وہ ٹوک دیتی ''پھپھو سارے مرد تو ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میرے ابا بھی تو ہیں ''

وہ ہنس پڑتیں ''رافی میری جان،مت پوچھ،وہ بھی ویسے ہی ہیں۔مرد سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔پرائی عورتوں کے شیدائی،گھر کی پوری چھوڑ کر باہر کی آدھی کے پیچھے دوڑنے والے۔گھر کی رانی اچھراں پر باہر کی لوناں چماری کو ترجیح دینے والے،عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والے،جو کبھی پوری آ گئی کبھی نہیں۔ان سے وفا کی امید عبث۔''

جوانی اس پر ٹوٹ کر آئی جیسے ساون میں گھنگھور گھٹا امنڈتی ہے اور جل تھل ایک کر دیتی ہے۔یہی وہ دن تھے جب وہ بھاگتے وقت کو روک کر اس سے کچھ بھی مانگ سکتی تھی۔مگر اس نے پھپھو کی محبت کے سوا کچھ نہ مانگا۔پھپھو کی باچھیں کھل کھل جاتیں۔لیکن وہ میٹرک کے امتحان میں دوسری بار فیل ہو گئی۔پھپھو نے دلاسا دیا۔

''روتی کیوں ہو میری جان۔اب کے میں ٹیوشن کا انتظام کئے دیتی ہوں۔ساری کمی پوری ہو جائے گی''

اس کا نام آصف تھا، کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ضرورتاً نہیں،شوقیہ گھروں میں ٹیوشنیں پڑھاتا تھا۔ایم کام کر چکا تھا۔شہرت اچھی تھی۔خوبرو،متشرع اور پابند صوم و صلواۃ۔ہر روز دو گھنٹوں کے لئے آنے لگا۔

وہ آتا، بلند آواز میں وضو کے لئے پانی مانگتا۔امی یا پھپھو جائے نماز بچھا دیتیں۔وہ وضو کر کے نماز ادا کرتا،دعا مانگتا اور مصلیٰ لپیٹ کر کپڑے کی ٹوپی پہنے اس کے کمرے میں آ جاتا۔کچھ دیر زیر لب کچھ پڑھتا اور اردگرد پھونکیں مارتا رہتا۔سارا کمرہ اور گھر ایک تقدس کی لپیٹ میں آ جاتا۔پھر اچانک گذشتہ سے پیوستہ لیکچر شروع ہو جاتا۔وہ پورا وقت نہایت سنجیدگی اور متانت سے بولتا رہتا۔وہ سنتی،لفظوں کے پھول چن چن کر نوٹ بک بھرتی اور موقع پا کر اسے دیکھتی رہتی۔زندگی میں پہلی بار کسی نوجوان مرد کی شخصیت نے اسے مسحور اور قابلیت نے مرعوب کیا تھا۔کچھ ہی روز میں اسے لگا،زینہ زینہ اس کا ہاتھ اس کے دل کے آبلنے تک پہنچنے لگا ہے۔وہ چلا جاتا مگر وہ اسے اپنے پاس محسوس کرتی۔ہر جوان لڑکی کی طرح وہ بھی اپنی تنہائیوں میں اپنی پسند کے آدمی سے باتیں کرنے لگی۔وہ گھاگ شکاری، اپنے فن میں ماہر،نوخیز لڑکیوں کی نفسیات سے واقف۔ اس کی چرب زبانی،حیثیت یا وجاہت انہیں جلد ہی مرعوب کر دیتی۔ اپنی سابقہ فتوحات کے تکبر میں یا شائد چاہت کے پھل کی بدلی ہوئی رنگت سے اندازہ لگا کر اس نے زیادہ دن انتظار نہ کیا۔ ایک روز کہنے لگا:

’’تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو‘‘

اسے حیرت ہوئی اسے برا کیوں نہیں لگا۔ اس نے مصنوعی اور بے اثر سی خفگی کا اظہار کیا

’’سر آپ یہاں ٹیوشن پڑھانے آئے ہیں ‘‘

’’میں نے تو ٹیوشنیں بھی تمہاری خاطر شروع کیں ‘‘

’’میری خاطر؟‘‘

’’ٹیوشن کیا۔تمہارے لئے تو جوگ بھی لیا جا سکتا ہے‘‘

اس نے چاہا یقین نہ کرے،ہم رنگِ زمین جال سے بچ نکلے مگر پرندوں میں پوری دانائی آ جائے تو شکاری بھوکے مر جائیں۔اس نے چاہا اسے کھری کھری سنائے مگر پتہ نہیں اس کی آنکھوں میں کیسا جادو تھا کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔کسی عام سی لڑکی کی طرح شرما لجا کر رہ گئی۔ایک روز جزر معلوم کرنے کا طریقہ سمجھاتے ہوئے کہنے لگا

’’میں نے تم سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے‘‘

اس نے آخری بار چاہا یقین نہ کرے مگر وہ اس کے جادوئی حصار کو نہ توڑ سکی اور زندگی میں پہلی بار پھپھو سے بھی اپنی باتیں چھپا گئی۔

اور جس طرح امتحانوں میں پہلے تھیوری اور آخر میں پریکٹیکلز ہوتے اور اس کے بعد امتحان ختم ہو جاتا ہے،اس کا امتحان بھی ختم ہو گیا۔مگر ممتحن پرچے لے کر غائب اور ریزلٹ ہمیشہ کے لئے لیٹر آن۔

وہ چلا گیا۔مگر اپنا کچھ نہ کچھ چھوڑ گیا۔جس کی صحیح نوعیت وہ کبھی نہ جان سکی۔

اسے طرح طرح کے خیالات گھیرے رکھتے۔ اسے غلطی کیسے لگ گئی؟ اس نے اپنی محبت کے قاتل کو اتنی آسانی سے فرار کیوں ہونے دیا۔اس کا دور تک پیچھا کیوں نہ کیا۔اس سے اپنی توہین کا بدلہ کیوں نہ لیا؟۔وہ بھی ان عام سی لڑکیوں جیسی نکلی جو اپنی بیوقوفی کی وجہ سے دھوکا کھاتی اور بدنامی کے خوف سے خاموش رہتی ہیں۔بھولنے اور معاف کرنے میں اسے کئی سال لگ گئے۔

ملک میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔سیاسی جوڑ توڑ اور جلسے جلوس زوروں پر تھے۔جگہ جگہ قومی اور صوبائی امیدواروں کے پوسٹر لگے تھے۔اخبارات بیانات،دعوؤں اور ڈینگوں سے بھرے ہوتے۔محلے کے دونوں امیدوار ایک ایک ووٹر کے پاس خود چل کر جاتے۔ان کے ہاں بھی آئے۔وہ بھی ساتھ تھا۔

چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔وہ اسے یوں دیکھ رہا تھاجیسے ولایت کے لوگ تیسری دنیا میں آ کر اپنی سابقہ رعایا کو دیکھتے ہیں۔

’’یہ بھی میری شاگرد ہیں،سوری میں نام بھول گیا‘‘

’’نام بھول گیا‘‘ اس کے اندر کوئی چیز چھن سے ٹوٹی۔لگا جیسے کسی نے گالی دی،سینے میں چھری گھونپ دی۔اس پر گئے دنوں کے ملال کا پورا چھکڑا الٹ گیا

’’رافعہ،میری بیٹی،سکول ٹیچر ہے‘‘ کرم علی نے بتایا

’’ہاں رافعہ،مجھے یاد آیا‘‘ وہ بے درد ی سے بولا

’’پھر تو یہ اپنا ہی گھر ہوا‘‘ شیخ صاحب نے اطمینان سے ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا

’’جی ہاں گھر بھی آپ کا اور ووٹ بھی‘‘

’’نام بھول گیا،نام بھول گیا‘‘ اس کے اندر ابھی تک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔جی چاہ رہا تھا بلند آواز میں چیخے یا قہقہہ لگائے۔سارے محلے کو چیخ چیخ کر بتائے

لوگو وہ میرا نام بھول گیا۔مگر وہ چیخ سکی نہ قہقہہ لگا سکی۔ اور چپ چاپ اندر چلی گئی۔

اس وقت تو وہ چپ چاپ اندر چلی گئی مگر اس کے کچھ ہی دنوں بعد اس کے اندر رکی ہوئی بہت سی چیخیں عین بازار کے وسط میں، پنجرے میں بند شارکوں کی طرح یک بارگی نکلیں اور آسمان ان کی چچلاہٹوں کے شور سے بھر گیا اور شیخ عبدالواحد کے الیکشن کی ساری پرچیاں ان کی پھڑ پھڑاہٹوں میں اڑ گئیں۔مگر ان کو ہی نہیں ان کے خاندان اور گلی محلے کے لوگوں کو بھی ہمیشہ کے لئے اس کا نام ازبر ہو گیا۔ بات کرتا ہے سالا، نام بھول گیا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے اپنی اور ان کی حیثیت کا فرق معلوم نہ ہو۔ یا جانتی نہ ہو کہ درجنوں سکول،ہسپتال اور رفاہی ادارے ان کی نگرانی میں یا اعانت سے چلتے تھے۔وہ محلے کے ہی نہیں شہر کے با اثر اور متمول ترین لوگ اور وہ غریب ترین گھر کی فردیہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی چھوٹا اور غریب ملک کسی سپر پ اور کو چیلنج کر دے۔ بابو کرم علی کی پنشن نہ ہونے کے برابر۔ ناصرہ پھپھو کی کمائی ان کی بیماری کھا گئی۔ایک اسی کی معمولی سی تنخواہ سے گھر چلتا تھا،مہینہ دو مہینہ میں سکول سے معطلی کا پروانہ مل گیا۔

وہ ملازمت کے لئے جہاں بھی جاتی اس کی شہرت اس سے پہلے پہنچ جاتی۔کچھ روز دور بیاہی بہنیں اور بہنوئی مدد کرتے اور پڑوسی قرض ورض دیتے رہے پھر آہستہ آہستہ ان کے رویے میں سرد مہری آتی چلی گئی۔ اور فاقوں کی نوبت آ گئی۔تاہم وہ یا کرم علی محلے کی کسی بھی دکان پر چلے جاتے تو پچھلے پیسوں کا تقاضہ کئے بغیر ادھار مل جاتا۔یہ صورت حال تکلیف دہ اور خود داری کو مجروح کرنے والی ضرور تھی لیکن اسی سے جسم و جان کا سلسلہ قائم رکھنا ممکن ہو رہا تھا۔ اور خود کشی کے بارے میں سوچنے کے باوجود ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

انتخابات کی گرد بیٹھ گئی تو ایک نیا کھیل شروع ہوا۔آدمی ریس کے گھوڑوں میں تبدیل ہونے لگے اور ملک الموت کو جاں بخشی کے عوض بریف کیس پیش کئے جانے کے لطیفے مشہور ہوئے۔عہدوں اور بریف کیسوں کی تقسیم کے اس موسم میں ایک روز ہجوم میں راستہ بناتی ایک لمبی چمکیلی کار گھر کے سامنے آ رکی۔شوفر نے دروازہ کھولا۔زرق برق کپڑوں میں ملبوس اور بھاری قیمتی زیورات سے لدی پھندی ایک بیگم ٹائپ خاتون برآمد ہوئیں،اسے اندر ہی اندر اس غیبی امداد کا انتظار رہتا تھا۔سمجھی شائد شیخ عبدالواحد کے حریفوں کو آخر اس کی یاد آ ہی گئی۔

''بابو کرم علی کا گھر یہی ہے؟''

''ہاں مگر آپ کون؟''

'' تم مجھے نہیں جانتی ہو!میں مسز نسرین آصف، آڑھت والے شیخ عبدالواحد کی چھوٹی بہو۔''

’’اوہ آپ اور یہاں ؟‘‘ وہ چونک پڑی۔گزرے دنوں کی یادوں کی کڑواہٹ منہ میں بھر گئی۔بولی

’’بیگم صاحبہ آپ کو شائد غلطی لگ گئی‘‘

’’اچھا دروازہ تو کھولو،بیٹھ کر کرنے والی کچھ باتیں ہیں ‘‘

شکر ہے ابا گھر پر نہیں تھے اور اماں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔شائد انتقام لینے کا صحیح موقع اب ہاتھ آیا اس نے دل میں سوچا اور دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلا،گھر میں ایک اجنبی خوشبو پھیلی تو پھپھو کی آواز سنائی د ی۔’’کون آیا ہے رافی؟‘‘

’’ایک بیگم صاحبہ ہیں پھپھو۔کسی کا پتہ پوچھنے آئی ہیں ‘‘

’’یہ پنکھا لے جا۔بڑی گرمی ہے آج‘‘

نسرین بیگم نے چھت سے لٹکتے پنکھے کے بے حس و حرکت پروں کی طرف دیکھا اور کچھ سمجھ کر دستی پنکھا لے لیا اور زور زور سے ہلانے لگی۔

’’مجھے غلطی لگی ہے نہ کسی اور کا پتہ پوچھنا ہے میں تمہیں ملنے آئی ہوں ‘‘

’’میں کس قابل۔ایک نوکری تھی وہ بھی آپ لوگوں نے چھین لی۔اب اور کیا چاہتے ہیں ؟‘‘

’’مجھے نہیں معلوم تمہاری نوکری کس نے چھینی مگر بحال ہو سکتی ہے‘‘

’’یہ مہربانی کیوں ؟‘‘

’’شائد تمہیں معلوم نہیں۔شیخ صاحب،میرے انکل بہت بیمار ہیں۔ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔مگر جان اٹکی ہوئی ہے۔ان کا کہنا ہے۔اللہ تو سب جانتا ہے۔مگر میں اپنے کنبے اور دنیا کے سامنے سرخروئی سے مرنا چاہتا ہوں ‘‘

’’اللہ ان پرکرم کرے‘‘ پھپھو کی آواز سنائی دی۔دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔وہ چوکھٹ کا سہارا لئے کھڑی ہانپ رہی تھیں۔

وہ انہیں سہارا دے کر واپس ان کے کمرے میں چھوڑنے آئی۔’’آپ کو بستر سے نہیں اٹھنا چاہیے پھپھو‘‘

’’میری بات سن رافی، تجھے غلطی بھی تو لگ سکتی ہے۔اگر تجھے ذرا سا شک بھی ہو تو اس کا فائدہ ان کو ملنا چاہئے‘‘

'' شک نہیں مجھے معلوم ہے پھپھو،وہ نیک اور شریف آدمی ہیں ''

'' پھر تو نے ایسا کیوں کیا،کرے کوئی بھرے کوئی،بری بات ہے''

''اسے میرا نام بھول گیا تھا پھپھو'' اس نے گلو گیر آواز میں کہا

''اس سے بھی بھول ہو گئی اسے بھی معاف کر دو میری جان،جاؤ ہسپتال جا کر سب کے سامنے کہہ دو''

''نہیں پھپھو'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا

پھپھو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما تو جیسے اس کے اندر غم و غصے کا سارا کرنٹ ارتھ ہو گیا اور اچانک سوئی ہوئی خیر کی کوئی خدائی یا نسوانی صفت بیدار ہو گئی۔ اس کے اندر کے جھاڑ میں پھڑ پھڑاہٹ سی ہوئی اور سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

'' رفو اس خوبصورت اور معصوم سی عورت کو جس کے چہرے پر خوشی اور امید کے پھول سے کھلے ہیں اور جو اپنے شوہر پر اندھے اعتماد کی سرخوشی میں لت پت ہے رنجیدہ مت کرو۔ یہ عورت اتنی غیر بھی نہیں۔اس کاتم سے کوئی رشتہ تو ہے۔محبت کا وہ دریا جس سے مردہ مچھلیوں کے سوا تمہارے ہاتھ کچھ نہ آیا،دن رات اس کے آنگن میں بہتا ہے۔ اور رفو ایک یاد کے سوا تمہارے پاس ہے ہی کیا۔اسے مزید میلا نہ کرو''

وہ بے بس سی ہو کر رونے لگی۔

***

ایک سائیکلو سٹائل وصیت نامہ

ٍ تعارف و حالات شہید ابو معاویہ محمد امین رحمۃ اللہ علیہ

جیسا کہ شہید ابو معاویہ محمد امین کے چچا سے روایت ہے آپ 1982ء کے ماہِ صیام میں بروز جمعتہ المبارک منڈی جیم الف ضلع شیخوپورہ کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے،آٹھویں جماعت تک تعلیم بڑے گاؤں کے سکول سے حاصل کی۔ دنیاوی تعلیم میں شروع ہی سے جی نہ لگتا اور گھر والوں کے اصرار اور سکول ٹیچروں کی مار سے پریشانی کا شکار رہتے۔اس لیے اکثر ناغہ کرنا پڑ جاتا اور آپ یہ فارغ وقت اللہ کی یاد میں گزارتے۔ اس کے لیے بعض اوقات آپ کسی کھیت میں گھس کر یا گھنے درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاتے تاکہ گاؤں کا کوئی آتا جاتا گنوار مخل نہ ہو۔پھر سکول جانا چھوڑ دیا تو چند ماہ اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ گھر کے کام کاج اور کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹاتے رہے مگر اس کام میں بھی جی نہ لگا کہ آپ ایسے معمولی کاموں کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ درحقیقت ان کا دل دنیاوی معاملات سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔

مذہبی گھرانے سے تعلق کی بنیاد پر ابو معاویہ دین اسلام سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ پانچ وقت نماز کے تو وہ بچپن ہی سے پابند تھے۔ اکثر جہادی رسائل کا مطالعہ نہ صرف باقاعدگی سے بلکہ بے حد شوق سے کرتے تھے۔ ایک بار رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں تھے جب حاملینِ کتاب و سنت کے دعوتی پروگرام سے شناسائی ہوئی اور آپ کے اندر جذبہ جہاد فی سبیل اللہ نے گھر کر لیا اور آپ جہادی راہوں پر عازمِ سفر ہوئے۔

چند ماہ بعد اپنے دوسرے چچا محمد یحٰی کے ساتھ عسکری تربیت کے لیے ایک جہادی معسکر پہنچے۔عسکری تربیت کے تمام مراحل بڑی کامیابی کے ساتھ طے کیے۔ دورہ خاصہ کی تکمیل کے ساتھ ہی جذبہ شہادت دل میں موجزن ہوا۔دنیا سے بالکل ہی دل اُچاٹ ہو گیا۔ گم صم رہنے لگے۔اُداسی کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے ’’ادھر کشمیر میں ہماری مسلمان مائیں بہنیں،ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہیں اور ہمارے مظلوم کشمیری بھائی اسلام کے ناتے سے ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں،میں یہاں چین سے کیسے بیٹھ جاؤں ‘‘

ابو معاویہ کشمیر میں اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کے لیے وہاں پہنچنے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ والدین سے اجازت طلب کی۔ نیک اور صالح والدین نے

پہلے تو روکا مگر جب اندازہ ہوا کہ وہ رکنے والے نہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے اپنے شیر دل مجاہد بیٹے کے عظیم جذبے کی قدر کرتے ہوئے اجازت دے دی اور ساتھ ہی یہ خواہش بھی کی کہ بیٹے مزید چند دن رک جاؤ اور پھر چلے جانا۔ اس پر ابو معاویہ نے جواب دیا ''مجھے تو پہلے ہی دیر ہو گئی ہے،جس قافلے کے ساتھ میں نے روانہ ہونا ہے وہ قافلہ چلا جائے گا اور میں پیچھے رہ جاؤں گا''

پانچ سال پہلے، پندرہ اگست کو گاؤں سے سیدھے اسلام آباد اپنے چچا کے ہاں پہنچے جو ایک سرکاری دفتر میں قاصد ہیں۔ پورے خاندان بھر میں اُن کی چچیرے بھائی محمود سے زیادہ دوستی تھی اور انھوں نے اُس سے ملنا ضروری سمجھا۔جانے لگے تو محمود کے اصرار پر ایک دن رکنے پر رضا مند ہو گئے۔

کتاب و سنت کا یہ داعی،اسلام کا سپاہی سولہ اگست کو اپنی مطلوبہ منزل کی طرف روانہ ہو گیا اور اپنے قافلے کے ساتھ مل کر بتوں کے پجاریوں کو واصلِ جہنم کرتا رہا اور بالآخر اُسی سال سولہ نومبر رات قریباً دس بجے دشمن فوج کے ساتھ شروع ہونے والی اور رات بھر جاری رہنے والی جھڑپ کے دوران مجاہدین کے قافلے کو الوداع کہتے ہوئے شہیدوں کے قافلے سے جا ملے۔اناللہِ و انا الیہ راجعون۔ان کے امیر کی طرف سے ان کا جو وصیت نامہ ملا وہ اگرچہ ان کے اپنے دستِ مبارک کا لکھا ہوا نہیں تھا بلکہ سائکلو سٹائل تھا مگر خیالات اور جذبات یقیناً انھی کے ہوں گے کیوں کہ اس کے نیچے دستخط آپ ہی کے تھے۔ یہ وصیت نامہ بلا تبصرہ جوں کاتوں ملاحظہ کیجئے۔آپ نے لکھا تھا:

میرے پیارے والدین،عزیز بھائیو اور علاقہ کے لوگو!

جب آپ کے پاس کاغذ کا یہ ٹکڑا پہنچے گا انشاء اللہ میں اللہ تعالیٰ کی بلند درجات والی جنت میں پہنچ چکا ہوں گا۔میری شہادت کی خبر سن کر پریشان نہیں ہونا بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اور شکرانے کے دو نوافل ادا کرنا۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے اور شہید کو مردہ کہنے سے منع فرما یا ہے۔

میرے پیارے والدین اگر میں ساری زندگی آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیتا رہتا،کندھوں پر اٹھا کر خانہ کعبہ کا طواف کرواتا رہتا پھر بھی آپ کا حق ادانہ کر سکتا لیکن شہادت سے اُمید ہے قیامت کے دن آپ کے احسانات کا کچھ بدلہ چکانے کے قابل ہو سکوں گا اور جنت کے دروازے پر آپ کا انتظار کروں گا۔ کیوں کہ مجھے ستر رشتہ داروں کی سفارش کرنے کا اعزاز ملے گا بشرطیکہ وہ شرک نہ کرتے ہوں۔ پیارے والدین اگر میری زندگی تیرہ سو سال بھی ہو جاتی تو پھر بھی موت آنی تھی لیکن ایسی موت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔میری پیاری ماں مجھ کو تیری دعا چاہیے۔اگر مجھ کو کشمیر میں موت آئے تو اورکیا چاہیے

اگر میرا کوئی پوچھے تو اس کو میر اسلام کہنا۔آپ لوگ اپنی زندگیوں کو نبی کریمﷺ کی زندگی کی طرح ڈھال لو۔عزیز بھائیو فرض نماز کو ہر گز نہ چھوڑنا۔نبی

کریم ﷺ کا ارشاد ہے یعنی کہ جس آدمی نے نہ جہاد کیا اور نہ ہی ارادہ کیا وہ ایک منافق کے شعبہ پر مرا۔

''اے مسلمانو تم پر قتال یعنی لڑائی کرنا فرض کر دیا گیا ہے۔''

پیارے والدین قرآن مجید میں ایک دفعہ ہی نہیں بلکہ تقریباً 750 آیات میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی شان بیان کی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن مجید میں فرمایا ہے

''کہ ہلکے ہویا بوجھل اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو،اپنی جانوں کولے کر اپنے مالوں کولے کر۔،

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں '' اگر تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نہ نکلے تو اللہ تعالیٰ تم کو درد ناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور قوم کولے آئے گا اور تم اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔''

آج دنیا کی تمام کافر طاقتیں اسلام کو مٹانے کے لیے اپنی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ آج مسلمان مغلوب ہے۔آج کشمیر کی طرف دیکھ لیں۔ فلسطین،عراق اور افغانستان کی طرف دیکھ لیں۔ مسلمان بہنوں اور ماؤں کی عزتوں کو پامال کیا جا رہا ہے۔مسلمان بوڑھوں اور بچوں کو بے گناہ شہید کیا جا رہا ہے۔وجہ کیا ہے۔یہی کہ وہ بھی لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں۔ یاد رکھیں اگر آج ہم نہ نکلے توکل وہ ہمارے گھروں پر بھی چھانے والے ہیں۔ابا جان اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں آنے کا مقصد بھی بیان کیا ہے۔ ''کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے''

عزیز بھائیو ہر چیز سے بہتر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔میں اپنی بہنوں سے پردے کی تاکید کرتا ہوں۔کہ وہ اسلام کے مطابق اپنے پردے اپنائے رکھیں۔باقی بھائی بہنوں کی شادی انشاء اللہ اسلام کے مطابق کرنی ہو گی۔میں نے جس کسی کا قرض دینا ہے وہ بھی ادا کر دیں۔

ہمیں اس دنیا سے کیا لینا مشن شہادت اپنا۔۔۔پہاڑوں پہ دفن ہوں گے کفن ہو گا برف اپنا

جب یہ کاغذ کا ٹکڑا آپ کے ہاتھ میں آئے گا آنسو نکلیں گے کہ یہ ایک فطری بات ہے لیکن میرے والدین صبر کے دامن کو نہ چھوڑنا۔امی جان تہجد کے وقت ضرور دعائیں کرنا کہ اللہ تعالیٰ میری شہادت کو قبول فرمائے۔ آتے وقت جس عزیز سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ ا س سے معافی کا خواستگار ہوں۔باقی جو گاؤں والے اور عزیز و اقارب مجھ سے محبت کرتے ہیں انشاء اللہ میری شہادت کا ضرور ان ظالموں سے بدلہ لیں گے انشاء اللہ۔

آئے تھے ہم دنیا میں سیر کرنے سیر گلشن کر چلے۔۔مالی یہ باغ سنبھال اپنا ہم مسافر گھر چلے

میرے عزیز بھائیو داڑھیوں کو اللہ کے لیے معاف کر دینا۔شلواروں کو ہمیشہ ٹخنوں سے اوپر رکھنا۔ قرآن مجید کی تلاوت کو صبح و شام کیا کروکیوں کہ ہر چیز سے بہتر اللہ کا ذکر ہے۔اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اللہ کے لیے معاف کر دینا میرے لیے زیادہ سے زیادہ دعا کریں۔ اللہ مجھ کو دشمن کی قید سے محفوظ کرے اور اللہ مجھ سے راضی ہو جائے اور شہادت کی موت نصیب فرمائے۔

آپ کا پیارا بیٹا محمد امین ابو معاویہ ثانی

میری یادوں کو سینے سے لگائے رکھنا۔اگر آنسو آئیں تو آنسوؤں کو دبائے رکھنا

اگر شہیدوں سے جاملوں تو لبوں پہ دعا رکھنا۔میری شہادت پہ صف ماتم نہ بچھانا

واپسی کا ایڈریس جنت الفردوس انشاء اللہ۔ابو معاویہ محمد امین شہید رحمۃ اللہ علیہ

***

جہاد

'' ہیلو کمانڈر---تم پر سلامتی ہو ''

'' حضور آپ پر بھی ''

'' کہاں ہو کمانڈر؟ ''

'' سر ابھی اوپر ہوں۔مگر میرے آدمی نیچے جا چکے ہیں ''

'' انھیں واپس بلا لو ''

'' یہ آپ کیا فرما رہے ہیں ؟ ''

'' ہاں--- انھیں واپس بلا لو اور خود بھی آگے مت جاؤ ''

'' مگر حضور وہ تو اپنے ٹارگٹ کے قریب ؟ ''

'' وہ جہاں بھی ہیں انھیں فوراً واپس لے آؤ۔انھیں مشن مکمل کرنے کا ثواب ملے گا ''

'' میں کوشش کرتا ہوں حضور---مگر ابو صالح بہت جوشیلا ہے۔شہادت سے کم مرتبے پر راضی نہ ہو گا ''

'' اسے بشارت دوکہ اللہ نے ان کی شہادت قبول کر لی ''

'' ٹھیک ہے حضور۔مگر جہاد؟ ''

'' جہاد بند کرنے کا حکم آیا ہے ''

'' کہاں سے ؟ ''

'' اوپر سے ''

'' وحی کے ذریعے؟ ''

'' نہیں، وائرلیس پر ''

***

ڈھیری

اس کی ڈھیری عام گزرگاہ کے قریب تھی۔ وہ جب بھی دور دراز کا سفر کر کے وہاں پہنچتا کسی نہ کسی کو وہاں موجود پاتا۔کبھی کوئی پہرے دار اور کبھی کوئی عقیدت مند۔

اس نے قید خانے کی صعوبتیں برداشت کرتے اور ہر روز مر مر کر جیتے ہوئے عہد کیا تھا کہ وہ باہر نکلتے ہی اپنی توہین اور ایک ایک اذیت کا بدلہ لے گا۔ اس نے اسے ایک ناکردہ اخلاقی جرم میں پھنسا کر عزت،وقار اور روزگار ہی سے محروم نہیں کر دیا تھا بلکہ اسے رشتے داروں اور بیوی بچوں کی نظروں میں بھی گرا دیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ زندگی میں ایک بار چاہے وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہی کیوں نہ ثابت ہو اس کے منھ پر تھوک کر اپنی نفرت کا اظہار ضرور کرے گا مگر ابھی اس کی سزا کی مدت پوری نہ ہوئی تھی کہ اس کا دشمن ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ پہلے تو اسے خوشی اور اطمینان ہوا کہ ایک ظالم واصلِ جہنم ہوا مگر پھر رہ رہ کر افسوس ہونے لگا کہ اب وہ انتقام کیسے لے گا؟

نفرت کے اظہار اور اس کی بے حرمتی کا طریقہ تو اس نے سوچ رکھا تھا مگر اب اتنے دنوں اور پھیروں کے باوجود اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ جب بھی جاتا کسی نہ کسی کو چوکنّا پاتا۔ذہنی اذیتوں،جسمانی سزاؤں اور ناقص خوراک نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ وہ جس بات کا ارادہ کر لیتا جب تک پوری نہ کر لیتا اسے چین آتا نہ ہی نیند۔ رات رات بھر جاگتا اور اگلی پچھلی باتوں کو یاد کر کے غصے اور انتقام کی آگ میں جلتا رہتا۔

وہ درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے رات کو کئی بار پیشاب کے لیے بھی اٹھنا پڑتا تھا۔ عام طور پر وہ اس کے بعد تھوڑی دیر کو دوبارہ سو جاتا مگر بعض اوقات نیند اچٹ جاتی اور قید و بند کے سارے شب و روز اس کی نگاہوں میں گھومنے لگتے۔ آخری روز وہ منھ اندھیرے اٹھا اور پیشاب کے لیے ٹائیلٹ میں گیا تو معاً اس کی نظر فریشنر کی شیشی پر پڑی جس میں چند قطرے باقی تھے۔اچانک اس کے ذہن میں ایک انوکھی ترکیب آئی اور اس نے اطمینان کا لمبا سانس لے کر شیشی اٹھا لی۔

***

کیلنڈر

اس کے اندر اتنے زور کا بادل گرجتا ہے کہ وہ بڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہی۔ کیا دیکھتا ہے کہ موسلا دھا بارش ہو رہی ہے اور بار بار بجلی کوندتی ہے۔ تپائی سے گھڑے اٹھا کر اس کی اندھیرے میں چمکتی ہوئی سوئیاں دیکھتا ہے۔ نصف رات بیت چکی ہے۔ مگر نئے دن کا سورج طلوع ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے ہر سو گھپ اندھیرا ہے۔ جب بجلی کوندتی ہے تو لحظہ بھر کے لئے درخت، بجلی کے کھمبے اور صحن کی دیواریں روشن ہو جاتی ہیں مگر پھر پلک جھپکتے ہی تاریکی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کھڑکی سے ٹھنڈی اور بھیگی ہَوا کے جھونکے آتے ہیں۔ وہ دوبارہ سو جاتا چاہتا ہے مگر کسی انجانے دکھ کا احساس اسے پریشان اور بد مزہ کر دیتا ہے۔ وہ ذہن پر زور دیتا ہے کہ اس دکھ کی نوعیت یاد آ جائے جس نے آنکھ کھلتے ہی اسے دبوچ لیا ہے مگر اسے بالکل یاد نہیں آتا۔

کچھ عرصہ سے بھول جانے کا مرض کافی بڑھ گیا ہے اس نے کی بار سوچا ہے کہ کسی ماہر معالج سے رجوع کے مگر ہر بار وہ بھول جاتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ اب اسے معالج سے مشورہ کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہئے بلکہ کل ہی مشورہ کرنا چاہئے وہ آنے والا دن اور تاریخ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ گھڑی سے دن اور تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اندھیرے کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتا کیلنڈر کی طرف دیکھتا ہے اندھیرے کی وجہ سے کیلنڈر بھی صاف پڑھا نہیں جاتا۔ اُٹھ کی بتی جلاتا ہے مگر بتی نہیں جلتی۔ اسے یاد آتا ہے کہ جب بھی تیز بارش ہوتی ہے بجلی چلی جاتی ہے وہ ماچس جلا کر کیلنڈر پڑھتا ہے اسے تاریخ یاد آ جاتی ہے مگر وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اس تاریخ کے گرد پہلے سے دائرہ بنا ہوا ہے۔ ذہن پر زور دیتا ہے کہ اس نے کب اور کیوں یہ دائرہ لگایا مگر اسے بالکل یاد آتا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس تاریخ کی کیا اہمیت ہے پتہ نہیں اگلے روز سوئی گیس، بجلی یا ٹیلیفون کا بل جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے یا کسی لائسنس کی تجدید کرانے کی۔ اسے کسی سفر پر روانہ ہونا ہے یا کسی مقدمے کی پیروی کرنی ہی۔ کیا پتہ کسی مہمان کے آنے کا دن ہو، یا شہر میں کوئی اہم تقریب ہو رہی ہو؟ مگر اس سے پہلے اس نے کبھی کسی تاریخ کے گرد دائرہ نہیں لگاتا تھا یقیناً یہ کوئی نہایت ہی اہم بات تھی مگر کیا؟ اسے کچھ یاد نہیں آتا۔

وہ اُٹھ کر سگریٹ سلگاتا ہے اور لمبے لمبے کش لے کر کھانسنے اور سوچنے لگتا ہے۔

یہ اس کا برتھ ڈے بھی نہیں ہے۔ کسی بچے کی تاریخ پیدائش ہے نہ کسی شتہ داری کی برسی۔ اسے یاد آتا ہے کہ رات جب وہ سونے لگا تھا تو اس کی نگاہ ہر روز کی طرح کیلنڈر پر پڑی تھی اور کیلنڈر ر یہ دائرہ بالکل موجود نہیں تھا۔ اس کی ساری توجہ اسی ایک نکتے پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ یہ دائرہ کب، کیوں اور کس نے گایا؟ اگر یہ دائرہ اس نے خود لگایا ہوتا تو آتے جاتے وہ کام جو اُسے اس تاریخ کو سر انجام دینا تھا ضرور یاد آتا رہتا۔ لیکن اگر یہ دائرہ رات سونے سے پہلے کیلنڈر پر موود نہیں تھا تو پھر کہاں سے آ گیا؟ گھر کے سب لوگ پہاڑ پر گئے ہوئے تھے اور گھر میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پھر دروازہ بند تھا اور اگر دروازہ بند نہ بھی ہوتا تو کیا کوئی اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پھر دروازہ بند تھا اور اگر دروازہ بند نہ بھی ہوتا تو کیا کوئی اس کے کمرے میں محض تاریخ کے گرد دائرہ لگانے کے لئے گھُس آتا؟ اور کیوں ؟

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ کہیں اس نے سوتے میں اُٹھ کر خود ہی یہ حرکت نہ کی ہو مگر اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے پھر یہ دائرہ؟ اُسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ اس خواب کا تعلق اس تاریخ سے ہو۔ اسے خواب بہت آتے تھے مگر اکثر بھول جاتے تھے۔ دن کو چلتے پھرتے دفتر یا گھر کا کام کرتے ہوئے خواب سے مماثل کوئی صورتِ حال یا خواب میں دیکھا ہوا کوئی شخص مل جاتا تو لمحہ بھر کے لئے اسے خواب کا متعلقہ حصہ یاد آ جاتا پھر فوراً ہی ذہن سے اُتر جاتا۔ وہ خواب یاد کرنے گتا ہے مگر اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ بچپن سے لے کر اب تک اپنے ماضی کے سارے اہم واقعات اور حادثات کو ذہن میں لا کر تجزیہ کرتا ہے شاید اسے کسی ایسی بات کا سراغ مل جائے جس کا تعلق اس تاریخ سے ہو مگر اسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اسے نیند میں چلنے کی بیماری لگ گئی ہے اور اس نے خود ہی نیند میں اُٹھ کر کیلنڈر پر دائرہ لگایا ہے۔ وہ اپنے شک کی تصدیق کے لئے دوبارہ دِیا سلائی جلا کر کیلنڈر کے قریب آتا ہے اور یہ جان کر شُشدر رہ جاتا ہے کہ جس رنگ کی سیاہی سے وہ دائرہ لگا ہوا ہے اس رنگ کی سیاہی اس کے قلم میں نہیں ہے۔ پھر یہ دائرہ کب، کیوں اور کس نے لگایا اس کی حیرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سر کو ہاتھوں سے تھام کر بستر پر دراز ہو جاتا اور سوچنے لگتا ہے۔

وہ حیرت سے کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔

یہ وہ کمرہ نہیں ہے جہاں وہ رات کو سویا تھا اور جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے تک موجود تھا لیکن کمرہ جانا پہچانا ہے اسے اس سے مانوسیت کی ایسی خوشبو آتی ہے جیسے اپنے جسم پسینے سے آیا کرتی ہے۔ اچانک وہ چونک پڑتا ہے یہ تو وہی کمرہ ہے جہاں برسوں پہلے وہ اسے چھوڑ کر چپکے سے چلا آیا تھا۔ وہ حیرت سے چیزوں کو دیکھتا ہے سب کچھ ویسا ہی ہے۔ کھڑکیوں کے پردے-- فرنیچر--- گدیوں کے غلاف--- میز پوش--- ٹیبل لیمپ--- ریڈیو--- گلدان میں وہی پھول سجے ہیں جو دونوں سے اس شام فلم دیکھ کر لوٹتے ہوئے خریدے تھے۔ وہ ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھتا

ہے گیلے جوتوں کے نشانات بتاتے ہیں کہ وہ ابھی ابھی بارش میں بھیگتا اس کمرے میں داخل ہوا ہے۔ وہ کیلنڈر کو غور سے دیکھتا اور دنگ رہ جاتا ہے بوسیدگی سے ناآشنا وہ تیس برس پہلے کا کیلنڈر ہے مگر اسی تاریخ کے گرد اسی رنگ کی سیاہی سے دائرہ بنا ہوا ہے جیسا اس نے اپنے کمرے کے کیلنڈر پر دیکھا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ وہ اپنے سسی کمرے میں جہاں وہ برسوں سے زندگی گذار رہا ہے سویا پڑا ہو اور یہ سب کچھ خواب کی حالت میں دیکھ اور محسوس کر رہا ہو۔ کیا پتہ تیس برس بعد اس کے اندر یادوں کا بادل اتنے زور سے گرجا ہو کہ اس کی آنکھ برسوں پہلے کے زمانے میں جا کھلی ہو۔ مگر وہ کہاں ہے؟ اسکے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش نشِتر چبھونے لگتی ہے۔ اسی لمحے غسل خانے کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ بالکل وہی برسوں پہلے کا لباس پہنے اور وہی تولیہ سر پر لپیٹے باہر آتی ہے اور اس کی طرح دیکھے بغیر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ جاتی اور کنگھی کرنے لگتی ہے وہ حیران رہ جاتا ہے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا وہ بالکل ویسی ہی ہے ترو تازہ اور جواب۔ لگتا ہے اس کی عمر میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے۔

''کون؟''

''اس کی آواز میں وہی نو خیزی اور ترنم ہے

''میں ہوں '' وہ جواب دیتا ہے ''تم نے مجھے پہچانا نہیں ؟''

''وہ اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھتی ہے

''کون ہیں آپ؟''

''میں۔۔ میں ہوں '' وہ پریشان ہو جاتا ہے۔

اور جس طرح ہَوا تھم جائے تو پانی کی سطح پر تیرتی موجیں چت لیٹ جاتی ہیں اس کی پیشانی پر پڑے ہوئے بَل ہموار ہو جاتے ہیں اور وہ حیرت اور خوشی سے چیخ پڑنے کے انداز میں پوچھتی ہے۔

''ارے آپ؟''

''ہاں میں '' وہ کہتا ہے ''میں شرمندہ ہوں۔ یقین جانو۔ میں زندگی بھر پیشمان رہا'' وہ اُداس ہو جاتی ہے لگتا ہے جذبات پر قابو پانے کے لئے تگ و دو کر رہی ہے اسے اس کے اندر ٹپ ٹپ آنسو گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے مگر اس سے پہلے کہ ضبط کی برسوں لمبی سسکی کا گولہ اُدھڑنا شروع ہو جائے وہ اپنے مخصوص دلربا تبسم کی چادر پھر سے اوڑھ لیتی ہے اور کہتی ہے۔

''یہ آپ نے بڑھاپے کا سوانگ کیوں بھرا ہے؟''

’’یہ سوانگ نہیں حقیقت ہے‘‘

’’شاید تیس برس بعد آپ ایسے ہی نظر آئیں گے،

’’نظر آؤں گا نہیں ‘‘ وہ کہتا ہے ’’تیس برس بعد ایسا نظر آ رہا ہوں ‘‘

’’بھئی کیا مذاق ہے۔۔ ہٹائیے۔۔ میرا دل خرب ہوتا ہے‘‘

’’یہ مذاق نہیں ہے۔ میں تیس برس کی ازدواجی زندگی گزار کر آ رہا ہوں ‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘ وہ حیرت سے پوچھتی ہے ’’کس کے ساتھ؟‘‘

’’بھئی تم جانتی تو ہو۔۔ وہی تمہاری کو لیگ۔ چودھری علی محمد کی بیٹی ے میری شادی ہو گئی تھی۔۔ اس سے میرے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے۔ صرف ایک مسئلہ‘‘

’’آپ پھر مذاق کرنے لگے‘‘ وہ اس کی بات کاٹ کر کہتی ہے

’’ایسا نہیں ہو سکتا‘‘

’’ایسا ہوا۔۔ اس سے میرے بہت سے بچے ہیں اور تمہاری شادی بھی تو ہو گئی تھی؟‘‘

’’میری شادی ؟‘‘

’’ہاں۔۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے بچے بہت ہونہار ہیں اور تمہاری بیٹی کی شکل تم سے بیحد ملتی ہے۔‘‘

’’وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے، ہنسے چلی جاتی ہے اس کی ہنسی کی آواز ویسی ہی خوبصورت اور دلکش ہے جیسی ہوا کرتی تھی۔ ہنسی کا دورہ تھمتا ہے تو وہ سنجیدہ وہ کر کہتی ہے ’’مجھے سب معلوم ہے‘‘

’’کیا معلوم ہے؟‘‘

’’یہی کہ آپ مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں ‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’مطلب یہ کہ آپ کے کیلنڈر سے ایک تاریخ چوری ہو گئی ہے اور آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا اس تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ اس کی گمشدگی میں مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں ‘‘

’’یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔۔ تاریخ کیسے چوری ہو سکتی ہے؟‘‘

’’آپ سب جانتے ہیں مگر آپ تلخ حقائق کا سامنا کرنے سے ہمیشہ گری کرتے ہیں آپ نے میرے ساتھ بھی یہی کچھ کیا تھا اور اب تاریخ کے سلسلے میں بھی اپ جان بوجھ کر سائیڈ ٹریک کر رہے ہیں ‘‘

’’کیا تم مجھ سے بہت ناراض ہو؟‘‘

اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ وہ اچانک ہر بڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہے کھڑکی سے بارش کی بوچھاڑ اندر آ رہی ہے۔ وہ اُٹھ کر کھڑکی بند کرتا اور بتی جلا کر پہلے گھڑی دیکھتا اور پھر کیلنڈر پڑھتا ہے اور یہ جان کر کہ وہ تاریخ جس کے گرد کیلنڈر پر دائرہ لگا ہوا تھا، آئے بغیر گزر چکی ہے۔ وہ سر پکڑ کر رہ جاتا ہے۔

***

کالک

کچھ عرصہ ہوا میں نیک ہیں پڑھا کہ جس طرح ہنسنا اور مسکرانا صحت کے لئے مفید ہوتا ہے اسی طرح کبھی کبھی رو لینا بھی دل دل و دماغ اور روح کی صحت کے لئے ضروری ہے خواہ اپنے کسی جسمانی، روحانی یا ذاتی دکھ پر رویا جائے یا کوئی ناول پڑھتے، فلم دیکھتے یا کوئی جگ بیتی سنتے ہوئے بہر حال دل ہی دل میں کڑھتے اور سلگتے رہنے کی بجائے دل کی کیتلی کا ڈھکنا اٹھا دینا کہیں بہتر ہے۔ یہ بات مجھے پسند آئی اور میں نے پہلی بار غور کیا کہ میری بہت سے پریشانیاں اور ان میں آئے دن کا اضافہ محض اس لئے ہے کہ میری روح پر تال پڑا ہوا ہے۔ میں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ مجھے روئے ہوئے زیادہ نہیں تو بارہ تیرہ برس برس ضرور ہو گئے ہوں گے۔ آخری بار میں کب رویا تھا مجھے اچھی طرح یاد نہ،ن مگر میرا خیال ہے کہ اس وقت میں ابھی شہر میں نہیں آیا تھا۔ گاؤں کی کسی لڑکی کا بیاہ تھا ہاں مجھے یاد آ گیا فتح دین تیلی کی بیٹی کی ڈولی نکلی تھی اور بینڈ باجے والوں نے بابل سے بچھڑنے سے متعلق کسی گیت کی دھن بجائی تھی اور مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ فتح دین تیلی کی بیٹی نہیں میری سگی بہن ہے اس کے بعد میں شہر چلا آیا یہاں ایسے گیتوں کا سیلاب آتا تھا اس قسم کے کتنے ہی گیت میں پاؤں تلے روندنے لگا کبھی کسی گیت کو سن کر میرا جی نہ بھر آیا اور بھرتا کیسے قدم قدم پر طرح طرح کے گیت سنائی دیتے تھے جگہ جگہ ریڈیو چیختے تھے۔ اب اگر آدمی ہر گیت پر رونے لگے تو آٹھوں پہر روتا چیختا ہی رہے مگر ایک بات ضرور ہے رونے سے دل ہلکا ہو جاتا تھا۔ ہڈیاں بھی نہیں کھرتی تھیں مگر افسوس مجھے آہستہ آہستہ رونے کا ڈھنگ بالکل بھول گیا۔

پچھلے بارہ تیرہ برسوں میں میں نے کتنے ہی نشیب و فراز دیکھے ہیں کتنے ہی دل چیرنے اور تڑپانے والے مناظر آنکھوں کے سامنے آئے ہیں جنہیں دیکھ کر دل کو کچھ ہوتا بھی رہا ہے۔ مگر آنکھ سے آنسو کبھی نہیں ٹپکا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ میری سگی خالہ فوت ہو گئیں مجھے معلوم تھا کہ خاندان کے لوگ مجھ سے رونے کی توقع رکھتے ہوں گے اسی لئے میں نے کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے دوسروں کو خالہ کی میت پر بین کرتے اور پچھاڑیں کھاتے دیکھ کر عبرت حاصل کرنے اور خالہ کو اپنی سگی ماں فرض کر کے کود پر رقت طاری کرنے کی بہت کوشش کی مگر ایک بھی آنسو میری آنکھ سے نہ ٹپکا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے اندر لطیف جذبات کا بے حد صدمہ تھا اور میرے اندر آگ سی بھی سلگ رہی تھی مگر اس کا دھواں آنکھ کے راستے باہر جانے کی بجائے میری روح سے چمٹ گیا تھا۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ پچھلے بارہ تیرہ برسوں میں مجھے مصائب و آلام کے مراحل کبھی پیش نہیں آئے یا کسی جذباتی جسمانی دکھ سے دو چار نہیں ہوا۔ میں ایک عام آدمی ہوں جسے مشکلات، بیماریاں، پریشانیاں، حق تلفیاں، معاشی بد حالیاں اور دل اور خون کے رشتوں کی جذباتی بے قراریاں قدم قدم پر ٹھوکروں کی طرح ملتی ہیں، میں آہوں، آنسوؤں، سسکیوں، چیخوں، دکھوں اور موت کی ہولناکیوں سے بھر پور فلمیں دیکھتا رہا ہوں اور ٹریجک کہانیاں بھی پڑھتا رہا ہوں مگر شائد زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں میں ٹھوکروں کی اس قدر ارزانی ہے کہ آدمی ان کا عادی ہو جاتا ہے بلکہ ہر قدم پرنئی ٹھوکر کے لئے ذہنی طور پر تیار رہتا ہے۔

ویسے میں سمجھتا ہوں جب میں رو لیتا تھا اور میری ہڈیاں نہیں کھرتی تھیں۔ا س وقت میرا دل ایک بہتا ہوا دریا تھا گندا جوہڑ نہیں تھا۔ جذبات و محسوسات کی مچھلیوں کا دم نہیں گھٹتا تھا۔ اور وہ بدبو نہیں پھیلاتی تھیں، تڑپتی مچلتی اور تیرتی ہوئی سیدھی نکل جاتی تھیں۔ مگر اب میرے اندر کے جوہڑ میں نہ جانے کیا کیا کچھ گل سڑ چکا ہے کہ بعض اوقات مجھے خوشبو اور خوشبو اور بدبو میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جب میں رو لیتا تھا میری سوچیں سیدھی سادی نرمل اور پاک صاف تھیں دوسروں کے بارے میں اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں سوچتا تھا۔ ہر بات دل سے اٹھتی تھی۔ اور سچ ہوتی تھی، شائد اسی لئے سیدھی دل میں اتر جاتی تھی۔ میں نے جس لڑکی سے پہلے پہل اظہار محبت کیا تھا مجھے اس سے سچ مچ محبت تھی میں اسے جو کچھ کہتا تھا سب سچ ہوتا تھا مجھے اس کی آنکھیں اچھی لگتی تھیں۔ اور میں صرف اس کی آنکھوں کی تعریف کرتا اور انہی کر بارے میں سوچتا تھا۔ مگر اب کسی شاعر لڑکی کا جسم اچھا لگے تو اس کی غزل کے مجموعی تاثر کی تعریف کرتا ہوں اور افسانہ نگار خاتون اچھی لگیں تو بات افسانے کے عنوان کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ محض اس لئے ہے کہ مجھے روئے ہوئے بارہ تیرہ برس ہو گئے ہیں اور میرے اندر معصومیت اور سادگی کا قحط پڑ گیا ہے۔ ورنہ میں پہلے کبھی ایسا نہ تھا میرا اندر بے حد اجلا اور سفید تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرے اندر کی دیواریں کالک سے نا آشنا تھیں، میں ایک ایسے لڑکے کے لئے دھاڑیں مار مار کر رویا تھا جس نے بس کے نیچے آ کر کچلے جانے سے دو ایک روز پہلے مجھے ربڑ کی ایک گیند کی وجہ سے تختی سے پیٹا تھا مگر پھر بھی میں اس کے مرنے پر بہت رویا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ میری بد دعا سے مر گیا ہو میں اس کی قبر پر نئی گیند خرید کر لے گیا تھا اور ہچکیاں لے لے کر کہا تھا۔ ’’گلو یار تم تو سچ مچ روٹھ گئے یہ لو نئی گیند اور واپس آ جاؤ خدا کی قسم اب کبھی تمہیں بد دعا نہیں دونگا۔‘‘

ویسے ہی تو اب کبھی کسی دوست یا دشمن کی موت مجھے اداس کر دیتی ہے (ہاں ابھی کر دیتی ہے) میں آہیں بھی بھرتا ہوں ہمدردی بھی محسوس کرتا ہوں اور مرنے والے کے لواحقین پر ترس بھی آتا ہے۔ لیکن آنکھ میں آنسو نہیں آتا۔ اور اس نہ

رو سکنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ میرے اندر کے جوہڑ میں مری ہوئی مچھلیوں کی بو اور زیادہ پھیلتی جا رہی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میر ی کوکھ میں کوئی مکروہ سی چیز لے رہی ہے اس لئے میں رونا چاہتا ہوں تاکہ اس مکروہ چیز کا پیدا ہوتے ہی گلا دبا دوں۔

اپنی کوکھ میں کسی مکروہ چیز کے بارے میں مجھے اس وقت پتہ چلا جب پڑوسی کا مسروقہ ریڈیو چھ ماہ بعد اچانک مل گیا پولیس نے یہ ریڈیو کسی عادی چور سے برآمد کیا تھا مجھے اپنے پڑوسی کا ریڈیو مل جانے کی خوشی مجھے نہ جانے کیوں پھیکی پھیکی اور بد مزہ سی معلوم ہوئی میں نے اپنے پڑوسی کو مبارک باد بھی دی اور وہ میرے گہرے خلوص و ہمدردی کے جذبات سے متاثر بھی ہوا مگر کوئی انجانی بیزاری میرے وجود کے چاروں طرف مکھی کی طرح بھنبھناتی رہی جب میں نے اس بیزاری اور بدمزگی کا تجزیہ کیا تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں اس قدر کمینہ بھی ہو سکتا ہوں اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ریڈیو گم ہو جانے کے بعد پڑوسی نے ریڈیو کا ایریل مجھے دے دیا تھا۔

اس سے بڑھ کر کمینگی کا ثبوت میں نے اس وقت دیا جب نور علی کا جنازہ پڑھا جا رہا تھا۔ نور علی کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو ان بیوی اور بوڑھے والدین تھے۔ وہ میرا ساتھی اور دوست بھی تھا میرے ساتھ اس کے تعلقات اور مراسم بھی اچھے تھے ہم اکٹھے شطرنج کھیلتے اور سیر کو جاتے تھے۔ دفتر میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے اس کی موت دماغ کی رگ پھٹ جانے سے اچانک ہو گئی تھی۔ میں اس کا قریبی دوست تھا اس لئے سب سے پہلے مجھے اطلاع دی گئی مجھے اس کی موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ اس کے بچوں کی چیخیں میرا دل چیر گئیں۔ اس کی بیوہ کے بین میرا کلیجہ چھلنی کر گیا اور اس کے بوڑھے والدین کی دھاڑیں سن کر میرا جسم لرزنے لگا مگر مجھے رونا نہ آیا۔ رونے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ دفتر کے دوسرے لوگوں کو اطلاع دی، قبر کھودنے، نہلانے اور جنازہ پڑھنے کا انتظام کیا، اس کے رشتہ داروں کو ٹیلی فون کئے، تار دئیے، اس کے بال بچوں کو تشفی دی آنے جانے والوں کے لئے اٹھنے بیٹھنے کا انتظام کیا۔ جب جنازہ گھر سے روانہ ہوا۔ بڑا تڑپانے اور رلانے والا منظر تھا۔ مجھے رونے کی فرصت بھی تھی۔ اس سے بہت اور موقع کیا ہو سکتا تھا کاش میری آنکھوں میں ایک آدھ آنسو ہی آ جاتا مگر کیسے آتا میری روح پر تو تالا پڑا تھا۔ میرے اندر کی دیواروں کی سفید کالک سے سیاہ ہو چکی تھی گندے جوہڑ میں مردہ مچھلیوں کا ڈھیر لگ چکا تھا اور چاروں طرف بدبو پھیل چکی تھی۔

جب نور علی کا جنازہ پڑھا جا رہا تھا تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اچانک خوشبو کی لہر کی طرح ایک خوشگوار خیال میرے اور نور علی کی میت کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا کہ نور علی کے مرنے سے اب سنیارٹی لسٹ میں میرا چوتھے سے تیسرا نمبر ہو جائے گا۔ اور اس طرح شائد اب مجھے تین سالوں کی بجائے دو سالوں میں ترقی مل جائے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ میں اس سے پہلے دیانت داری کے سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان پاس کر چکا ہوں۔ ایک مرتبہ دکاندار سے پانچ روپے کا سودا سلف خرید کر میں نے اسے دس روپے کا نوٹ دیا تو اس نے پچانوے روپے واپس کئے لیکن میں نے صاف دلی سے نوے روپے لوٹا دئیے۔

ایک بار مجھے بغیر کسی خطرے اور اندیشے کے راتوں رات امیر ہو جانے کا موقع ملا لیکن نہ جانے کہاں سے میرے پیٹ میں قوم کا درد اٹھنے لگا اور یوں میں آزمائش پل صراط سے صحیح سالم گزر گیا۔

میرا خیال ہے میں برا آدمی نہیں ہوں۔ صرف نہ رونے کی وجہ سے میرا دل روز بروز مٹھی کی طرح بھنچتا جا رہا ہے یا پھر باہر اس قدر سردی ہے کہ دن بدن میں اپنی کھال کے اندر سکڑتا جا رہا ہوں۔ ورنہ مجھے اپنے اکلوتے انعامی بانڈ پر انعام نہ نکلنے کی خوشی نہ ہوتی۔ جو خوشی مجھے صرف اس لئے ہوئی کہ میرے ماموں زاد بھائی کے انعام بھی نہیں نکلا تھا جس کے پاس ان گنت بانڈز تھے۔

یوں لگتا ہے جیسے میرے ہر زخم پر لہو کی پہلی بوند کھرنڈ بن جاتی ہے۔ غلیظ خون بہہ نہ سکے تو بدبو پیدا ہو جاتی ہے مگر نہیں۔۔!

خون بہتا رہے خواہ وہ گندا اور غلیظ ہی کیوں نہ ہو تو جسم کی ساری تپش اور حرارت ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے ماں کے مرنے کے بعد غلام محمد کا جسم سن ہو گیا ہے، روح یخ بستہ ہو گئی ہے۔ اور وہ برف کے تودے کی طرح کھلکھلاتا نظر آتا ہے۔

اس کی ماں بوڑھی اور ضعیف تھی۔ اکیلی دوسرے شہر میں رہتی تھی وہ اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی اور اس کی ماں میں ساس بہو کا رشتہ تھا ساس اور بہو کا بیر ہماری قدیم روایت ہے۔

روایتوں کے کپڑے خواہ وہ تار تار ہو جائیں یا ساری دنیا انہیں پہن کر اتار چکی ہو ہم ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ غلام محمد کی ماں اس کے پاس آ کر اور زیادہ بیمار ہو جاتی تھی۔ اس لئے وہ بیماری اور ضعیفی کے باوجود علیحدہ رہنے کو بہتر سمجھتی تھی۔ غلام محمد اس کی بیمار پرسی اور خبر گیری کے لئے اکثر جانا پڑتا تھا۔ بار بار دفتر سے چھٹی لینی پڑتی تھی۔ دوائیوں اور کرایوں پر تنخواہ کا ایک بڑا حصہ اٹھ جاتا تھا پھر بھی وہ ایک فرمانبردار اور ہونہار بیٹے کی طرح ماں کی خدمت کر رہا تھا۔ مگر پھر ماں اس دنیا سے (جہاں ڈاکٹروں کی فیسیں بھاری ہیں جہاں ہسپتالوں میں سفارش سے داخلہ ملتا ہے اور جہان دوائیوں کے اخراجات سے مر جانا کہیں زیادہ سہل اور سستا ہوتا ہے) ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ غلام محمد دھاڑیں مار مار کر رویا۔ اس قدر رویا کہ اس کا اندر خالی ہو گیا، لہو نچڑ گیا اور جسم سرد ہو گیا۔ جب وہ ماں کو کفنانے اور دفنانے کے بعد لوٹا تو میں۔۔ جو کھرنڈ کھرچ کھرچ کر عاجز آ گیا تھا۔ اس کے پاس اظہار افسوس کے لئے گیا اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ غلام محمد کا دل رو رو کر بالکل بنجر ہو گیا ہے اور اس کی کوکھ بھی خالی ہے، یا شائد اپنے اندر کی کالک کی وجہ سے مجھے ہر چیز سیاہ اور مٹیالی نظر آتی ہے۔

غلام محمد ماں کے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کی اندوہناک باتیں لہک لہک کر کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر زور تھے مگر لہجے میں برف کی سی ٹھنڈک تھی یا شائد مردہ مچھلیوں کی بو کی وجہ سے میں خوشبو اور بدبو میں تمیز نہیں کر سکتا کیوں کہ مجھے روئے ہوئے کم از کم بارہ تیرہ برس ہو گئے ہیں۔

***

کاشی

اس کا نام کاشی ہے اور وہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔

یوں تو ہر باپ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے مگر میں کاشی سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں ایک تو یہی کہ ڈھلتی عمر کی اولاد ویسے ہی زیادہ عزیز ہوتی ہے شاید آدمی اس کے مستقبل کی متوقع خوشیاں نہ دیکھ سکنے کے خوف میں مبتلا ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ عمر کے اس دور میں پہنچنے تک آدمی ریاکاریوں، منافقتوں اور مکاریوں کے اتنے خار زار عبور کر چکا ہوتا ہے کہ چلتے چلتے پاؤں کے نیچے جب کبھی معصومیت کی نرم نرم اور ہری بھری گھاس آ جاتی ہے تو اسے عجیب میٹھی میٹھی گدگدی کا احساس ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے اوائل عمری میں جب دل میں خود رو پودے اگتے اور ان میں جذبوں کے شگوفے پھوٹتے تھے تو میں کسی کے بارے میں کوئی اندوہناک خبر سن کر اس قدر ملول ہو جاتا تھا کہ بھوک مر جاتی اور نیند اڑ جاتی تھی مگر پھر جب اندر اگنے والے خوشنما اور نازک پودے بڑھ کر تن اور درخت بن گئے تو آہستہ آہستہ میرا سارا اندر کاٹھ کا ہو گیا۔ لطیف جذبوں کے پرندے بہت کم ادھر کا رخ کرتے اور اگر کبھی کرتے تو تھوڑی دیر کے لئے کسی ڈال پر بیٹھ کر چہچہاتے مگر پھر کرخت سوچوں کا کلہاڑا چلنے کی آواز سن کر فوراً ہی اڑ جاتے۔ اب مجھے اپنی عمر کے ہر آدمی کی طرح ہر بات میں مکاری، عیاری اور جھوٹ کی ملاوٹ نظر آنے لگی ہے شاید اس لئے کہ میں نے ہر جگہ یہی کچھ دیکھا اور برتا۔ اگر کہیں کسی بات میں مکاری نہ بھی ہو تو میرا ذہن اپنے پاس سے اس کی آمیزش کر لیتا ہے۔

ایک وقت تھا کہ افسانہ یا ناول پڑھتے اور ڈرامہ یا فلم دیکھتے ہوئے میں ہیرو یا ہیروئن کی ٹریجڈی پر بے اختیار رو پڑتا تھا مگر اب ہیروئن زہر پھانکتی یا ہیرو پھانسی چڑھتا ہے تو مزے سے آئس کریم کھاتا اور کوک پیتا رہتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندر جذبوں اور احساسات کے دریاؤں کی ساری مچھلیاں خود غرضی کے اود بلاؤں نے مار کر کھا لی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ناول یا فلم میں کسی بچے کی ماں مر جاتی تھی تو اپنی ماں کی موت پر روکا ہوا بے شمار رونا میرے دامن ضبط کو تار تار کر دیتا تھا مگر اب ہیرو کی ماں مر جاتی ہے تو میری خبیث آنکھ اس ٹوہ میں ہوتی ہے کہ مرنے کی اداکاری

کرنے والی اداکارہ کی بھنووں یا ہونٹوں میں کسی قسم کی جنبش تو نہیں ہو رہی ؟ لطیفوں اور ایسی باتوں پر جن کو سن کر کبھی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے، اب میں ناک بھوں چڑھاتا ہوں۔ مجھے ان سے عمومیت،بازاری پن اور اوور ایکٹنگ کی بو آتی ہے۔ اخبارات میں آئے دن اندوہناک وارداتوں، مظالم اور انسانی بربریت کے واقعات پڑھتا رہتا ہوں اور لمحہ بھر کے لئے ناگواری کا احساس مجھے بدمزہ بھی کر دیتا ہے مگر پھر سب کچھ اندر کے سؤر کے پیچھے بھونکتے کتوں کے شور میں دب جاتا ہے۔

پتہ نہیں کیوں جیسے جیسے ہماری عمریں کم ہوتی جاتی ہیں ہم زیادہ خود غرض اور بے رحم ہو جاتے ہیں ہم ایسی چیزوں، لوگوں، حتیٰ کہ قریبی عزیزوں سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے جن سے ہمیں جلد یا بدیر کسی مالی منفعت کی توقع یا نقصان کا احتمال نہ ہو۔ پچھلے برس ہمارے پڑوس میں ایک ایسا ہی خاندان آ کر آباد ہوا۔ محلے میں کوئی مرے یا جئے ان کی بلا سے ۔۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہم نے بھی انہیں شادی غمی کی ہر تقریب میں بلایا مگر انہوں نے معذرت کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔ کاشی کبھی کھیلتا ہوا ان کے گھر چلا جاتا تو وہ اس ڈر سے کہ ان کی چیزیں الٹ پلٹ نہ دے نہایت رکھائی سے اسے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتے۔۔ مگر جب سے ہمارے ہاں ٹیلیفون لگا ہے اور ان لوگوں کی لوکل اور ٹرنک کالیں آنے جانے لگی ہیں ان لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ بالکل اپنوں جیسا ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ٹیلیفون کے تار ان کے دلوں کے گرڈ سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں ذرا سا کوئی بیمار پڑ جائے تو ان کے دلوں میں محبت اور بھائی چارے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ کاشی کے لئے اکثر کھلونوں، مٹھائیوں اور پھلوں کے تحفے آتے رہتے ہیں اور اگر وہ کسی روز ان کے گھر کھیلنے نہ جائے تو اس کی آنٹی کو اپنا گھر اور آنگن سونا لگنے لگتا ہے۔

کاشی سے میرے بے پناہ محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے فنا کا خوف جو میرے ذہن اور روح سے ہر لمحے چمٹا رہتا تھا وہ بہت حد تک دور ہو گیا ہے اب مجھے احساس ہو تا ہے کہ میں اپنے بعد کاشی اور کاشی کے کاشی کی صورت میں زندہ رہوں گا۔ دئیے سے دیا جلتا رہتا ہے۔جلتا چلا جاتا ہے۔انسان اتنا فانی بھی نہیں ہے۔

کاشی میرا مستقبل بھی ہے جو ہمیشہ خوش آئندہ ہوتا ہے اور ماضی بھی۔ اس کی شکل و صورت اور بہت سی عادتیں مجھ سے ملتی جلتی ہیں اور میں اس کی شکل و صورت میں اپنے بچپن کو بالغ نظروں سے دیکھتا اور خوش ہوتا ہوں۔ میں اسے وہ سارے کھیل کھیلتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں جو میرے کھیلنے سے رہ گئے تھے۔ میں اسے وہ ساری محبتیں دینا چاہتا ہوں جن سے میں بچپن اور زندگی میں محروم رہا اور میں اسے وہ ساری چیزیں کھلانا چاہتا ہوں جن کے لئے میں ترستا رہا۔ میرا جی چاہتا ہے اسے ہر وقت وہ آم چوستے ہوئے دیکھتا رہوں جو بچپن میں ایک بار سوتیلی ماں نے میرے ہاتھ سے چھین کر خود کھا لیا تھا۔

کاشی نے جب سے بولنا اور چلنا پھرنا سیکھا ہے میں فارغ اوقات میں اسے اکثر اپنے ساتھ رکھتا ہوں دوستوں کی بے وفائیوں اور رشتہ داروں کے حاسدانہ رویوں سے اکتا کر میں نے اس کی محبت میں پناہ ڈھونڈھ لی ہے۔ ہم دونوں اکثر ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے اور بازاروں، باغوں اور پارکوں میں اکٹھے گھومتے ہیں میں اس کے ساتھ ہم عمر دوست کا سا سلوک کرتا ہوں اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور کھیلوں میں پوری دلچسپی لیتا ہوں۔ اگر وہ تتلی پکڑنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو میں تتلی پکڑ کر اس پر اپنے بڑے ہونے کا رعب نہیں جماتا، تتلی نہ پکڑ سکنے کی اداکاری کر کے اس کی انا کو تسکین پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اب وہ پہلے کی نسبت کافی سمجھدار ہو گیا ہے ورنہ پچھلے سال جب وہ میرے ساتھ بازار جاتا تھا۔ تو میری آنکھ بچا کر مٹھائی یا ٹافیوں کی کسی دکان میں گھس جاتا اور دکاندار سے کہتا۔

''یہ دے دو۔''

مگر اب اسے پتہ چل گیا ہے کہ یہ چیزیں ایسے نہیں مل جاتیں ان کے لئے پیسے دینا پڑتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں پیسے اور سکے کی اہمیت واضح ہوتی جا رہی ہے مگر ابھی اسے حساب کتاب کا شعور نہیں ہے نہ اسے یہ معلوم ہے کہ پیسے کہاں سے اور کیسے آتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ہر چیز کی قیمت ایک چونی ہوتی ہے۔ ایک روز جوتوں کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے نئے جوتے لے دیں۔''

میں نے کہا۔ ''پھر کبھی لے دوں گا۔''

اس نے اصرار کیا اور کہا۔ ''ابھی لے دیں نا۔''

اس پر میں نے کہا۔ ''بیٹے میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔''

اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چونی نکال کر کہنے لگا۔

''میرے پاس ہیں۔''

میں اس کی ایسی معصومانہ باتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں لیکن یہ خیال مجھے فوراً ہی افسردہ کر دیتا ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب اسے گنتی یاد ہو جائے گی۔ چیزوں کی قیمتوں اور اپنی قوت خرید کا شعور حاصل ہو جائے گا اور ہندسوں اور اعداد کے چکر میں پڑ کر اس کے سارے سہانے خواب چور ہو جائیں گے۔

ہم سیر کے لئے نکلتے ہیں تو میں اس خیال سے کہ اس میں زندگی کی دشواریوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا ہو اس کے لئے نسبتاً مشکل راستوں کا انتخاب کرتا ہوں۔ اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہوں مگر وہ اس کا برا نہیں مانتا۔کیوں کہ اسے آسان اور مشکل راستوں کا فرق معلوم نہیں ہے۔ اس لئے اگر

کبھی سیڑھیاں اونچی ہوں اور اس سے عبور نہ ہو سکتی ہوں تو وہ بیٹھ کر اور گھسٹ کر انہیں عبور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے فٹ پاتھ سے بچ بچا کر گزر جاتا ہے۔ مگر بنانے والوں کی نیت اور کارکردگی پر شک کا اظہار نہیں کرتا۔ مین ہول کے ڈھکنے چوری کرنے والوں کو گالیاں نہیں دیتا اور کارپوریشن کے عملے کی نا اہلی کا شکوہ نہیں کرتا۔ میں سوچتا ہوں کاشی کتنے مزے میں ہے۔سارا آشوب تو آگہی کاہے۔حقیقت سے آگاہ ہو کر آدمی کتنا غیر مطمئن ہو پریشان ہو جاتا ہے۔ ذہنی طور پر نابالغ لوگ کتنی سادگی اور معصومیت سے استحصالی قوتوں اور صورت حال کا شکار رہتے ہیں مگر کتنے مطمئن اور قانع نظر آتے ہیں۔

کاشی کو ہر بچے کی طرح پرندے، جانور اور ان کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں میں اسے تمام کہانیاں جو مجھے یاد تھیں سنا چکا ہوں لیکن اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ میں ہر بار نئی کہانی سناؤں۔چنانچہ میں جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں اپنے پاس سے گھڑ گھڑ کر سناتا رہتا ہوں۔ اس طرح میرا اپنا بھی کیتھارسس ہوتا رہتا ہے مثلاً میں نے پچھلے دنوں اسے طوطوں والی ایک کہانی سنائی اس کہانی میں ایک باغ کا ذکر تھا جس میں طرح طرح کے خوبصورت اور پھلدار درخت تھے مگر جب بھی بور آتا اور پھل لگتا، قریبی جنگل سے ہریل طوطوں کی ایک ڈار آ جاتی اور کچے اور ادھ پکے پھلوں کو کتر کتر کر نیچے پھینکنے لگتی۔ یوں ہر بار پھلوں کے پکنے سے پہلے سارے پیڑ ویران اور بے ثمر ہو جاتے۔

کاشی ابھی کم سن ہے اس لئے اسے کہانی سنانے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔وہ سوال جواب نہیں کرتا اور ہر بات چپکے سے تسلیم کر لیتا ہے مثلاً طوطوں والی اس کہانی کو سن کر وہ یہ نہیں پوچھتا کہ باغ کے رکھوالے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ اور اپنی غلیلوں سے ان کو مار یا بھگا کیوں نہیں دیتے۔

میں چونکہ کاشی سے محبت کرتا ہوں اس لئے اس کے بارے میں ہر وقت فکرمند رہتا ہوں۔ مجھے خوف لگا رہتا ہے کہ وہ ٹرائی سائیکل سے گر کر زخمی نہ ہو جائے، چاقو یا بلیڈ سے انگلی نہ کاٹ بیٹھے،چولہے کے قریب جانے پر اس کا ہاتھ یا پاؤں نہ جل جائے۔ کوئی سکہ نہ نگل لے یا کوئی دوسرا بچہ پتھر مار کر اس کی آنکھ نہ پھوڑ دے۔ رات کو وہ زکام کی وجہ سے زور زور سے خراٹے لیتا ہے تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے خدانخواستہ اسے خناق یا نمونیہ تو نہیں ہو گیا ؟بیمار پڑ جائے تو ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے ہچکچاتا ہوں کہیں وہ کوئی مہلک یا خطرناک بیماری دریافت نہ کر لے۔

اس نے جب سے چلنا پھرنا سیکھا ہے۔ مجھے گلیوں اور محلوں میں سائیکلیں دوڑانے اور سکوٹر اور کاریں بھگانے والے کھٹکنے لگے ہیں۔ مجھے یہ سوچ کر ہول آتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد جب وہ اسکول جانے لگا تو اسے سڑکیں پار کرتے ہوئے کتنی ہی موٹر سائیکلوں اور تیز رفتار گاڑیوں سے بچنا ہو گا اور اس کی سلامتی کیسے کیسے غفلت شعار اور رفتار کے نشے میں چور ڈرائیوروں کے رحم و کرم پر ہو گی۔

گلی محلے میں کوئی اجنبی شخص نظر آ جائے تو مجھے اس پر بردہ فروش ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ ہم نے کاشی کو سخت تاکید کی ہوئی ہے کہ وہ گھر سے باہر کسی آدمی پر اعتبار نہ کرے اور کھلونا یا کھانے پینے کی چیز ہرگز قبول نہ کرے اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ وہ گم ہو جائے یا کھو جائے تو اسے والدین کے نام اور گھر کا پتہ یاد ہو ہم نے باتوں باتوں میں یہ معلومات ذہن نشین کرا دی ہیں۔ ایک روز وہ گلی میں کھیل رہا تھا اس کی امی باورچی خانے سے نکل کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے ایک نظر دیکھ لیتی تھی کہ اچانک وہ بھاگتا ہوا اندر آیا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا اور اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی امی نے پوچھا۔

''کیا ہوا بیٹے؟''

کہنے لگا۔ ''امی ۔۔آدمی۔''

اس کی امی نے بھاگ کر دروازہ بند کر لیا کیونکہ وہ آدمی اس کے پیچھے پیچھے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اسی لمحے باہر سے آواز سنائی دی۔

''بیٹی میں اختر علی ہوں ۔۔ ادھر سے گزر رہا تھا کہ کاشی کو دیکھ کر رک گیا۔میں اسے پیار کرنا چاہتا تھا مگر وہ ڈر کر اندر بھاگ آیا۔آپ لوگوں نے آدمیوں سے اسے اس قدر خوفزدہ کیوں کر رکھا ہے؟''

پچھلے دنوں سابقہ تلخ تجربوں کی بنیاد پر بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ کاشی کے نرسری کلاس میں داخلہ کی بروقت رجسٹریشن کروا لینی چاہیے تاکہ بعد میں دشواری نہ ہو۔ میں نظریاتی طور پر انگلش میڈیم تعلیم کے خلاف ہوں۔ اپنی قومی زبان سے محبت کرتا اور انگریزی زبان کی بالا دستی کے خلاف تقریریں کرتا رہتا ہوں۔ لیکن کاشی کے لئے میں نے انگلش میڈیم سکول میں داخلے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ مجھے اس سے محبت ہے اور میں اسے اپنی طرح ناکامیوں اور احساس کمتری کا شکار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے نرسری کلاس میں اس کے داخلہ کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان سے پتہ چلا کہ اس کے لئے اسے جنوری اور جون کے درمیان کسی وقت پیدا ہونا چاہیے تھا جب کہ وہ چودہ اگست کو پیدا ہو گیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ایک جھوٹا برتھ سرٹیفیکیٹ بنوایا جائے اور اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز اور بنیاد ہی جھوٹ پر استوار ہو۔ میں ہر تعلیم یافتہ شخص کی طرح جھوٹ کو ناپسند کرتا ہوں مگر کیا کیا جائے مجھے کاشی کا مستقبل بہت عزیز ہے۔ویسے بھی جہاں تک سرٹیفیکیٹ کا تعلق ہے میں اسے معمول کا ایک حصہ خیال کرتا ہوں۔دفتری امور میں ہر بات پر سرٹیفیکیٹ اور بیان حلفی مانگا جاتا ہے اگر ہم سچ اور جھوٹ کے چکر میں پڑے رہیں تو دفتری امور تو ایک طرف تنخواہ، اوور ٹائم، اور ٹی اے ڈی اے کچھ بھی وصول نہ ہو مثلاً مجھے تین سو روپے ماہوار سواری الاؤنس یہ سرٹیفیکیٹ دینے پر ملتا ہے کہ میں نے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لئے کم از کم تین سو میل سفر کیا ہے اگر میں نے یہ سفر دو سو ننانوے میل کیا ہو اور سچ بولتے ہوئے اس کا اندراج بھی اسی طرح کر دوں تو مجھے ایک پیسہ تک نہیں مل

سکتا۔ اب کون اتنا احمق ہو گا جو اتنا بے ضرر سا جھوٹ نہ بول کر مہنگائی کے اس زمانے میں پورے تین سو روپے کا نقصان کر بیٹھے۔ سچی بات یہ ہے کہ غیر فطری قوانین اور ضابطے بنا کر بد دیانتوں اور مجرموں کی ایک پوری نسل پیدا کی جا سکتی ہے۔ آپ بے شک مستطیل یا مربع کے اضلاع پر سڑکیں اور فٹ پاتھ بنوا دیں مگر جیومیٹری اور ریاضی سے نابلد شخص بھی وتر کے مقام پر شارٹ کٹ خود تلاش کر لیتا ہے۔

میں نے کاشی کے کیرئیر کے بارے میں بھی سوچا ہے اگرچہ میرا جی یہی چاہتا ہے کہ اسے ایسی تعلیم دلاؤں اور اس کے لئے ایسے مضامین کا انتخاب کروں جو اسے بہتر انسان بننے میں مدد دیں مگر میں نے اپنے مشاہدات کی روشنی میں فیصلہ کیا ہے کہ میں اسے ایسی تعلیم دلاؤں گا کہ وہ کچھ اور بنے یا نہ بنے معاشی اور اقتصادی طور پر بہرحال آسودہ حال انسان ہو۔

کاشی کی وجہ سے گھر کا ماحول ہی نہیں بدلا، میرا مزاج اور بہت سی عادتیں بھی تبدیل ہو گئی ہیں میں رات کو اکثر دیر سے گھر آنے کا عادی تھا مگر اب زیادہ تر وقت گھر پر گزارتا ہوں گھر کے دوسرے افراد کی طرح میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ کاشی کو خوش رکھا جائے اور اس کے سامنے چیخ یا چلا کر بات نہ کی جائے۔ گالی نہ بکی جائے۔ الزام تراشیاں نہ کی جائیں، جھوٹ نہ بولا جائے۔ بات بے بات سرزنش کر کے اس کی انا اور تشخص کو مجروح نہ کیا جائے اور اس پر بلاوجہ پابندیاں لگا کر اس کے دل میں نفرت کا بیج نہ بویا جائے۔۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کاشی نے میری ہمت اور حوصلے کو پست کر دیا ہے۔ اس سے پہلے اگر میرا نا اہل اور بدمزاج باس بلاوجہ مجھ پر بگڑتا یا میرے ساتھ نا انصافی کرتا تھا تو میں اس کے منہ پر فائل مار دینے کا حوصلہ رکھتا تھا مگر اب بہت کچھ سن اور سہہ لیتا ہوں۔ پہلے اگر میں جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کو جہاد سمجھتا تھا تو اب خاموش رہنے کو جہاد سمجھتا ہوں۔ میں نے مصالحت اور مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور اپنے بہت سے نظریات میں لچک پید کر لی ہے اور یہ سب کچھ میں نے کاشی کی وجہ سے کیا ہے۔ میرا خیال ہے میں اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔ اگر اس کے گلے پر چھری رکھ کر مجھے کسی ناکردہ گناہ کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا جائے تو میں اس کے گلے پر چھری نہیں چلنے دوں گا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کتنے عظیم اور غیر معمولی انسان تھے جو اپنے بیٹوں کو حق کی راہ میں قربان کر دینے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتے تھے۔ میں نے خود سے کئی بار سوال کیا ہے کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں مگر مجھے بڑے سے بڑے آدرش کے لئے بھی اپنی طرف سے خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ملا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کاشی سے بڑھ کر میرا کوئی آدرش نہیں ہے۔مجھے اپنی اس خود غرضی اور بزدلی پر ندامت ہے۔مجھے اپنے جرم کا احساس ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ میں اکیلا نہیں، اپنے اپنے کاشی سے محبت کرنے والے بہت سے اور لوگ بھی اسی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اسی کی سزا پا رہے ہیں۔

❋ ❋ ❋

خلا اندر خلا

اس کے سمانے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر بڑی باتیں لکھی پڑی ہیں۔ جونہی شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھا ہوا شخص اشارہ کرتا ہے وہ بولنا شروع کر دیتا ہے۔مگر آج سے اپنی آواز بدلی بدلی معلوم ہوتی ہے۔ شاید بھی اس کا وہم ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی آواز تبدیل ہو جاتی ہے۔ جیسے اس کے اندر کوئی اور بول رہا ہو۔ وہ چپ ہو جانا چاہتا ہے مگر سمانے بیٹھا ہوا شخص اسے بات جاری رکھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ بولتے بولتے اسے لگتا ہے کہ جیسے اس کی آواز مدھم ہونے گی ہے اور آہستہ آہستہ سرگوشی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ وہ معذرت کر کے گلا صاف کرتا اور اپنے اندر سے آواز کا سوت کھینچ نکالنے کے لئے زور لگاتا ہے مگر شاید اس کے اندر آواز کے سوت کا سارا گچھا ختم ہو گیا ہے۔ اس کی آواز مسلسل ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ پھر اچانک اسے لگتا ہے کہ جیسے وہ چپ ہو گیا ہو۔ حالانکہ اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں اور نہ کر سکتا ہے۔ اگر کر سکتا تو وہ گھر سے سیدھا یہاں نہ آتا۔ کسی اور طرف کو نکل جاتا۔ کسی بِل رہے ہیں۔ وہ پریشان ہو کر شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھے ہوئے شخص کو معذرت طلب نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس شخص کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئی ہوں۔ گی وہ سٹپٹا کر کھڑا ہو جائے گا اور ابھی ابھی چند لمحوں میں ہر طرف اُودھم مچ جائے گا۔ مگر یہ دیکھ کر اے بے حد مسرت ہوتی ہے کہ سامنے والا شخص نہایت پر سکون اور مطمئن ہے۔ بالکل اس کی بیوی کی طرح جو صبح ہی صبح اسے شرمندہ کر کے باورچی خانے میں جا کر روٹیاں پکانے لگی تھی۔ پتہ نہیں آج کیسی صبح طلوع ہوئی تھی کہ ہر چیز کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ رنگ بدلا ہوا نہ ہوتا تو صبح ہی صبح اُسے خفت نہ اٹھانا پڑتی۔ اس نے منڈیر پر بیٹھے ہوئے کبوتر کو دیکھ کر یوں ہی کہہ دیا تھا۔

’’واہ کیا صحت مند کبوتر ہے۔‘‘

’’وہ اچھا تو اب آپ کو کوے بھی کبوتر نظر آنے لگے ہیں۔‘‘

’’کوا۔۔۔ ارے بھئی وہ تو کالا ہوتا ہے‘‘

’’یہ کوا ہی ہے‘‘ اس نے زہر خند سے جواب دیا۔

’’ اور کالا بھی ہے آپ اب عینک لگوا لیجئے۔‘‘

اس نے اس کوے کو جو اسے سفید کبوتر نظر آتا تھا بار بار غور سے دیکھا۔ اس کی شکل و صورت واقعی کوے جیسی تھی۔ مگر اس کا رنگ اسے بالکل سفید نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بیوی سے اُلجھ کر اس ے سوچا آخر سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوا سفید ہے یا سیاہ۔ کیا یہی غنیمت نہیں ہے کہ وہ اور اس کی بیوی کم از کم اس بات پر تو متفق ہیں کہ وہ کوا ہے اور سامنے منڈیر پر موجود ہے۔ وہ غسلخانے کی طرف جا رہا تھا کہ بلیوں کے لڑنے اور غرانے کی خوفناک آوازیں سنائی دیں۔ اس نے بڑی لڑکی سے پوچھا

''یہ بلیاں کہاں لڑ رہی ہیں ؟''

''لڑکی کی بجائے پھر اس کی بیوی نے جواب دیا''

''ثمینہ بیٹی بند کر دے۔حد ہو گئی ہے۔''

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔مگر بلیوں کے لڑنے اور غرانے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ وہ غسل خانے میں آ کر شیو بنانے لگا۔ شیو بناتے بناتے اس نے آئینے میں اپنے بالوں کی دیکھ اور دم بخود رہ گیا۔ ایک ہی رات میں اس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے مگر کیس؟ کیا رات اتنی طویل تھی یا عجیب طرح کی صبح طلوع ہوئی تھی۔ جس میں چیزوں کے رنگ اور ذائقے بدل گئے تھے اس نے چاہا بیوی کو آواز دے مگر اسے کوے والی تکرار یاد آ گئی پھر اسے یاد آیا کہ ایک بار وہ اسے ایک خوبصورت باغ میں لے گیا تھا اور جب اس نے پولوں اور مخملی سبزے کی طرف اشارہ کر کے اس کی تعریف کی تھی تو وہ پریشان ہو کر کہنے لگی تھی۔

''اس لق و دق صحرا اور ویرانے کو تم باغ کہتے ہو، یہ خاردار جھاڑیاں اور جگہ بلوں سے جھانکتے ہوئے سانڈے اونہہ۔''

پھر ایک دفعہ وہ اس کے ہمراہ راستہ بھول کر ویرانے میں پھنس گیا تو اس کی تشفی کے لئے اس نے کہا۔ ہم جلد ہی یہ صحرا عبور کر لیں گے تو وہ تنک کر بولی۔

''تم اس سبزہ زار کو صحرا کہتے ہو؟''

بیوی سے ایسی ہی باتوں کی وجہ سے اس کی تکرار ہوتی رہتی تھی مگر وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے اور ایک دوسرے کے لئے قربانیاں دیتے آئے تھے۔ اس نے سوچا رنگوں کے چکر میں پڑ کر گھر کی فضا کو مکدر نہیں کرنا چاہئے۔

ناشتہ کر کے وہ جلدی جلدی گھر سے باہر آیا۔ گھر سے باہر ساری چیزیں اجنبی اور غیر مانوس لگ رہی تھی۔ اسے سارے رنگ پھیکے دکھائی دے رہے تھے۔سفیدی ہر چیز پر غالب تھی۔ اسے خیال آیا مسلسل اور شدید بارشوں کی وجہ سے چیزوں کے رنگ اُڑ گئے ہوں گے۔

گلی میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑآ تھا۔ کئی روز سے قیامت خیز بارش ہوتی رہی تھی اور آج کئی دنوں کے بعد مطلع ذرا صاف ہوا تھا۔اس نے دیکھا گھر کے باہر ہر طرف کوڑا کرکٹ جمع تھا اور نالیاں غلاظت اور کیچڑ سے بھری ہوئی تھیں۔ گٹروں سے گندا اور بدبو دار پانی اُبل رہا تھا۔ اس نے بدبو سے بچنے کیلئے ناک پر رومال رکھ لیا اور پتلون کے پائنچے اُوپر کر کے گلی کی دلدل عبور کرنے لگا۔

آہستہ آہستہ اس کے ذہن صاف ہونے لگا۔ اسے بھولی ہوئی باتیں اور چیزیں یاد آنے لگیں۔ اُسے یاد آیا کہ کس طرح بستی کے لوگ بارش کی دعائیں مانگتے تھے۔وہ سخت گرمی اور لُو سے پریشان تھے۔ اس بات نہایت سخت گرمی پڑی تھی۔ لگتا تھا سورج سوا نیزے پر آ یا ہے۔ دن بھر آگ برستی۔ دھوپ کے شعلے سڑکوں، گلیوں، بازاروں، کھیتوں اور گھروں کی چھتوں پر ناچتے۔ رات دیر تک گرم ہَوا چلتی رہتی۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں چشموں کے ابلنے اور ہریالی کے لہرانے کی بجائے آگ دہکتی۔ ائیرکنڈیشنڈ کمروں اور سوئمنگ پولوں کے علاوہ ساری زندگی جھلس کر رہ گئی تھی اور لوگ گرمی، لُو اور خشک سالی کے خوف سے گھبرا کر بانگیں دینے لگے تھے۔

اُسے یاد آیا کہ ایک شکر دوپہر کی سیاہ بادل گھر آئے اور قبل از وقت سام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا اور اس قدر بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ گلیاں اور سڑکیں ندی نالے بن گئیں۔ ندی نالے چنگھاڑنے اور دریا بپھرنے لگے۔ بستیوں اور ویرانوں پر بجلی کڑکتی، چمکتی اور کوندتی رہی۔ کچے مکان ڈھے گئے۔ پکے مکان ٹپکنے لگے۔ مویشی اور انسان پانی کے تندریلوں میں بہہ گئے۔ کھیت اور فصلیں برباد ہو گئیں۔ زمین کے اندر بلوں اور سوراخوں میں چھپی ہوئی آفات باہر نکل آئیں اور زمین کے سینے پر رینگنے لگیں۔بہت سی جگہوں پر بند ٹوٹ گئے۔ بستیاں مٹ گئیں، لوگ بے گھر ہو گئے۔ طرح طرح کی وبائیں پھوٹ نکلیں اور بہت سا اناج پانی میں بہہ گیا۔ پھر جیسے صدیوں بعد مطلع صاف ہوا اور صبح طلوع ہوئی مگر یہ کیسی عجیب صبح تھی کہ چیزوں کے رنگ بدل گئے تھے یا کم از کم اسے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اسے یاد آیا۔ آتی بار بس سٹاپ ر ناآشنا چہروں کے ہجوم نے اسے آج بھی حسبِ معمول عقیدت اور محبت کی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ ان نظروں اور چہروں پر لکھے ہوئے خوشگوار جذبات سے آشنا تھا۔ مگر آج وہ ان نظروں سے چھپ جانا چاہتا تھا۔اسے لگ رہا تھا۔ جیسے وہ۔ وہ نہ ہو۔ اس نے اپنا روپ دھار رکھا ہو۔۔۔!

اس نے چاہا جانے کا ارادہ ترک کر دے۔ کسی اور طرف کو نکل جائے۔ مگر پھر اسے بیوی بچے اور گھر یاد آیا اور چیزوں کی وہ فہرست بھی جو باغ کو ویرانہ، صحرا کو سبزہ زار اور کبوتر کو کوا سمجھنے والی بیوی نے اس کی جیب میں اڑس دی تھی۔

بس روانہ ہوئی تو بہت سے لوگوں اس کے ٹکٹ کے پیسے ادا کرنا چاہے۔ مگر اس نے منع کر دیا۔ بس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مگر اس کے لئے سیٹ کالی کر دی گئی۔ یہ کوئی انوکھی اور خلافِ معمول بات نہیں تھی مگر آج اسے لوگوں کی محبت اور عقیدت اے خوف لگ رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے نہ پہچانیں۔ اسے عام آدمیوں کی بھیڑ میں گم ہو جانے دیں وہ جہاں جانا چاہے جائے۔یہاں بیٹھنا چاہے بیٹھے۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہ دے اس کا نوٹس نہ لے۔ کاش اس کی پاس سلیمانی ٹوپی ہوتی تو وہ سب کی نظروں سے بچ کر نکل جاتا۔مگر سلیمانی ٹوپی ہوتی تو وہ وہاں کیوں جاتا۔ وہ قہقہے لگاتا ہوا ان کے پاس سے گزر جاتا جو اسکے منتظر تھے۔

سڑک کے دونوں جانب چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ بازار کے عقب میں پھر بازار تھے۔بازاروں اور منڈیوں میں خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ اچھی بری ہر قسم کی جیبیں بیچی اور خریدیں جا رہی تھیں۔ ہر شخص اپنا مال بیچنے کی فکر میں تھا۔ اس نے اپنی ڈھارس بن دھائی زندہ رہنے کے لئے ہر کسی کو کچھ نہ کچھ بیچنا، ہی پڑتا ہے۔ جو چیزیں اپنے پاس نہ ہوں انہیں حاصل کرنے کے لئے جو کچھ میسر ہو بیچنا ضروری ہوتا ہے لیکن اس کی ڈھارس نہ بندھ سکی۔ رہ رہ کر اس کا جی چاہتا وہ کہیں چھپ جائے۔ کسی اور طرف کو نکل جائے۔ مگر وہ اس طرف کو جدھر اس کا جانے کو جی نہیں چاہتا تھا مسلسل کھنچا چلا جا رہا تھا۔ جیسے دوسرے سرے پر کوئی اس کی میلوں لمبی انتڑی کا سِرا پکڑے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا۔انتڑی کی تکلیف میں کمی ہوتی جاتی۔

بس سے اُتر کر وہ پیدل چلنے لگا۔اب فاصلہ اور کم ہو گیا تھا۔وہ یہ فاصلہ ایک ہی جست میں طے کر لیتا تھا مگر آج جب اُس نے اس فاصلہ کو ایک ہی سانس میں طے کرنے کر لئے خود کو ایڑ لگائی تو اس کے اندر کوئی چیز اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی اور زور زور سے ہنہنائے لگی اور ابھی وہ اسے چمکارنے اور تھپتھپانے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ سفید رنگ کے کوّے اور گدھ اسکے سرپر منڈ لانے لگے۔ اور اسے پناہ لینے کے لئے اس عمارت میں داخل ہونا پڑا جس میں وہ داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

مگر یہاں آ کر وہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا بولتے بولتے اسے اپنی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی پھر ہلکی ہوتی گئی اور آخر کار بالکل ختم ہو گئی اور اب وہ شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھے ہوئے شخص کے اشارے پر محض ہونٹ ہلا رہا ہے۔مگر وہ حیران ہے کہ جب اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تو سامنے بیٹھا ہوا شخص اسے قدر خاموش اور پر سکون کیسے ہے؟ اس کی سمجھ نہیں آ رہا کہ اب تک وہ دروازہ کھول کر اندر کیوں نہیں آ گئے ہیں اور ہر طرف شور کیوں نہیں مچ گیا ہے۔

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ اس کی اواز اس کے اپنے سوا سب کو سنائی دے رہی ہو لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟ جہاں تک اسے معلوم ہے جب تک آواز اور کانوں

کے درمیان ہَوا کا واسطہ موجود رہتا ہے آواز کی لہریں کانوں تک پہنچتی رہتی ہیں تو کیا اس کی آواز اور کانوں کے درمیان خلاء پیدا ہو گیا ہے؟ کیا وہ اپنی ہی آواز سننے سے محروم ہو گیا ہے؟ کیا وہ اپنی ہی آواز سننے سے محروم ہو گیا ہے؟ کیا وہ اب کبھی آوازیں اور آہٹیں نہیں سن سکے گا؟ سوالات چلتی ہوئی مشینوں کی طرح اس کے اندر گھرر گھرر کرنے لگتے ہیں اور ابھی وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اُسے یاد آتا ہے کہ انسنی کان وہی آواز سن سکتے ہیں جس کی فریکوئنسی بیس سے بیس ہزار تک ہو تو کیا اس کی آواز کی موجوں کا تعدد بیس سے بھی کم ہے یا اس کی آواز ULTRASAONIC ہے؟ کیا چمگادڑ کی طرح اس کے منہ سے بھی اس قدر تیز چیخ کی آواز نکل رہی ہے جسے انسانی کان سننے سے قاصر ہیں مگر کاش ایسا ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو سامنے بیٹھا ہوا شخص اس قدر پر سکون دکھائی نہ دیتا۔ یقیناً اس کی آواز میں نہیں، سماعت میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔

وہ اسی شش و پنج میں ہے کہ اس کے سامنے رکھے ہوئے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر لکھی ساری عبارت ختم ہو جاتی ہے اور شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھا ہوا شخص اسے باہر آنے کا اشارہ کرتا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آتا ہے

سب کچھ معمول کے مطابق ہے

لوگوں کے ہنسنے بولنے، دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے اور پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں اسے صاف سنائی دیتی ہیں۔

***

خواب در خواب

’’ اور تم تین قسم کے ہو جاؤ گے۔‘‘

سوجو داہنے والے کیسے اچھے ہیں اور جو بائیں والے ہیں کیسے برے ہیں۔ اور جو اعلیٰ درجے کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجے کے ہیں۔

اور قرب رکھنے والے ہیں باغوں میں نعمت کے

ان کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہو گا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے۔

بیٹھے ہیں جڑاؤ تختوں پر تکیہ لگائے ان پر ایک دوسرے کے سامنے لئے پھرتے ہیں، ان کے پاس لڑکے۔ سدا لڑکے ہی رہنے والے آب خورے اور کوزے

اور پیالہ نتھری شراب کا

جس سے نہ سر دکھے اور نہ عقل میں فتور آئے

اور میوہ جونسا پسند کر لیں۔

اور گوشت اڑتے ہوئے جانوروں کا جس قسم کا جی چاہے اور عورتیں گوری

بڑی آنکھوں والیاں۔ جیسے موتی کے دانے اپنے غلاف کے اندر بدلہ ان کاموں کا جو کرتے تھے۔

نہیں سنیں گے وہاں بکواس اور نہ گناہ کی بات

مگر ایک بولنا سلام سلام

اور داہنے والے کیا کہنے داہنے والوں کے

رہتے ہیں ان باغوں میں جہاں بے خار بیریاں ہوں گی اور کیلے تہ بہ تہ

اور سایہ لمبا اور پانی بہتا ہوا

اور میوے بہت ختم نہ ہوں گے اور نہ ان کی روک ٹوک ہو گی

اور بچھونے اونچے اونچے۔

ہم نے اٹھایا ان عورتوں کو ایک اچھے اٹھان پر

پھر کیا ان کو کنواریاں

پیار دلانے والیاں

ہم عمر

واسطے داہنے والوں کے‘‘---------- (الواقعہ)

وہ توے کی طرح تپی ہوئی زمین پر جلدی جلدی پاؤں رکھتا اور آگے بڑھتا ہے۔

سب سے پہلے اسے شیدو مہترانی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے سر پر غلاظت ہے سے بھرا ہوا ٹوکرا ہے۔ وہ ناک پر رومال رکھ لیتا ہے اور حیرت سے شیدو کو دیکھتا ہے۔ وہ بدبو سے بے نیاز غلاظت کو ٹوکرا اٹھائے یوں گزر جاتی ہے جیسے بتاشے بانٹتے جا رہی ہو۔

پھر اسے پیرو ملتا ہے۔

پیرو کا باپ اس علاقے کا مشہور بھانڈ ہے۔ پہلے شادی بیاہ کے موقعوں پر اسی کے توسط سے طوائفیں بلائی اور نچائی جاتی تھیں مگر اب پیرو ہی اس کا واحد سہارا ہے۔ لیکن پیرو ناچنا اور گانا نہیں چاہتا۔ گھنگھرو باندھ کر ناچتے گاتے اور بیاہ شادیوں اور عقیقوں اور بدھائیاں دیتے، ویلیں وصول کرتے، وہ جوان ہو گیا ہے اور اسے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے سامنے ناچتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ رات کو جب وہ زنانہ کپڑے پہن کر سرخ رنگ کا دوپٹہ اوڑھ کر اپنے باپ کی سارنگی کی تال اور بھائی کے طبلے کی تھاپ پر ناچتا گاتا اور طوائفوں کی طرح بھاؤ بتاتا ہے تو گاؤں کے لڑکے اسے ’’نی پیرو‘‘ کہہ کر چھیڑتے ہیں اور وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔

وہ آگے بڑھتا ہے۔

اسے صادو ترکھان نظر تو نہیں آتا لیکن اس کی مخصوص کھانسی سنائی دیتی ہے۔لکڑیوں چیر چیر کر اور برادہ پھانک پھانک کر اسے کتا کھانسی ہو گئی ہے۔ اسے جب بھی دورہ پڑتا ہے وہ تھوڑا سا گڑ چاٹ لیتا ہے۔

اور یہ بڑے ملک صاحب کا ڈیرہ ہے۔

مولوی فلک شیر کان پر ہاتھ رکھ کر بڑی خوش الحانی سے قصہ سنا رہا ہے۔ نوجوان مولوی فلک شیر حال ہی میں درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر آیا ہے اس کا ارادہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراط مستقیم پر لانا تھا لیکن بڑے ملک صاحب نے اس کی ڈیوٹی سوہنا و زینی کا قصہ سنانے پر لگا دی ہے۔

گاؤں سے باہر اسے بہت سے لوگ ملتے ہیں۔ اپنے وزن سے دگنا بوجھ اٹھاتے ہوئے دھوپ اور گرمی میں کام کرتے، پتھر توڑتے اور چارہ کاٹتے ہوئے۔ وہ ان سب کو محبت بھری الوداعی نظروں سے دیکھتا آگے بڑھتا ہے اور اسے اپنے گاؤں کا آخری آدمی باقی مسلی دکھائی دیتا ہے جو شکر دوپہر میں بڑے میدان اور تالاب کے کنارے مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں تلاش کرتا پھرتا ہے۔

وہ توے کی طرح تپی ہوئی زمین پر اور تیزی سے پاؤں رکھتا اور اٹھاتا گیٹ کی طرف بڑھتا ہے اور تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ شکاری کتوں کی طرح اس کا پیچھا کرنے والے ل وکے تھپیڑے گیٹ پر آ کر رک جاتے ہیں۔ اندر دور تک لمبی لمبی چمکیلی کاریں کھڑی ہیں۔ لان میں ڈرائیور ٹولیوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے کے زخموں کو کرید رہے ہیں۔وہ پانی سے بھرے ہوئے حوض کو ایک نظر دیکھتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے وہ اس میں تحلیل ہو جائے۔ وہ دوسری گیٹ میں قدم رکھتا ہے۔

چاروں طرف خوبصورت پھولوں کے تختے ہیں۔ ہری بھری مخملی گھاس ہے اور زرق برق لباسوں میں خوبصورت عورتیں مرد آ جا رہے ہیں۔ وہ اندرونی دروازے پر پہنچتا ہے تو با وردی ملازم ادب سے دروازہ کھولتا اور جھک کر اسے سلام کرتا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہیں اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی دائیں یا بائیں کسی آنکھ کی پتلی ساکت ہو گئی ہے یا اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے شیدو مہترانی سے لے کر باقی مسلی تک سارے لوگ اور غلاظت کے ٹوکرے سے لے کر مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیوں تک ساری چیزیں صاف اور ٹھیک دکھائی دے رہی تھیں مگر اب چیزیں فوکس نہیں ہو رہی ہیں اور اسے ایک کے دو اور دو کے چار نظر آنے لگے ہیں۔

میزبان خاتون بیگم شداد کے ساتھ ویسی ہی مشکل و صورت کی ایک اور خاتون کھڑی نظر آتی ہے۔ دونوں کے بازو ایک جیسے چکنے اور ملائم ہیں۔ ہونٹ ایک جیسے رسیلے اور دونوں کی گردنوں میں ایک ہی طرح کے دمکتے ہوئے لاکٹوں نے اپنی طلائی باہیں حمائل کر رکھی ہیں اور وہ دونوں بار بار آپس میں اوور لیپ و جاتی ہیں۔

چیزوں کو آپس میں اوور لیپ ہونے سے بچانے اور انہیں اصلی حالت میں دیکھنے کے لئے اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنی ایک آنکھ بند کر لے اور جب دوسری تھک جائے تو پہلی آنکھ کھول لے۔

وہ اپنی ایک آنکھ بند کر لیتا ہے اور دوسری سے بہت سی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ پردے خوشنما ڈیزائنوں کے۔

قالین نرم اور پھولوں والے جن پر چلتے ہوئے فخر و مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

روشنیاں خوبصورت فانوسوں کی گود میں مسکراتی ہوئی اور ایئر کنڈیشن کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، سیلنگ پینلوں سے آنکھ مچولیکھیلتے ہوئے ساگوان کے دروازے اور فرنیچر پالش سے چمکتے ہوئے صوفے فوم والے آرام دہ۔ لڑکے خوبصورت

وردیاں پہنے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے جن میں مشروبات سے لبالب گلاس ہیں، اور بلوریں جام۔

مسکراہٹیں، خوش گپیاں، ہیلو ہیلو بولتے مسکراتے ہونٹ، کوکتی کوئلیں، چہکتی مینائیں،گھگھو گھوں الاپتی فاختائیں اور غڑغوں غڑغوں کرتے کبوتر۔

رنگا رنگ ملبوسات، سوٹ، ٹائیاں، بیل باٹم، ساڑیاں اور میکسیاں جن میں خوشنما بروچ جگمگاتے ہیں۔

آنکھوں میں جلتی قندیلیں، پینگیں جھولتی بالیاں، معطر زلفیں، دمکتے نگینے، لشکارے مارتے لونگ، سگریٹوں کا خوشبودار دھواں اور دھوئیں کے مرغولے۔

بلاؤزوں، کڑتیوں اور کھلے گلے کی قمیضوں سے جھانکتی مرمریں گولائیاں۔ پکوان اور میوے طرح طرح کے اور بہت

اور مرغ سیخوں میں پروئے ہوئے

''سو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''

اس کی دیکھنے والی آنکھ تھک جاتی ہے تو وہ اسے بند کر لیتا ہے اور دوسری آنکھ سے بہت سی چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے لیکن اسے کچھ نظر نہیں آتا۔

***

تشکر: محمد حمید شاہد جن سے ان پیج فائل فراہم ہوئی

ان پیج سے تبدیلی، تدوین اور ای بک کی تشکیل: اعجاز عبید

پانی میں گھرا پانی

اور منشا یاد کے دوسرے افسانے

جلد دوم

انتخاب : محمد حمید شاہد

ترتیب

خواب راستہ

’’جب میری آنکھ کھلی‘‘ اس نے اپنے معالج کو بتایا ’’تو میرا جسم پسینے سے شرابور اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔آپ نے مجھے پریشانی اور اضطراب سے بچنے کی تلقین کر رکھی ہے لیکن پریشانی نے اب چور راستہ تلاش کر لیا ہے اور لگتا ہے میری جان لے کر ہی چھوڑے گی‘‘

’’مجھے معلوم ہے آپ زیر عتاب ہیں مگر آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں۔ان دنوں اخباروں میں بھی اس قسم کی خبریں اکثر چھپتی رہتی ہیں بہت تبدیلی کے بعد نائٹ میئرز کی صورت اختیار کر لیتی ہیں ‘‘

’’ہو سکتا ہے ڈاکٹر انہی خبروں کا اثر ہو لیکن مجھے بے خوابی کی پرانی شکایت ہے۔رات رات بھر کروٹیں بدلنا، اور اگر سلیپنگ پلز کی وجہ سے آنکھ لگ جائے تو اس قسم کے ڈراؤنے خواب دیکھ کر جاگ جانا‘‘

آپ کچھ دنوں کے لئے ایڈمٹ ہو جائیں۔ نئے ٹسٹس بھی ہو جائیں گے اور ماحول کی تبدیلی سے بھی فرق پڑے گا‘‘

’’جیسا آپ بہتر سمجھیں ‘‘

ڈاکٹر اور اس کے سٹاف کے چلے جانے کے بعد اس نے تکیے کے نیچے سے موبائیل فون نکالا اور گھر میں بیوی کو اپنے ایڈمٹ ہو جانے کی اطلاع دی۔جو تھوڑی دیر بعد ڈرائیور کے ساتھ دوپہر کا کھانا اور اس کی ضرورت کی چیزیں لے کر آ گئی اور سہ پہر تک اس کے پاس رہی۔وہ رات کو بھی وہیں ٹھہرنا چاہتی تھی مگر یہ تکلیف دہ ہوتا، اس نے منع کر دیا اور وہ بادل نخواستہ گھر چلی گئی

پھر اوور سیز کال آ گئی۔

’’اب کیسی طبیعت ہے پاپا؟‘‘

’’ٹھیک ہوں ‘‘

’’ ماما نے بتایا چکر آنے لگے ہیں ‘‘

’’ہاں وہی خفقان اور بے خوابی کی پرانی شکایت۔اسی کی وجہ سے ‘‘

''ڈاکٹر کیا کہتا ہے ؟''

''وہی ٹسٹس اور روایتی باتیں۔سوچئے مت،ذہن کو صاف رکھیے،یہ پرہیز وہ پرہیز''

''پرہیز تو ضروری ہے پاپا''

''ہاں پہلے کھانے پینے کا تھا اب سوچنے کا بھی۔سوچنا بھی کیا اپنے بس میں ہوتا ہے؟''

''ہوتا ہے پاپا۔مجھے معلوم ہے آپ بہت اور بے جا سوچتے ہیں۔جس بات کا آپ سے کوئی تعلق نہ ہو اس پر بھی کڑھتے رہیں گے''

''تو کیا آدمی کو صرف اپنے ہی بارے میں سوچنا چاہئے''

''میر اتو خیال ہے اپنے بارے میں بھی زیادہ نہیں سوچنا چاہئے۔بس جو ہے وہ ہے۔جو نہیں ہے وہ نہیں ہے''

''ہاں بیٹا جس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے وہ اسی طرح کی باتیں کرتا ہے''

''پاپا آپ کے پاس بھی تو سب کچھ ہے''

''ہاں ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں ''

''ضرورت پوری ہو جانا بہت بڑی بات ہوتی ہے پاپا۔ورنہ ہم تیسری دنیا کے اکثر لوگوں کی ضرورتیں ہی پوری نہیں ہوتیں اور ہمیں نظریۂ ضرورت ایجاد کرنا پڑتا ہے''

''صرف تیسری دنیا ہی کی نہیں بیٹا، پہلی اور دوسری دنیا والوں کی بھی ضرورتیں ہوتی ہیں اور بدلتی رہتی ہیں۔کبھی ان کی ضرورت ایک ملا جرنیل کی تھی انہوں نے اس سے انتہا پسندی کے فروغ کا کام لیا۔اب نائن الیون کے بعد الٹا پہیہ گھمانے کی ضرورت پڑ گئی تو اسی ملائیت کو دہشت گردی قرار دے کراس کے خلاف جنگ لڑی جا رہی ہے۔ویسے وہاں کے عام لوگوں کا رد عمل کیا ہے؟''

''پاپا یہاں بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔وہ بھی ہیں جواس مہم جوئی اور لشکر کشی کو ایک بڑی طاقت کی کھلی جارحیت سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو اسے دہشت گردی اور بنیاد پرستی کے خلاف جنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔کل ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جو سمجھتا ہے کہ طالبان پر یہ قیامت بامیان کے ان بتوں کی وجہ سے ٹوٹی جن کو وہ دنیا بھر کی اپیلوں کے باوجود توڑنے سے باز نہ آئے تھے۔ حالانکہ انہیں محمود غزنوی جیسے بت شکن نے گرانا مناسب نہیں جانا تھا''

''خرافات''

’’مگر پاپا اس بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ محمود نے یہ بت صدیوں بعد آنے والے طالبان کے لئے چھوڑ دئیے کیوں کہ ان کو توڑنے سے مٹی اور پتھر کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا مگر سومنات کے بت‘‘

’’یہ تم کہہ سکتے ہو اور وہاں بیٹھ کر‘‘

’’ہاں یہاں سچ بولنے کی آزادی تو ہے‘‘

’’یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔کہیں کوئی ایسا سچ نہ بول دینا جو انہیں پسند نہ ہو‘‘

’’ایسا نہیں ہے پاپا‘‘

’’تو کیا تم دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد کا نام لے سکتے ہو؟‘‘

’’پاپ آجکل فون پر ایسی باتوں سے گریز کریں ‘‘

’’ سچ بولنے کی آزادی۔۔۔ بس؟‘‘

’’آجکل پہلے جیسے حالات نہیں رہے پاپا۔ دے آر ایٹ وار‘‘

’’میں نے تو سنا تھا وہاں حالات بہتر ہو گئے ہیں ‘‘

’’آہستہ آہستہ ہو رہے ہیں مگر کاش خودکش حملے کرنے والے ایک بار واپس آ کر ہمارا اور مسلم امہ کا حال دیکھتے۔خیر آپ کوئی دوسری بات کیجئے ‘‘

’’بچے کیسے ہیں اور جوزفین؟‘‘

’’ٹھیک ہیں،آپ کو یاد کرتے ہیں۔آپ مکمل چیک اپ کرائیں،اخراجات کی پرواہ نہ کریں۔خدا حافظ ‘‘

’’خدا حافظ‘‘

فون بند ہو جانے کے بعد کچھ دیر وہ میگزین پڑھتا رہا پھر اکتا کر چھوڑ دیا اور تکئے کے نیچے سے دوبارہ موبائل فون نکال کر بعض پرسنل سیٹنگز(settings) تبدیل کرنے لگا۔ان دنوں یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ گذشتہ کچھ دنوں سے اس کے ہاتھ ایک ایسا موبائیل فون لگ گیا تھا جس میں سنسر لگا ہوا تھا۔ اور ایک خاص کوڈ ملانے کے بعد وہ دوسروں کی گفتگو سن سکتا تھا مگر اس میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ دوسروں کی نجی گفتگو سننا اگرچہ غیر اخلاقی حرکت تھی مگر اس نے خود ہی اس کا جواز تلاش کر لیا تھا کہ اس کا مقصد نقصان پہنچانا یا کسی کے معاملات میں دخل دینا نہیں، محض اپنا روٹھا ہوا دل بہلانا اور اپنے ارد گرد کے حقائق جاننا تھا۔بعض کالیں دلچسپ اور معلوماتی ہوتیں مگر بعض بالکل بور۔بعض کے سیاق و سباق کا کچھ پتہ نہ چلتا۔وہ تھوڑی دیر سنتا پھر اکتا کر آگے بڑھ جاتا

اس نے کوڈ ڈائل کیا اور انتظار کرنے لگا۔

مختلف کالیں سنسر ہونے لگیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے ایک کال سنتا پھر اس میں دلچسپی نہ پا کر آگے بڑھ جاتا۔

’’ہاتھی اور چیونٹی کاکیا مقابلہ یار‘‘

’’مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی‘‘

’’میرا خیال ہے چیونٹی تو ہاتھی کو دیکھ بھی نہیں سکتی‘‘

’’تو کیا ہاتھی اسے دیکھ سکتا ہے؟‘‘

’’اسے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بڑے بڑے مہیب پاؤں سے کچل تو سکتا ہے‘‘

’’دیکھے گا تو کچلے گانا‘‘

’’ مگ ریار لوگ اس انتظار میں رہے کہ کب چیونٹی ہاتھی کے کان میں گھستی ہے اور الٹا ہاتھی چیونٹی کے کان میں گھس گیا‘‘

’’ویسے ہمت کی داد دینی چاہیے۔ ساری دنیا ایک طرف اور تھوڑے سے بے سر و ساماں لوگ دوسری طرف‘‘

’’ہمت کی یا ہٹ کی ؟‘‘

’’اسی کو تو کہتے ہیں بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق‘‘

’’اب معجزوں کرامتوں کا زمانہ نہیں بھائی۔کاش وہ سمجھ سکتے کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے‘‘

’’ تو کیا کرتے۔گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے اور کہاں جاتے؟‘‘

’’بھاگے تو ہیں مگر دیر سے۔ اور اتنی عجلت میں کہ بہت سے خوش فہموں کا ایمان متزلزل ہو گیا‘‘

’’یہ پسپائی عارضی ہے جنگی حکمت عملی،،

’’یار حکمت اور دور اندیشی سے کام لیتے تو تباہی سے بچا جا سکتا تھا۔آدمی زیادہ عقلمند نہ بھی ہو تو اتنی سی بات تو نوشتہ دیوار تھی کہ ایک مقدس لفظ بدنام ہونے جا رہا ہے۔مگر افسوس۔کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟‘‘

''اور مہمان کو دیکھو کہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجوا دی اور روپوش ہو کر دشمن کو موقع دیا کہ وہ جس گھر اور علاقے میں چاہے تلاش کے بہانے کاروائی کر سکے''

''یار کبھی کبھی تو مجھے وہ بھی انہی کا آدمی معلوم ہونے لگتا ہے''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا''

''وقت بھی وہی کچھ بتائے گا جو وہ چاہیں گے، وقت جن کی مٹھی میں ہے''

* ''شاہ جی میں بڑی دیر سے بھٹک رہا ہوں، شارع جمہوریت کہاں واقع ہے؟''

''آجکل مرمت کے لئے بند ہے''

''مگر ہے کہاں ؟''

''کانسٹی ٹیوشن ایوینیو کے پاس''

'' اور وہ کہاں ہے؟''

''کانسٹی ٹیوشن یا ایوینیو؟''

''ایوینیو یار''

''پارلیمنٹ بلڈنگ دیکھی ہے؟''

''ہاں اسی ہا نٹڈ ہاؤس کے سامنے تو ہوں جو انڈر دی ٹو آف پریذیڈنسی ہے ''

'' وہاں سے تھوڑا آگے چلو تمہارے بائیں ہاتھ پر ایک خوبصورت اور پر وقار عمارت ہو گی ''

''اچھا جہاں بلوہ ہوا تھا ؟ ''

''ہاں یہی تو کانسٹی ٹیوشن ایوینو ہے اس پر ذرا آگے جا کر کراسنگ آئے گا''

''آ گیا اور پہنچ گیا''

'' یہی شارع جمہوریت ہے''

''ہاں مگر شاہ جی یہ سڑک اتنی چھوٹی کیوں ہے؟''

''بھائی اس ملک میں جمہوریت کی جتنی عمر ہے سڑک کی لمبائی اس کے مطابق رکھی گئی ہے''

* ’’نہیں میں اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتی‘‘

’’کتنی دیر رہ سکتی ہو؟‘‘

’’آفس آورز سے میکسی مم ایک گھنٹہ بعد تک‘‘

’’تا کہ گھر والے سمجھیں اوور ٹائم لگ رہا ہے!‘‘

’’اوور ٹائم ہی تو ہے‘‘

* ’’کچھ اس کا اتاپتہ؟‘‘

’’بہت مزے میں ہے۔ایک ہی برس میں اس کے نیچے بائیسکل کی جگہ پجیرو آ گئی‘‘

’’چندوں، زکوٰتوں اور خیراتوں سے؟‘‘

’’ایک وہی کیا بہت سی دینی اور سیاسی پارٹیاں اور لاکھوں لوگ پل رہے ہیں ‘‘

’’ اور کرتا کیا ہے؟‘‘

’’وہی جو پیداواری عمل میں حصہ نہ لینے والے دوسرے کرتے ہیں ‘‘

’’ہماری سوسائٹی میں نان پروڈکٹیو لوگوں کی تعداد کتنی ہو گی؟‘‘

* ’’آپ فکر نہ کریں سر میں نے فیصلہ لکھ کر محفوظ کر لیا ہے جلد سنا دوں گا لیکن ہو سکتا ہے سر آپ خوش نہ ہوں ‘‘

’’ پھر یہ آپ کا آخری فیصلہ ہو گا۔آ پ کی فائل‘‘

’’سر ابھی سنایا تو نہیں،نظر ثانی ہو سکتی ہے‘‘

’’ہو سکتی ہے تو کرو اور میرا پیغام اپنے ساتھیوں کو بھی دے دو۔ کسی کو تامل ہو تو مجھ سے بات کر لے،دیٹس آل‘‘

* ’’پاس کرانی ہے تو ہیروئین کو ساتھ لاؤ‘‘

’’بہت مشکل ہے یار،آجکل بہت نخرہ کرتی ہیں،سائیڈ والی سے کام نہیں چل سکتا؟‘‘

’’کوالٹی پر منحصر ہے‘‘

*’’تم نے ڈاکے والی خبر پڑھی؟‘‘

''وہ تو روز ہی پڑھتے ہیں ''

''نہیں بھائی وہ جو دو نقاب پوش ڈاکو ناکہ لگا کر رات بھر بسوں،ویگنوں اور کاروں کو لوٹتے رہے''

''کیا یہ غنیمت نہیں کہ ان چھوٹے ڈاکوؤں کی آنکھوں میں ابھی خوف یا شرم کچھ تو باقی ہے جون قاب پہنتے ہیں۔بڑے تو وہ بھی نہیں پہنتے''

''ان ڈاکوؤں نے ایک رات میں پانچ لاکھ روپے لوٹے''

''تو کیا فلمی ڈاکوؤں کی طرح اپنی ضرورت سے زائد رقم واپس کر دیتے؟''

''پوری بات تو سنو،ایک مسافر کا بیان چھپا ہے۔اس کی جیب میں ایک روپیہ تھا انہوں نے وہ بھی نکال لیا''

* ''میں بھی ریٹائر نہیں ہونا چاہتا۔ اپنے عہدے میں توسیع کرنا چاہتا ہوں ''

''قانون اس کی اجازت نہیں دیتا''

''دیتا ہے''

'' دیتا ہے تو بھی سب کو نہیں ''

''قانون سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتا ہے وہ اندھا ہوتا ہے''

''اتنا اندھا بھی نہیں ہوتا''

* ''یار میری رقم کا کیا ہو گا؟''

گھبراؤ نہیں دیانتداری ان کے بزنس کا پہلا اصول ہے ''

''اصول یا تقاضا؟''

''جو بھی سمجھ لو۔میں نے انہیں سو سو ڈالر کے نوٹوں سے ایک ایک رات میں لاکھوں کروڑوں کا جوا کھیلتے دیکھا ہے۔ مجال ہے کبھی کسی نے روند ماری ہو''

* ''ہاں پتر اب خاندان میں مجھ سے بڑا تو کوئی رہا نہیں۔ سب کچھ مجھے خود ہی کرنا پڑ رہا ہے۔تم اگر کچھ روز پہلے آ جاؤ تو وسمہ مہندی،سہرے گانے بینڈ باجے اور وڈیو وغیرہ ''

''میں آ جاؤں گا اور سارا انتظام کر لوں گا تایا جی۔آپ فکر نہ کریں ہم سارے چاؤ پورے کریں گے اور پہلے بیاہ کی حسرتیں نکالیں گے لیکن تایا جی میں شہ بالا بنوں گا''

’’علاج معالجے اور مرہم پٹی کے بہانے سارا خون نکال لیتے‘‘

’’کس نے بتایا‘‘

’’میں ایک واپس آنے والے نے‘‘

’’ اور کیا بتایا اس نے؟‘‘

’’کہہ رہا تھا ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا۔ہم لڑنے گئے تھے مگر ہماری ڈیوٹی دوسرے کاموں پر لگا دی گئی‘‘

’’دوسرے کام؟‘‘

’’ان کی جسمانی ضروریات پوری کرنا۔ اور وہ اسے بھی نفس کا ایثار اور جد و جہد کا حصہ سمجھتے تھے‘‘

* ’’اب ایک ہی راستہ ہے‘‘

’’کون سا‘‘

’’ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ‘‘

’’نہیں، سب سے پہلے پاکستان‘‘

کیا دیکھتا ہے کہ ایک کھلا بے آب و گیاہ میدان ہے،جس کے عین بیچ میں ایک باریش ادھیڑ عمر کا شخص کدال سے مٹی کھود رہا ہے۔ہولناک سناٹا، چلچلاتی دھوپ اور آسمان کو چھوتے گرد باد۔ایک طرف گردنوں میں اعمال نامے لٹکائے سہمے کھڑے لوگ،دوسری طرف ان گنت تماشائی آنکھیں۔ جب تھوڑی سی مٹی جمع ہو جاتی ہے کدال والا باہر آ جاتا اور دوسری جگہ گڑھا کھودنے لگتا ہے اور اسی عمر اور حلئے کا ایک اور،بیلچے سے مٹی باہر پھینکنے لگتا ہے۔جب وہ کندھوں کے برابر کھود چکتا ہے تو باہر نکل کر اگلے گڑھے کی طرف چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ لینے ویسے ہی دو اور،سہمے ہوؤں میں سے گڑھے کے ناپ کے کسی ایک کو پکڑ لاتے اور مضبوطی سے زندہ گاڑ دیتے ہیں۔کھودی ہوئی مٹی کو دوبارہ گڑھے میں ڈالتے اور خوب روندتے ہیں۔لیکن عجیب بات ہے کہ گاڑے جانے والوں کی چیخ یا فریاد سنائی نہیں دیتی۔پھر اچانک اسے پتہ چلتا ہے وہ بھی ان میں شامل ہے جن کے گلوں میں تختیاں لٹکی ہوئی ہیں اور اس کی باری بس آنے ہی والی ہے۔خوف سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے اور سانس تیز تیز چلنے لگتی ہے لیکن فوراً ہی اسے چور راستے کاخ یال آ جاتا اور پتہ چل جاتا ہے کہ وہ حقیقت نہیں خواب ہے۔

اسے خواب بہت آتے تھے اور کیسا بھی خواب ہو وہ اس سے نکل آنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ یہ اس کے جاگتے ذہن کے خواب ہوتے تھے

مگر اسے اتنی مشق ہو گئی تھی کہ اگر وہ سچ مچ کا کوئی بد خواب ہوتا تب بھی وہ جب چاہتا اس سے باہر آ جاتا۔

وہ زندگی کے اس آخری خواب سے نکلنے اور جاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر بسیار کوشش کے باوجود جاگ سکتا ہے نہ اسے باہر نکلنے کا راستہ ملتا ہے۔

***

خواہش کا اندھا کنواں

اے بلاک کے بنگلوں کے درمیان بڑی خوبصورت سڑک تھی۔ دونوں جانب بڑے خوشنما، درخت، پودے اور ہری ہری گھاس تھی۔کاش! وہ گھاس کھا سکتا۔۔۔ درختوں کے پتوں سے پیٹ کی آگ بجھا سکتا۔۔۔ اسے بکریوں اور دوسرے چرندوں پر بڑا رشک آتا تھا لیکن یہ سوچ کر اطمینان ہوتا تھا کہ اگر بکریاں گھاس اور درختوں کے پتے کھا سکتی تھیں تو اس طرح سڑکوں پر آزادی سے گھوم پھر تو نہیں سکتی تھیں۔

اسے بلیوں پر بھی رشک آتا تھا۔ کسی گھر میں جگہ نہ بھی ملی تو اِدھر اُدھر سے کچھ جھپٹ لیا۔ چوہا مل گیا تو کیا ورنہ چڑیوں اور کبوتروں کا تو کہیں بھی قحط نہ تھا۔ ایک ذرا گھات لگا کر کچھ دیر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اور کچھ نہ ملا تو چوزہ ہی جھپٹ لیا درختوں پر چڑھ کر فاختاؤں کے گھونسلے اکھاڑ پھینکے ادھر کسی گھر میں دودھ کا برتن کھلا رہ گیا تو غٹا غٹ سارے کا سارا چڑھا لیا اور یہ جا وہ جا۔۔۔ ڈانڈا لے کر پیچھے بھاگنے والا منہ دیکھتا رہ جائے اور یہ دیوار پھاند کر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ شرافت کو یہ انسان پوچھتے ہی کہاں ہیں۔ مگر اپنی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ اب کون ان بلیوں کی طرح چھچھوری کمینی اور ندیدی حرکتیں کرتا پھرے آخر سب انسانوں کا دیا ہی کھاتے ہیں کبھی تھوڑا کبھی بہت۔۔۔ کونسا خود اناج اگاتے اور محنت کرتے ہیں۔ مفت خوری میں یہ بھی غنیمت ہے۔

وہ چونک پڑا۔

ایک خوبصورت بنگلے کا پھاٹک کھلا تھا۔ اس نے گیٹ پر کھڑے ہو کر کچھ سونگھا پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھایا ہوا اندر چلا گیا مگر پھر اپنے کسی ہم جنس کی بو پا کر رک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ گیٹ سے باہر چلا جائے بجلی کی سی تیزی سے اس کا ہم جنس اس کی طرف دوڑتا ہوا آیا اور منہ میں کف بھر کر نہایت کرخت لہجے میں بولا۔ ''دفعان۔۔۔ دفعان۔۔۔ گندے۔۔۔ تمہیں پتہ نہیں یہ ٹونی کا گھر ہے۔''

وہ ٹونی سے خوف زدہ نہیں ہوا لیکن اس کے نو کیلے کان'' قد و قامت اور ملائم چکنی جلد دیکھ کر بڑا مرعوب ہوا اور بڑے دھیمے لہجے میں بولا ''تمہارا نام بڑا اچھا ہے۔ مگر میرا کوئی نام نہیں ''۔

''تم جیسے گھٹیا نسل والوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔''

’’نسل تو اصل میں سب کی ایک ہے‘‘۔

’’کبھی پانی میں اپنی صورت دیکھی ہے۔‘‘

’’میں لڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے بھوک لگی ہے کچھ کھلاؤ گے‘‘۔

’’اچھا تو اسی لئے خوشامد کر رہے‘‘؟

’’یہی سمجھ لو------ دیکھو----- میں تمہاری نسل کا نہ سہی تمہارا ہم جنس تو ہوں میں نے کئی روز سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔ رات تھوڑے سے باسی چاول ملے تھے تم اگر ایک آدھ چھیچھڑا یا روٹی کا کوئی بچا کھچا ٹکڑا لا دو تو میں تمہارا دوست بن جاؤں گا۔‘‘

’’مجھے تم جیسے آوارہ اور لفنگے کی کیا ضرورت ہے‘‘۔

’’ہو سکتا ہے کبھی پڑوس والوں سے تمہارا جھگڑا ہو جائے میں تمہاری مدد کروں گا سب کو کاٹ کاٹ کر لہو لہان کر دوں گا۔‘‘

’’میرا کسی سے جھگڑا نہیں ہوتا۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں میں خوش رہتے ہیں سب اپنا اپنا راتب کھاتے ہیں۔ لڑائی جھگڑا کس بات کا۔ یہ تو تم جیسے بھوکے اور آوارہ نسل والوں کا کام ہے۔‘‘

’’شاید تم ٹھیک کہتے ہو کیا کسی بنگلے میں مجھے بھی جگہ مل سکتی ہے؟ میں اسی لئے یہاں آیا ہوں۔‘‘

’’تمہیں اور بنگلے میں جگہ؟----- تم پر تو کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔‘‘

’’مگر کیوں ؟---- کیا میں تمہاری طرح گھر کی رکھوالی نہیں کر سکتا؟ تم تو بلکہ کھا کھا کر موٹے سست اور کاہل ہو گئے ہو اور بزدل بھی صرف بھونک کر رہ جاتے ہو میں تو غیری آدمی کی تکا بوٹی کر دوں آخر مجھ میں کیا خرابی ہے؟‘‘

’’تم میں سے سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ تم دیسی نسل کے ہو۔تمہارے ماں باپ بھی اسی ملک کی گلیوں میں آوارہ پھرتے تھے۔ تمہاری صورت گنواروں جیسی ہے، تمہارے جسم سے بدبو آتی ہے۔‘‘

’’میں گندی اور میلی گلیوں میں رہتا ہوں گندی جھوٹی اور باسی چیزیں کھاتا ہوں اور فاقے سہتا ہوں۔ اس لئے جسم بد نما ہو گیا ہے۔ اسی لئے مجھے خارش کی تکلیف رہتی ہے۔ میرے کان کاٹ کر چھوٹے کر دئیے جائیں مجھے اچھی غذا ملے اور تمہاری طرح مجھے بھی ہر روز صابن سے نہلایا جائے تو میری جلد بھی ملائم اور چمکدار ہو سکتی ہے۔‘‘

’’اچھا اب دفعان ہو جاؤ مجھے تم سے گھن آ رہی ہے۔‘‘

’’جا تو رہا ہوں ‘‘۔

’’آ جاتے ہیں منہ اٹھائے ہوئے، لچے لفنگے آوارہ‘‘۔

’’دیکھو گالی نہ دو‘‘ میں لڑنا نہیں چاہتا مجھے بھوک لگی ہے‘‘۔

’’بھوک تو تم جیسے کمینوں کی کبھی مٹتی ہی نہیں۔ لڑنے کی تم میں ہمت ہے‘‘؟

’’ہاں ...... تم غلط سمجھ رہے ہو مجھے غصہ نہ دلاؤ‘‘

’’تم میرا کیا کر لو گے‘‘؟

’’میں تمہارا خون پی جاؤں گا‘‘۔ وہ دانت نکوس کر اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

’’میرے مالک کو جانتے ہو‘‘؟ ٹونی نے پیچھے ہٹتے ہوئے خوف زدہ ہو کر کہا ’’مجھے اگر کوئی آدمی بھی کچھ کہہ دے تو مالک اسے گولی مار دے۔ تم تو پھر جانور ہے۔‘‘

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہ جبڑے کھول کر ٹونی پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ٹونی کا مالک برآمدے میں دکھائی دیا۔ ٹونی مالک کو دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگا مگر ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ جلدی سے چلا جائے۔ وہ گیٹ سے باہر نکل آیا مگر دیر تک ٹونی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکراتی رہی۔‘‘ آیا تھا بڑا لفنگا کہیں کا---- ہونہہ‘‘۔

وہ پھر اے بلاک کی مین روڈ پر ایک طرف ہو کر چلنے لگا۔

ایک خوبصورت چمکیلی کار اس کے قریب سے گزری تو اس نے دیکھا کہ اس کا ایک ایک ہم جنس بڑے مزے سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا اس حقارت سے دیکھتا جا رہا تھا۔ اس نے آسماں کی طرف منہ اٹھا کر ٹھنڈی سانس لی اور چلنے لگا۔

وہ ہر کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا ہو کر اندر جھانکتا رہا کوئی ہم جنس نظر نہ آتا تو وہ اس وقت تک گیٹ کی سلاخوں سے اندر جھانکتا رہتا۔ جب تک گھر کے کسی فرد کی نظر اس پر نہ پڑ جاتی۔ بے رحی اور بے اعتنائی کی نظروں کو وہ فوراً پہچان لیتا اور مایوس ہو کر آگے بڑھ جاتا۔ اکثر ہم جنسوں سے گالیوں کا تبادلہ ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے۔ اسے بے حد غصہ آتا۔ آخر وہ اس قدر مغرور اور بد دماغ کیوں تھے۔؟ ان میں ایسی کون سی خوبی تھی۔ جو اس میں نہیں تھی یا پیدا نہیں ہو سکتی تھی بلکہ وہ ان سے زیادہ با صلاحیت تھا اس نے ایک دنیا دیکھی، چوروں اچکوں،کمینوں، ندیدوں، اٹھائی گیروں، سخیوں اور ہر طرح کے اچھے اور برے آدمیوں کا پہچان سکتا تھا وہ نگر نگر اور دوارے دوارے گھوما تھا اور دنیا کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔ اور یہ بزدل اچھے سے اچھا کھاتے عمدہ جگہیں پر رہتے

تھے مگر صرف بھونک سکتے تھے۔ بھونکنے کا جہاں تک تعلق تھا وہ بھوک کے باوجود اب بھی اتنے زور سے بھونک سکتا تھا کہ وہ اس کی آواز سن کر کوٹھیوں کے پورچوں اور مالکوں کی ٹانگوں میں پناہ ڈھونڈیں مگر اپنی اپنی قسمت ہے۔

اے بلاک اور اس قسم کے اعلی بنگلوں والے علاقوں کا وہ اکثر دورہ کرتا رہتا تھا۔ اسے خوش فہمی یا غلط فہمی تھی کہ کسی روز اسے بھی کوئی زنجیر پہنا دے گا لیکن زنجیر تو درکنار کسی نے کبھی ایک ہڈی یا روٹی کا ٹکڑا تک کھانے کو نہیں دیا تھا۔

اے بلاک کا چکر لگا کر وہ چاندی چوک سے ہوتا ہوا کاروں، بسوں اور سکوٹروں سے بچتا بچاتا اصغر مال چوک پر پہنچ گیا۔ پھر متر پورہ چاہ سلطان اور امر پورہ کی گلیوں کے چکر لگاتا رہا مگر کہیں سے کچھ کھانے کو نہ ملا۔

دھوپ تیز ہو گئی تھی، بھوک بھی بڑھ گئی تھی۔ پیٹ میں آگ سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے شاہراہ پہلوی کی طرف لوٹتے ہوئے ایک نالی سے پانی پیا اور جھنگی محلہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ شاہراہ پہلوی کو عبور کرنا بڑا مشکل مرحلہ تھا وہ کافی دیر تک سڑک کے کنارے کھڑا ٹریفک کا جائزہ لیتا رہا۔ اچانک کسی راہ گیر نے اس کے پیٹ میں لات دے ماری اس کی چیخیں نکل گئیں۔ دیر تک پسلیوں میں درد ہوتا رہا اور وہ کراہتا رہا جب ٹریفک کا زور ذرا کم ہوا تو وہ بھاگ کر سڑک عبور کرنے لگا۔ دو رویہ سڑک تھی۔ ایک سڑک اس نے پار کر لی مگر دوسری سڑک پار کرتے ہوئے وہ ایک موٹر سائیکل سے ٹکرا گیا۔ اس کی پچھلی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی وہ بو کھلایا ہو چیختا چلاتا اور لنگڑاتا ہوا بھاگ کر قریبی گلی میں آ گیا اور ایک مکان کے تھڑے کے نیچے بیٹھ کر دیر تک اپنی زخمی ٹانگ کو سہلاتا رہا۔ وہ گھر جہاں سے اسے رات باسی چاول کھانے کو ملے تھے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ اٹھا اور لنگڑاتا ہوا اس گھر کی طرف چل دیا۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ وہ دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اندر سے کھانے کی لذیذ خوشبو باہر آ رہی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگا کہ گھر کا کوئی فرد دروازہ کھول کر کھانے پینے کی کوئی چیز باہر پھینکے کیاپتہ روٹی کا بہت برا ٹکڑا ہو۔ کیا پتہ بوٹی ہو۔ بوٹی کے خیال سے اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

دوپہر ڈھلنے لگی بھوک سے اس کا برا حال تھا مگر کسی نے اب تک دروازہ نہیں کھولا تھا۔ اس نے دو ایک بار بھونک کر اپنی موجودگی کا ثبوت دیا مگر دروازہ بدستور بند رہا۔۔۔ مگر وہ آس لگائے دروازہ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا کافی دیر بعد دبلے پتلے ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ وہ اٹھ کر دم ہلانے لگا۔ اس نے دیکھا آدمی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ دروازے میں کھڑا خالی گلی کو گھور رہا تھا۔ وہ دم ہلاتا رہا یہاں تک کہ اس کی دم تھک گئی اور دکھنے لگی۔ اگر وہ انسانی بولی بول سکتا تو بڑے درد ناک لہجے میں اپنی تکلیف اور بھوک کے بارے میں تفصیل بتاتا اور کہتا!
''بڑی آس لے کر اس دروازے پر آیا ہوں مایوس نہ کرو بہت بھوکا ہوں کچھ ہی لا دو۔۔۔ دعائیں دونگا''۔

اسی لمحے گلی میں ایک عورت نظر آئی۔ اس نے دیکھا آدمی کے چہرے پر بھوک کھنڈ گئی تھی۔ عورت قریب آ کر رک گئی۔ پھر وہ باتیں کرنے لگے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ عورت کو بہت عزیز ہو گی۔ اسے اس کی سفارش پر ضرور کچھ کھانے کومل سکے گا۔ وہ عورت کے قریب جا کر زور زور سے دم ہلانے لگا پھر وہ اس کے پاؤں چاٹنے کے لئے آگے بڑھا تو وہ ڈر کر بھاگ نکلی آدمی کو بے حد غصہ آیا اور اس نے ایک پتھر تان کر اسکی پیٹھ پر دے مارا۔ درد سے بلبلاتا اور لنگڑاتا ہوا وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔

وہ کوہاٹی بازار--- بنی محلہ--- اور کرتار پورہ کی گلیوں میں دیر تک گھومتا رہا سید پوری گیٹ کی ایک نالی میں تھوڑی سی دال کیچڑ میں لت پت ملی جسے کھاتے ہی اس کے پورے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں بھوک اور بھڑک اٹھی تھی۔ ٹانگ میں اب تک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر پتہ نہیں آج کیسا دن تھا۔ کہ کہیں سے کچھ کھانے کو نہیں مل رہا تھا۔

آخر جامع مسجد روڈ کے ایک ہوٹل کے تھڑے کے نیچے اسے چند ایک چچوڑی ہوئی ہڈیاں پڑی مل گئیں۔ وہ انہیں توڑنے اور نگلنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ہڈیوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا تو ہوٹل کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک موٹا سا آدمی برے بڑے لقمے توڑ کر شور بے میں بھگوتا اور منہ میں ڈال لیتا۔ ہر بار جب وہ لقمہ توڑتا اسے ایسا لگتا جیسے ابھی ابھی وہ لقمہ اس کی طرف پھینک دے گا۔ مگر موٹا آدمی بڑا کمینہ اور کنجوس تھا۔ اس کا اپنا پیٹ اتنا بڑا تھا کہ بھرنے کا نام نہیں لیتا تھا پھر بھی اسے توقع تھی کہ شائد بچے کچے کھانے میں سے کچھ نہ کچھ وہ اس کی طرف بھینک دے مگر اسے ناکامی ہوئی اسے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا آگے بڑھ کر موٹے آدمی کی آنکھیں پھوڑ دے اور پیٹ پھاڑ کر نگلے ہوئے سارے نوالے اگلوا لے۔ اسی لمحے ہری پورے والا ڈبو وہاں پہنچ گیا۔ ڈبو سے سب ڈرتے تھے۔ وہ ہری پورہ سے اکال گڑھ تک کے علاقے کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ وہ بڑا طاقت ور لڑاکا اور بد خو تھا۔ کسی دوسرے کو اپنے علاقے میں دیکھ کر بھڑک اٹھتا تھا۔ ڈبو نے اسے دیکھ کر تیوریاں چڑھائیں اور دانت نکوس کر غرانے لگا۔ ’’تم اس طرف کیوں آئے ہو‘‘؟

’’مجھے بھوک لگی ہے اور میں زخمی ہوں ‘‘۔

’’بک بک نہ کرو۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ‘‘۔

وہ دم دبا کر پرانے قلعے کی طرف چل دیا۔ شاہ چن چراغ کے محلے کی طرف نکل گیا۔ سخت گرمی تھی۔ اس کی زبان لٹک رہی تھی۔ بار بار نالیوں سے پانی پیتا۔ وہ گلی گلی گھومنے لگا۔ ایک تنگ سی گلی میں انسانی فضلہ دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ پیٹ کی آگ بجھا لے لیکن اسے پچھلے سال کی بات یاد آ گئی۔ جب وہ یہ گند کھانے پر سخت بیمار ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اس کا خیال تھا اس طرح اسے کسی گھر میں کبھی جگہ نہ ملے گیا ور غلیظ اور گندہ سمجھا جائے گا۔

بھابڑ خانہ اور چٹیاں بٹیاں کا علاوہ گھومتے گھومتے وہ بھوک اور ٹانگ کی تکلیف سے نڈھال ہو گیا۔ سنسان تھیں۔ کہیں کہیں اپنے ہم جنسوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ خلاف معمول جان بچا کر نکل جاتا۔

شاہراہ پہلوی کو دوبارہ عبور کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا نیا محلہ کی گلیوں میں پہنچ گیا۔ یہاں تک جگہ کوڑے کا ڈھیر تھا۔ کوڑے کرکٹ سے بعض اوقات اچھی بھلی چیزیں مل جاتی تھیں۔ وہ اس ڈھیر کے قریب پہنچا تو پریشان ہو گیا۔ اس کے کئی ہم جنس وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ غرانے لگے لیکن کسی کو لڑنے جھگڑنے کی فرصت نہیں تھی۔ کافی دیر تک سونگھنے اور منہ مارنے کے بعد اسے ایک چھیچھڑا مل گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے موہن پورے کے کالو نے جھپٹ کر اس سے یہ چھیچھڑا چھین لیا۔ اسے غصہ تو بہت آیا لیکن نقاہت کی وجہ سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ نا چار خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ رات گئے تک وہ کوڑے کے ڈھیر میں منہ مارتا اور چھوٹی موٹی چیزیں تلاش کرتا رہا اس کی بھوک ابھی مٹی نہیں تھی اس کے ہم جنس ادھر اُدھر نکل گئے تھے کوڑے کے ڈھیر میں اب کچھ نہ تھا۔ وہ سبزی منڈی کی طرف چل دیا دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ یہاں اکثر کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔ اس کے بہت سے ہم جنس پہلے سے موجود تھے۔ عام حالات میں وہ ان سے چھین بھی لیتا تھا لیکن آج زخمی اور نڈھال ہونے کی وجہ سے وہ ان سے خوف زدہ تھا اور دور دور رہتا تھا۔ آدھی رات کو جب وہ ایک ایک کر کے چلے گئے تو اس کے لئے وہاں چاٹنے کو بھی کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے پھلوں کے چھلکے چکھے--- نالیاں سونگھیں ایک ایک دکان کے تھڑے کے نیچے تلاش کیا مگر کھانے کی کوئی چیز نہ ملی۔ اس نے خاموش اور سنسان راجہ بازار کا چکر لگایا۔ لیاقت روڈ اور جناح روڈ پر گھومتا رہا۔ آخر تھک ہار کر گوالمنڈی کے پل کی طرف نکل گیا اور پل کے نیچے گھاس پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی لیکن بھوک تھکن اور ٹانگ کی تکلیف سے جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے اپنی تکلیف اور بے بسی پر رونے لگا۔ اچانک اس کے نتھنوں میں کچے اور تازہ گوشت کی بو آئی۔ وہ سونگھتا ہوا آگے بڑھا لمبی لمبی گھاس میں سیاہ رنگ کی بلی بیٹھی کچا لذیذ اور تازہ گوشت کھا رہی تھی۔ وہ تیزی سے جھپٹا مگر بلی اپنا شکار منہ میں دبائے بھاگ کی پل پر چڑھ گئی۔ وہ دیر تک مرغی کے بکھرے ہوئے پروں کو سونگھتا اور چاٹتا رہا۔ اسے بلی پر بڑا رشک آیا۔ کاش وہ بلی ہوتا۔

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے پہچان کر بڑا اطمینان ہوا کہ اس کی زخمی ٹانگ کافی حد تک ٹھیک ہو چکی ہے۔ وہ گوالمنڈی کا پل عبور کر کے دریا آباد کی ایک گلی میں آ گیا۔ بھوک سے اس کے پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے پھر پورے شہر کی گلیاں اور تپتا ہوا پہاڑ سا دن تھا۔ ہر روز یہی چکر چلتا تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ، لڑائی، جھگڑوں اور مار پیٹ کے بعد بھی پیٹ بھرنے کو کچھ

نہیں ملتا تھا۔ اسے بلیوں پر بڑا رشک آتا تھا جو چھین جھپٹ کر پیٹ بھر لیتی تھی۔ شرافت کی یہ انسان کہاں قدر کرتے ہیں۔

دوپہر کے قریب گلیاں چھان کر اور تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی نظر ایک بوڑھے آدمی پر پڑی جو روٹیوں کی چنگیر اٹھائے آ رہا تھا۔ تازی روٹیوں کی مہک چاروں طرف گلی میں پھیل گئی تھی۔ اس نے بہت ضبط کیا مگر وہ خود پر قابو نہ پا سکا۔ اٹھ کر بھاگ نکلا وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک ایک کر کے ساری روٹیاں قریبی مکان کے تھڑے کے نیچے پہنچائیں۔ اور پھر مزے سے بیٹھ کر کھانے لگا۔

وہ جب سے پیدا ہوا تھا اس نے آج تک پیٹ بھر کر کبھی نہ کھایا تھا۔ اتنی بہت ساری روٹیاں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کر کھانے کی تمنا آج پوری ہو رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی روٹیاں نگلنے لگا۔ کاش اس کے کئی منہ ہوتے روٹیاں چباتے ہوئے اس نے بہت سے آدمیوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ ان کے ساتھ روٹیوں والا بوڑھا بھی تھا۔ خطرے کی بو سونگھ کر وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اتنی ساری روٹیاں۔۔۔ زندگی کی سب سے بڑی تمنا کو ادھورا چھوڑ کر جانے کو اس کا جی نہ چاہا۔ وہ منہ دوسری طرف کر کے بڑے اطمینان سے روٹیاں چباتا رہا جب وہ آخری روٹی چبا رہا تھا تو قریب ہی کہیں دھما کہ ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسا اس کے پیٹ سے روٹیاں پانی بن کر بہنے لگی ہیں۔

جب کمیٹی والوں نے اسے گھسیٹ کر ٹرک میں لادا تو اس کے منہ میں روٹی کا آخری ٹکڑا تھا۔

***

کھلی آنکھیں

اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ مر گیا ہے یا ابھی نہیں مرا۔ تھوڑا بہت مر کر تو اس نے اپنی زندگی میں کئی بار دیکھا تھا کیا پتہ آج وہ بہت زیادہ مر گیا ہو مگر کیوں اور کیسے۔؟

اسے کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس وقت کس حالت میں اور کہاں اور کس قسم کی سواری پر کہاں جا رہا ہے۔ یا لے جایا جا رہا ہے اور پتہ نہیں اس کا جسم بھی اس کے ساتھ ہے یا اب صرف روح باقی رہ گئی ہے جو ہوا میں اڑتی پھرتی ہے۔

اس نے ہاتھ پاؤں ہلانے جلانے کی کوشش کی مگر پتہ نہیں وہ تھے بھی یا نہیں اور اگر تھے تو ہلتے جلتے کیوں نہیں تھے اور اگر نہیں تھے تو کہاں گئے تھے۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا جسم لوہے چون کا ایک ڈھیر ہے اور کسی بڑے سارے مقناطیس کی طرف دانہ دانہ کر کے اڑتا جا رہا ہے۔ یا پھر اس کا وجود اب صرف دو آنکھیں ہیں جو بڑ بڑ آسمان کی طرف تک رہی ہے۔ مگر نہیں آنکھوں سے زیادہ بھی کوئی شے ضرور تھی ورنہ وہ سوچ کیسے سکتا اور آسمان پر چمکتے ستاروں اور کھمبوں پر جلتے بلبوں میں کیسے تمیز کر سکتا ضرور اس کی کھوپڑی بھی ساتھ ہو گی۔ تاہم اگر کھوپڑی تھی بھی تو اس میں چھید ضرور ہو گیا تھا اور ایسا ہی لگتا تھا جیسے کھوپڑی کے پیالے سے اس کی یادداشت بوند بوند کر کے ٹپک رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بوند کھرنڈ بن کر چھید کے منہ پر آ کر رک جاتی تو یاد داشت کا نیا پھول کھلتا۔

پہلے اسے خیال آیا کہ وہ کسی کشتی میں چت لیٹا ہوا ہے اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے بندھے ہیں اور کشتی کسی نہر میں اس طرف کو بہتی چلی جا رہی ہے جدھر پانی بہتا ہے۔ مگر نہر کے کنارے شیشموں اور عمودی کناروں کی بجائے اونچے اونچے کھمبے اور کئی کئی منزلہ عمارتیں دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ نہر

میں نہیں--- اور کشتی کی بجائے کسی اور طرح کی سواری پر سوار ہے کسی اور طرح کی سواری کا خیال کر کے وہ لرز گیا۔ اگر اس کے دل پر تالا نہ پڑا ہوتا تو اس کا دل اس خیال سے بیٹھ جاتا--- اور طرح کی سواری جنازے کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

مگر ابھی وہ بالکل تو نہیں مرا تھا۔ پھر انہیں اسے دفنانے کی اتنی جلدی کیوں تھی؟ ممکن ہے وہ ان کے خیال میں مر گیا ہو مگر دراصل ابھی نہ مرا ہو۔ یا بظاہر مرا ہوا نظر آتا ہو مگر اندر سے ابھی زندہ ہو۔

اسے اس بات کی سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ زندہ آدمی کا حساب کتاب کیسے ہو گا منکر نکیر کا خیال کر کے اسے ہول آنے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ انہیں بتائے کہ وہ ابھی مرا نہیں مگر کوئی آواز اس کے حلق سے نہ نکل سکی۔ پتہ نہیں اس کا حلق تھا بھی یا نہیں ؟ اس نے ہاتھ ہلانے جلانے کی پھر کوشش کی مگر وہ شائد اب صرف گواہی دینے کے لئے رہ گئے تھے۔ جسم کے سارے اعضا باغی اور نا فرمان ہو گئے تھے مگر آنکھیں ؟

ہاں آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔ مگر ایک ہی سمت میں--- بلندی کی جانب۔ آنکھوں کے کونوں میں دونوں جانب کی بلند عمارتوں کی پھکی پھیکی تصویر آ رہی تھی۔ عمارتوں کی وسعت سے اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ سڑک اس کی جانی پہچانی ہے۔ پھر اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ اسے کون سے قبرستان میں دفنائیں گے۔ سے امید کی ایک کرن نظر آئی وہ اسے قبر میں اتارنے سے پہلے جب آخری بار اس کا منہ دیکھنے لگیں گے تو اس کی روشن آنکھیں دیکھ کر انہیں خود ہی پتہ چل جائے گا کہ وہ ابھی نہیں مرا۔ قبرستان سے لوٹ آنے کا خیال سے یاد داشت کے ننھے ننھے پھول اس کی آنکھوں کے سامنے کھلنے لگے۔ پھر کسی کار کا ہارن سنائی دیا--- یہ پہلی آواز تھی جو اس نے سنی اور اس آواز کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں بھری ہوئی ریت کرنے لگی۔

پھر اس نے دیکھا اس کا جنازہ ایک سینما بلڈنگ کے قریب آ گیا ہے اسے ایک عورت کی بڑی ساری تصویر نظر آئی۔ اس کا پیٹ ننگا تھا۔ پھول ایسی ناف نے اسے آنکھ ماری تو اس کے دل پر لگے خاموش قفل میں چابی سی گھوم گئی۔ تصویر پیچھے رہ گئی مگر پھول ایسی ناف آنکھ بن کے ہمراہ چلتی رہی اس نے سوچا چلو شکر ہے اس آخری وقت میں دیکھنے کے لئے کچھ تو ساتھ ہے۔

مگر پھر یہ سوچ کر کہ جب شہر میں اس سے بڑھ کر چیزیں دیکھنے اور دکھانے کا رواج ہو گا وہ نہیں ہو گا--- وہ رو پڑا اور پتہ نہیں وہ کب تک روتا رہتا اگر اسے اپنے جسم سے برادہ سا گرنے کا احساس نہ ہوتا۔ اسے لگا جیسے اس کے جسم میں کیڑا لگ گیا ہے اور جگہ جگہ سوراخ ہو گئے ہیں۔ یاد داشت کا ایک پھول کھلا اور وہ ہنس پڑا۔ سامنے فرنیچر کی وہ دکان تھی جہاں سے خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوتا تھا۔ اسے یاد آیا اس نے ایک بار بڑی قیمتی میز خریدی تھی۔ جس کو دیمک لگی

ہوئی تھی۔ دیمک میز کو چاٹتی رہی اور برادے کے ڈھیر لگاتی رہی جب میز ختم ہو گئی تو دیمک اس کی کھوپڑی میں گھس گئی۔ کیا پتہ اسی نے اسے اس حالت میں پہنچایا ہو۔ میز کے ساتھ ہی اسے گھر اور بیوی بچے یاد آ گئے۔

بڑا کتاب پڑھتا اور چھوٹا چوسنی نظر آیا۔ اس کی بیوی غسل خانے سے نہا کر ننگے پاؤں ٹائیلوں کے فرش سے گزری تو ٹائیلوں کے بیل بوٹوں سے خوشبو آنے لگی۔

جنازہ اور آگے بڑھا تو اسے سرخ رنگ کی ایک عمارت نظر آئی اسے نظر تو نہ آیا مگر اس حوالے سے اس کے ذہن میں بس سٹاپ ابھر آیا جہاں ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی پورے سات سال بعد اسے اچانک دیکھ کر وہ موٹر سائیکل سے گرتے گرتے بچا تھا۔ پھر موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے وہ اس کے قریب آیا اور بولا۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے تم لوٹ آئی ہو چچا خان کی آنکھیں رو رو کر۔''

لڑکی نے اس کی بات کاٹ دی اور ناک سیکڑ کر بولی۔

''کون ہو تم۔۔۔ دفع دور''

اس کا جی چاہا وہ س دنیا سے ہمیشہ کے لئے دفع ہو جائیا ور کہیں دور جا کر مر جائے مگر وہ مر نہ سکا تاہم اس کے اندر کوئی چیز مر گئی عجیب کھیل ہے اس نے سوچا جب آدمی مرنا چاہتا ہے مر نہیں چاہتا وہ دفنانے کے لئے لے بھاگتے ہیں۔

چوک میں کسی بھکاری نے صدا دی۔

''دے جا سخیا! راہ خدا تیرا اللہ بوٹا لائے گا۔''

وہ تقطیع کرنے لگ گیا۔ مگر کھوپڑی کے پیالے سے بوند بوند یاد داشتیں ٹپکنے لگیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

بڑی سے چھوٹی سڑک کی طرف مڑتے ہوئے پھر روشنی ہو گئی اور عبد الکریم کا مکان نظر آیا۔ کئی سال پہلے جب اس کی جیب کٹ گئی تھی اور داخلے کے فارم کے ساتھ امتحان کی فیس کے پیسوں سے بھی وہ ہاتھ دھو بیٹھا تھا تو عبدالکریم نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

عبدالکریم کو لوگ برا کہتے تھے مگر وہ اسے اچھا لگتا تھا کیا پتہ وہ بھی اندر سے اچھا ہو مگر باہر سے برا معلوم ہوتا ہو وہ عبدالکریم کے بارے میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر یاد داشت کی کھڑکی خود بخود بند ہو گئی۔

پھر جب کھڑکی کھلی تو اسے اپنا گھر یاد آیا۔

اسے یاد آیا۔

اس نے ان کے سامنے تین بار کلمہ پڑھا تھا۔ اس کی بیوی نے بھی پڑھا تھا۔ بڑے نے بھی پڑھا تھا صرف چھوٹا چوسنی چوستا رہا تھا۔

پھر اسے وہ یاد آئے ایک نور علی دودھ والا تھا۔ ایک عبدالحمید تھا جس نے مسجد سے کلاک چرایا تھا۔ ایک اللہ دتہ تھا جس کے گھرکے سامنے رات کو کاروں کی قطار لگتی تھی، ایک خادم حسین تھا۔ ایک علی محمد تھا۔

اسے کتنے ہی نام یاد آئے مگر اپنا نام یاد نہ آیا۔ اسے اتنا یاد آیا کہ وہ اپنا نام بتاتا تھا مگر کوئی یقین نہیں کرتا تھا۔ وہ قسمیں کھاتا تھا مگر اس کی قسموں پر کوئی ایمان نہ لاتا تھا۔

وہ اپنا نام یاد کرنے لگا---- نور الدین---- رحیم بخش---- لطیف خان سب اجنبی نام تھے---- سب ناموں پر دوسروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ کیا پتہ اس کے نام پر بھی قبضہ ہو چکا ہو اور وہ بے نام ہو گیا ہو۔

اسے ایسا لگا جیسے سوچ سوچ کر اس کی کھوپڑی کا سوراخ زیادہ چوڑا ہو گیا اور جھکے ہوئے تھے اور اسے ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہے تھے۔

شائد اسے قبر میں اتارنے لگے تھے۔ اس نے کہا

''عقل کے اندھو---- میری آنکھیں دیکھو---- میں زندہ ہوں---- میں ابھی مرنا نہیں چاہتا میں نے تو ابھی پھول کی آنکھ ایسی ناف والی نئی فلم بھی نہیں دیکھی۔''

مگر اس کی بات کسی نے نہیں سنی۔ ایک کہنے لگا۔

''تم لوگوں نے بڑی دیر کر دی ہے۔''

دوسرے نے کہا:

''ہم نے دیر نہیں کی---- پہلے بڑے ہسپتال میں لے گئے انہوں نے کہا۔ یہ پولیس کیس ہے چھوٹے ہسپتال میں لے جاؤ---- ہم یہاں لے آئے''

شکر ہے اس نے سوچا کہ یہ ہسپتال ہے قبرستان نہیں۔ امید کا چراغ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے لمحہ بھر کے لئے جھلملایا پھر دھوئیں میں تبدیل ہو گیا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا

''آپ لوگ تھوڑی دیر پہلے پہنچ جاتے تو شائد یہ بچ جاتا۔ اب اس کا سارا خون نچڑ گیا ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

کچھ نہیں ہو سکتا----

وہ کانپ گیاپھر اسے ان سب پر---- اور بڑے ہسپتال والوں پر بے حد غصہ آیا---- اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اس نے جلدی جلدی کلمہ پڑھنا چاہا مگر اس کے منہ سے کچھ اور ہی نکل گیا۔

***

کوئی ہے!

(کون ہو تم اور کیا دیکھتی ہو---- شائد تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہیں نہیں جانتا)

''خواتین و حضرات---- میں جناب صدر کی اجازت سے سب سے پہلے اپنی غزل پیش کرتا ہوں ''

''ارشاد''

''دشمن اناج کا''

''بے شرم---- اپاہج باپ پر ترس نہیں آتا جوان بہن کا ہی کچھ خیال کر''

''خیال سے کیا ہوتا ہے''

''تمہارا سر---- جوان جہان ہے مگر تو کچھ کرنا بھی چاہے''

''میں کرنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں تمہارے لئے، آپا کے لئے'' بابا کے لئے اپنے بچوں، پوتوں،پڑ پوتوں اور ان کے پڑ پوتوں کے لئے''

''پتہ نہیں کیا بکتا ہے''

''میرے بچو----- میرے پوتو---- میرے پڑ پوتو--- میرے ہونے والی نسلو یقین جانو میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہو، اپنے لئے نہیں تمہارے لئے تم سب کے لئے''

(تمہاری آنکھیں بڑی دلکش ہیں ایسی تصویروں میں ملتی ہیں ایک بار میں تصویروں کی نمائش دیکھنے گیا۔ دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ فیس بھی نہیں تھی۔ ایک تصویر مجھے بے حد پسند آئی میں دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر وہ مجھ سے کہنے لگی جاؤ مجھے میلا نہ کرو۔ میں----)

'' اور اب میں جناب الف سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنا کلام سنائیں ''

''جناب الف''

''آپ کا دفتر کہاں ہے؟''

’’میرا دفتر بے حد طویل و عریض ہے۔ کھول بیٹھو۔‘‘

’’ائرکنڈیشنڈ بھی ہو گا۔‘‘

’’نہیں ساؤنڈ پروف ہے‘‘

’’ساؤنڈ پروف؟‘‘

’’ہاں۔۔۔ کوئی چیخ باہر سنائی نہیں دیتی۔‘‘

(تم اس قدر دور کیوں بیٹھی ہو جب تم مسکراتی ہو لہو کی بوندیں ٹپ ٹپ میرے دل پر گرتی ہیں اور میرا دل بتا شے کی طرح گھلنے لگتا ہے۔ اگر تم ہنس پڑو تو میں خون میں لت پت ہو جاؤں)

’’بے غیرت ہے‘‘

’’اس کا خون سفید ہو گیا ہے‘‘

’’کون کہتا ہے، یہ دیکھو۔۔۔ کیا یہ سفید ہے؟‘‘

’’یہ تو نے کیا کیا؟‘‘

’’جی فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ‘‘

’’خدمت؟۔۔۔ میری؟۔۔۔ میں منیجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں ‘‘

’’آپ تشریف رکھیں میں ان کو اطلاع دیتا ہوں ‘‘

’’جی شکریہ‘‘

’’شائد آپ ان کے عزیز ہیں ؟

’’جی نہیں مجھے ملازمت کی تلاش ہے‘‘

’’ملازمت؟۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں کوئی جگہ نہیں تم جا سکتے ہو۔‘‘

(تمہارے بال۔۔۔ تم اپنے بال سمیٹ کیوں نہیں کیوں نہیں لیتی ہو۔ تم اتنے کروڑوں اربوں بال کیسے اٹھائے پھرتی ہو۔ مجھے لمبے، گھنے اور بہت سارے بال بڑے اچھے لگتے ہیں۔ ایک بار میں نے ایک لڑکی کی تصویر بنائی اس کے بال بے حد لمبے تھے مگر آپا کو تصویر پسند نہ آئی اس کا کہنا تھا اس میں بال ہی بال ہیں لڑکی نہیں ہے۔ بے چاری آپا کو کیا پتہ لڑکی کا منہ تو دوسری طرف تھا)

’’خواتین و حضرات۔۔۔ حضرت جیم تشریف لاتے ہیں ‘‘

’’کیا کام کر سکتے ہو؟‘‘

’’دنیا کا ہر کام کر سکتا ہوں۔ بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔ اینٹیں ڈھو سکتا ہوں۔ لکڑیاں چیر سکتا ہوں۔ فرش صاف کر سکتا ہوں۔ کھانا پکا سکتا ہوں۔‘‘

’’تمہیں کھانا پکانا آتا ہے۔‘‘

’’ہاں مجھے کھانا پکانا اور کھانا بہت اچھا لگتا ہے۔‘‘

(تمہارا نام کیا ہے۔کیا نام ہو سکتا ہے۔ سعیدہ، فریدہ، عبید، جمیلہ،طلعت، فرحت۔۔۔ کوئی سا نام بھی ہو مجھے تو سارے نام اچھے لگتے ہیں)

’’جی ڈگری بھی ہے۔۔۔ مگر سر وہ اچھی نہیں ہے۔‘‘

’’کیا مطلب؟۔۔۔ نمبر کم لئے تھے۔‘‘

’’نہیں سر۔۔۔ نمبر تو بہت تھے۔ پچھلی بارشوں میں ہمارے گھر میں پانی چڑھ آیا تھا۔ ٹرنک میں رکھی ساری چیزیں خراب ہو گئی تھیں ‘‘

’’ہمیں زیادہ پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔ بہتر ملازمت ملنے پر تم چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ ویسے بھی ہم تمہاری ڈگری کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتے۔‘‘

’’جی بے حرمتی کی کوئی بات نہیں میں برا نہیں مانتا ویسے بھی وہ بھیگ کر خراب ہو گئی ہے‘‘

(نہ کرو۔۔۔ مجھے خوار نہ کرو۔۔۔ مجھے اس طرح دلچسپی سے نہ دیکھو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ برباد ہو جاؤں گا۔ میری راتوں کی نیند حرام ہو جائے گی)

’’ماں مجھے بھوک لگی ہے‘‘

’’وہ آتی ہو گی ہم سب اس کے منتظر ہیں۔‘‘

’’میں اس کی کمائی اور لائی ہوئی روتی نہیں کھاؤں گا‘‘

’’پھر ڈوب مر‘‘

’’ہاں مجھے ڈوب مرنا چاہئے لیکن یہ جرم ہے۔ وہ میرا چالان کر دیں گے مجھے ان سے بے حد ڈر لگتا ہے۔

(کہاں رہتی ہو کس شہر سے آئی ہو کیا وہاں سورج نکلتا ہے لو چلتی ہے کیا تم پر سورج کی شعاعیں کبھی نہیں پڑیں۔ اگر ایسا نہیں تو تمہارے آس پاس بیٹھی ہوئی گوری چٹی لڑکیاں اس قدر میلی کیوں لگ رہی ہیں)

''اب میں جناب دال سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ سٹیج پر تشریف لائیں۔''

''عرض کیا ہے''

''ارشاد''

''موج، رنگ کرن، پھول، گلاب، شفق، اوس، آنکھ۔''

''تیری قسم ماں--- وہاں ہڑتال ہو گئی''

''اچھا ٹھیک ہے۔ کھانا کھا لے''

''مجھے بھوک نہیں ہے---''

''کیوں بھوک نہیں ہے---''

''اب مجھے کبھی بھوک نہیں لگے گی۔ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کر پھینک دیا ہے۔''

(بس کرو--- ختم کرو--- خدا کے لئے باز آ جاؤ--- تم تو مجھے مار ڈالنا چاہتی ہو۔ تم نہیں جانتی ہو میں کس قدر بھر بھرا ہوں تم مجھے کیوں ریزہ ریزہ کرنا چاہتی ہو۔ مجھ پر ترس کھاؤ--- میرے بچوں، میرے پوتوں --)

''کاکا--- کوی کام ملا''

''بابا--- میں کاکا نہیں ہوں۔ میں تو پیدا ہوتے ہی اوور ایج ہو گیا تھا۔''

(شائد تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں تمہیں نہیں جانتا۔ مگر شائد تم مجھے جانتی ہو۔ کمال ہے تو خوابوں پر یقین کر لیتی ہو۔ مجھے تو بھول ہی جاتے ہیں)

''اب آپ کے سامنے ملک کے نامور شاعر حضرت نون تشریف لاتے ہیں ''

(اچھا تو تم مجھے ہپنا ٹائز کر رہی ہو---مگر کیوں--- یہ ظلم ہے یہ زیادتی ہے۔ مجھے آزاد کر دو۔ میں گردن گھمانا چاہتا ہوں میں پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں میں اسٹیج پر جانا چاہتا ہوں لیکن اسٹیج کہاں ہے؟ اور لوگ کہاں ہیں ؟--- میرے بازو کہاں ہیں میرے پاؤں ؟ میرا دھڑ؟--- میرے کندھوں پر میری گردن نہیں ہے۔ شائد میں نے خود اتار کر کہیں رکھ دی ہے۔ کہاں رکھ دی ہے؟)

''دن بھر کاغذ کالے کرتا رہتا ہے؟''

''تصویریں بناتا اور شعر کہتا ہے ماں ''

''یہ موئے شعر کیا ہوتے ہیں ؟''

''جیسے وہ پکے مکان والوں کے ریڈیو پر گائے جاتے ہیں۔''

''اسے شرم نہیں آتی--- پکے مکان والوں کی ریس کرتا ہے''

(مجھے میری گردن لا دو۔ میں پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا دھڑ میری گردن کے لئے تڑپ رہا ہے۔ رحم کرو--- خدا کے لئے---)

''نکل جا--- نکل جا گھر سے''

''بے شرم--- بے غیر---''

(میری غیرت کدھر گئی--- اور میری گردن؟--- اور لوگ--- تم--- تم ڈائن ہو--- تم نے ہنستے بولتے انسانوں کو مجسموں میں بدل دیا ہے۔ تم مجھے پتھر کرنا چاہتی ہو--- لیکن میں پتھر ہونا نہیں چاہتا--- میرے بچو--- میرے پوتو--- میرے پڑ پوتو--- گواہ رہنا کہ میں نے چاہا تھا پتھر نہ ہونے پاؤں)

''لوگو تم کہاں ہو؟''

''تم سب کدھر چلے گئے--- کوئی ہے؟''

''کوئی ہے--- کوئی ہے۔''

''ہائے وہ ہنستے مسکراتے لوگ---''

''اب حضرت حمزہ کی باری ہے۔خواتین و حضرات--- حضرت حمزہ۔''

''حمزہ؟''

''(کیا سب لوگ زندہ ہو گئے معاف کرنا--- ہم نے تمہیں ڈائن کہا--- تم تو کسی ملک کی شہزادی ہو--- پری ہو---)

''آپ کون ہیں ''

''میں شاعر ہوں۔ حمزہ ہوں۔''

''پاگل ہے''

''اوئے اوئے''

''آپ تشریف لے جائیے''

''میں شعر سناؤں گا۔ آپ نے مجھے پکارا ہے۔''

''میں نے جناب حمزہ کو پکارا ہے آپ تشریف لے جائیں۔''

’’پڑھنے دو--- پڑھنے دو‘‘

’’عرض کیا ہے‘‘

’’مکھی مچھر کھٹمل پسو کھانسی بلغم خون بخار‘‘

’’خوب کہا ہے‘‘

’’کہیں سے اڑایا ہے‘‘

’’پاگل ہے‘‘

’’اوئے اوئے‘‘

’’(نہ جاؤ--- پری جی--- ٹھہر جاؤ--- شعر تو سنو--- بات تو سنو--- مجھے اپنا بال تو دیتی جاؤ--- مجھے اپنے ساتھ لے چلو--- ٹھہرو--- میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں)

’’حضور--- اس نے زبردستی اسٹیج پر چڑھ کر الٹے سیدھے دو ایک شعر سنائے پھر دیکھتے دیکھتے بھاگ کر کھڑکی سے کود گیا--- یہی ہمارا مشترکہ بیان ہے-‘‘

***

ماس اور مٹی

سب سے پہلے حمد اس رب کی جس کی قدرتوں کا کچھ شمار نہیں۔

اس نے لاکھوں کروڑوں دنیائیں، کہکشائیں اور چاند سورج پیدا کئے۔

اس نے دس لاکھ میل قطر کا سورج بنایا اور اسے کائنات میں ایک نقطے کی حیثیت بخشی۔ اس نے اربوں کھربوں ایسے ستارے بنائے جن میں سے بعض کی روشنی ہم تک لاکھوں کروڑوں سالوں میں پہنچتی ہے۔

پھر درود اس نبیؐ پر جس نے بادشاہوں کو فقیری اور فقیروں کو بادشاہت دے کر ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا اور اس نے ان کی عقلوں سے پتھر ہٹا کر اپنے پیٹ پر باندھ لئے۔

پھر سلام روشنی کے ان میناروں کو جنہوں نے باطل کا ساتھ نہ دیا اور حق کی خاطر اپنی گردنیں کٹوائیں اور کھالیں اتروائیں۔

پھر رحمت ان عظیم لوگوں پر جنہوں نے فضا میں ایتھر، زمین میں تیل اور ایٹم میں الیکٹرون پروٹون دریافت کئے۔

اور آخر میں شاباش ان بہادروں کو جنہوں نے ہر حال میں زندگی کا سفر جاری رکھا اور اس رب کا جس کا ذکر اوپر آیا ہے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

حمد، نعت اور اس تمہید کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

یہ کہانی میرے اپنے گرد بھی گھومتی ہے لیکن اس کا مرکزی کردار ناتو سانسی ہے۔

ناتو سانسی میرے گاؤں کا رہنے والا ہے اور کچھ عرصہ سے گاؤں چھوڑ کر شہر میں آ گیا ہے۔ آپ نے اخبارات میں پڑھا ہو گا کہ کچھ عرصہ سے شہر میں چوری کی انوکھی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ چوروں کی ایک ٹولی بڑے بڑے بنگلوں میں گھس کر یا نقب لگا کر باورچی خانوں سے کھانے پینے کی ہر چیز چٹ کر جاتی ہے۔ ان بھوکے پیاسے چوروں کے ہاتھ جو چیز لگتی ہے وہ کھا پی کر غائب ہو جاتے ہیں۔کپڑے، زیور، نقدی اور دوسری قیمتی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ وہ شربت، بیئر اور اسکوایش کی بوتلیں پی جاتے ہیں۔ ریفریجریٹروں میں رکھی ہوئی آئس کریم، پھل،مکھن اور ڈبل روٹیاں کھا جاتے ہیں اور جتنی بھی شکر ملے پھانک جاتے ہیں۔

رب نے ہر انسان کی روزی مقرر کی ہوئی ہے۔

وہ پتھر میں کیڑے کو بھی پالتا ہے۔

اس نے ہر آدمی کا حصہ زمین کے اندر کہیں نہ کہیں چھپا کر رکھ دیا ہوا ہے تاکہ وہ دنیا میں آئے تو اپنا حصہ تلاش کر لے۔

کچھ لوگ اپنا حصہ تلاش نہیں کرتے اور بھوک سے مر جاتے ہیں یا مانگ تانگ کر اور چھین جھپٹ کر وقت گزارتے ہیں۔

بعض دوسروں کے حصے بھی تلاش کر لیتے ہیں،پھر مانگنے والوں کو تھوڑا تھوڑا دے کر دعائیں لیتے اور ثواب کماتے ہیں۔

چوروں کی یہ ٹولی بھی اپنا حصہ تلاش کرتی پھرتی ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس ٹولی میں کم از کم چھ سات چٹورے آدمی ضرور ہیں،جو دس بارہ آدمیوں کی خوراک ایک ہی وقت میں ہضم کر جاتے ہیں۔ ٹڈی دل کی طرح جہاں سے گزر جاتے ہیں ہر چیز کا صفایا کر دیتے ہیں۔

مجھے شبہ ہے ناتو سانسی ان میں ضرور شامل ہے۔

میں نے اسے کئی مرتبہ بس اسٹاپوں، پھل فروٹ کی دکانوں اور سینماؤں کے ٹی اسٹالوں پر دیکھا ہے۔ اس نے بھی مجھے دیکھا ہے لیکن شاید میرے لباس کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہیں سکا یا پھر جان بوجھ کر اجنبی بنا رہا کہ سلام نہ کرنا پڑے۔ مجھے یاد ہے اس نے زندگی بھر گاؤں کے کسی زمیندار یا چودھری کو سلام نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہر ایک کو اس پر خواہ مخواہ غصہ آ جاتا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کو اس پر محض اسی وجہ سے غصہ آتا تھا۔ شہر آنے سے پہلے اس نے گاؤں والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ابا جی کو ڈر تھا کہ وہ شہر آ کر مجھے ڈھونڈ لے گا اور پھر روزگار یا بھیک کے سلسلے میں مجھے اکثر پریشان کرتا رہے گا۔ لیکن اس نے تو مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا ہے اور اسے اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اسے گلے سڑے پھل جمع کرتے اور سگریٹ کے ٹکڑے چنتے دیکھا ہے۔ سینماؤں میں انٹرول کے وقت وہ ٹی اسٹالوں پر کھڑا نظر آتا ہے اور کوکا کولا اور سیون اپ کی بوتلوں میں بچے کھچے گھونٹ پیتا ہے،جنہیں لوگ اس لئے چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیٹ میں جگہ نہیں ہوتی کئی بار میرا جی چاہا اسے اپنے پاس بلاؤں اور کچھ دے ڈالوں مگر اس کی بے نیازی دیکھ کر ارادہ ترک کرنا پڑا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے فلٹر ٹپڈ سگریٹوں کا دھواں اڑاتا اور باری باری ہر بوتل سے بچا کھچا سوڈا واٹر پیتا رہتا ہے۔ اس نے کبھی میری پرواہ نہیں کی۔ اسے شاید کسی کی بھی پرواہ نہیں۔ اسے باپ کی بھی نہیں جسے اس کے بدلے گاؤں والوں نے مار مار کر ادھ موا کر دیا اور چمڑی ادھیڑ دی تھی۔ اس کا باپ

عرصہ سے اپنی ادھڑی ہوئی کھال، کٹے پھٹے جسم اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں سمیت چارپائی پر پڑا کراہتا رہتا ہے۔ مگر ناتو نے پلٹ کر کبھی اس کی خبر نہیں لی۔

ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کو دور دور سے اجنبیوں کی طرح دیکھتے ہیں۔ ہمارے درمیان روز بروز فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔وہ مجھ سے ہی نہیں کبھی کسی سے مدد یا خیرات لینا نہیں چاہتا اور میں سوچتا ہوں کہ آخر نا توؔ میرے کس کام آ سکتا ہے؟

میں نے گاؤں میں بھی شاید ہی کبھی اس سے بات کی ہو۔ میرا اس سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ ہاں اس کی ماں عالمے اور بہن مادو ہر روز بھیک مانگنے گاؤں کا چکر لگاتی ہوئی ہمارے ہاں بھی آتیں اور رسمی سی بے لجاجت دعائیں دیتیں۔ مجھے دیکھ کر اکثر تھوڑی بھیک پر قناعت نہ کرتیں اور اماں کو معمول سے کچھ زیادہ دینا پڑتا۔

شیروؔ اس کا باپ تھا۔ باپ بیٹا دونوں کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ کام نہ کرنا ان کی خاندانی روایت تھی۔ وہ چوری کر سکتے تھے، ڈاکہ ڈال سکتے تھے، قتل کر سکتے تھے، شکار کھیل سکتے تھے مگر کام کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ عالمے اور مادو کی جمع کی ہوئی بھیک مزے لے لے کر اڑاتے مگر خود بھیک نہیں مانگتے تھے۔ مانگ ہی نہیں سکتے تھے۔چوہڑوں، سانسیوں اور آبادی سے ہٹ کر رہنے والوں میں ایک خاص طرح کی اکڑ ہوتی ہے۔وہ انہیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے باز رکھتی۔

وہ حرام حلال کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ کچھوے، بلیاں، گیدڑ، نیولے اور لومڑیاں سب کچھ کھا جاتے تھے۔ مرے ہوئے مویشیوں کا ماس، کتوں، کوؤں اور گدھوں سے چھین کر ہڑپ کر جاتے تھے، ماس کھانا انہیں بے حد مرغوب تھا خواہ وہ مرے ہوئے مویشیوں کا ہو یا مارے ہوئے مویشیوں کا۔۔ ہم آپ مردار جانور یا مویشی کا ماس نہیں کھاتے۔ کھانے کے لئے اسے خود مار لیتے ہیں۔ ہم زندہ مویشیوں کی بوٹیاں نہیں اتارتے، زندہ انسانوں کی بوٹیاں اتار لیتے ہیں۔ لیکن وہ الگ مسئلہ ہے۔

شیرو بڑا بھلا مانس اور قناعت پسند آدمی تھا۔ اس نے آج تک ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ وہ کبھی شہر نہیں گیا تھا۔ وہ شکار اور مردار پر گزارہ کر لیتا تھا یا پھر عالمے اور مادو کی لائی ہوئی بھیک سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ اکثر دارو پی کر اور چلم پر کیکر کی چھال کے انگارے رکھ کر وہ،دیوار سے ٹیک لگائے، گدھوں کی پرواز کا جائزہ لیتا رہتا۔مگر ناتو نے گاؤں والوں کا جینا دو بھر کر دیا تھا ہوش سنبھالتے ہی وہ کھیتوں، کھلیانوں میں ہر جگہ ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔ وہ ڈربوں سے مرغیاں ہی نہیں، باڑوں سے بھیڑ بکریاں بھی اٹھا کر لے جاتا اور ان کو مار کر کھا جاتا تھا۔ وہ کھیت میں گھس جاتا تو کسی جنگلی بھینسے یا سور کی طرح مرلہ مرلہ جگہ صاف کر دیتا۔ مولیاں، گاجریں، شلجم، خربوزے جو کچھ بھی ہوتا وہ فصل اجاڑ کر رکھ دیتا۔ گنے کا پھوگ دیکھ کر لگتا جیسے بہت سا کماد بیلنے میں پیلا ہو گیا ہو۔ یہی نہیں وہ

چراگاہوں میں چرتی بھینسوں، گایوں اور بکریوں کا دودھ پی جاتا۔ کئی بار اس کی پکڑ دھکڑ ہوئی اور اسے مارا پیٹا گیا مگر وہ کبھی باز نہ آیا۔

لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے اور اکیلا دکیلا آدمی اس سے الجھنے سے گریز کرتا تھا۔ اس سے دشمنی سہیڑنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔اس کا کیا بھروسہ کب کیا اٹھا کر لے جائے، یا سر پر دے مارے۔

عالمے اپنی جوان بیٹی کے ہمراہ جب صبح کو گھر گھر مانگنے جاتی تو اسے بھیک کی بجائے گالیاں اور شکایتیں ملتیں۔ وہ بیبیوں کو دعائیں دیتی، ان کی ہاں میں ہاں ملاتی اور اوپر ے دل سے ناتو کو بد دعائیں دیتی جاتی۔

ایک بار میں گاؤں گیا تو پتہ چلا، ناتو شہر چلا گیا ہے۔ وہ شیرو کو اکثر دھمکیاں دیا کرتا تھا کہ میرا بیاہ کر دو ورنہ میں کسی عورت کو خود اٹھا لاؤں گا یا پھر شہر چلا جاؤں گا۔ جہاں کوکے کولے پیوں گا، پھل فروٹ کھاؤں گا اور جہاں مجھے کوئی نہ کوئی عورت بھی مل جائے گی۔

ناتو کے چلے جانے سے گاؤں والے خوش تھے مگر وہ جاتے جاتے جن بھوتوں کی طرح ہاتھ دکھا کر گیا تھا۔ پتہ نہیں یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ابھی وہ شہر نہ جاتا۔

پنچایت کے سامنے شیرو اور عالمے کے بیانات سے پتہ چلا تھا کہ اس روز بڑی سردی تھی۔ ٹھنڈی برفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔

اس روز شیرو نے دارو کے نئے مٹکے کا ڈھکنا پہلی مرتبہ کھولا تھا اور دارو کی بو تالاب کے دوسرے کنارے تک پھیل گئی تھی۔ شیرو نمبردار کی مری ہوئی بھینس کا پانچ سات سیر گوشت کاٹ لایا تھا اور اسے انگاروں پر بھون رہا تھا۔

ناتو سارے گاؤں میں باؤلے کتے کی طرح ماس ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ بھیڑ، بکریوں اور دوسرے جانوروں کا تازہ گوشت کھا کھا کر اب ناتو کو مردار اچھا نہیں لگتا تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں بچھڑے کے تازہ اور کچے گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ رحمو موچی کے گھر سے لوگ سیر دو سیر گوشت خرید کر نکلتے تو ناتو کا جی چاہتا وہ جھپٹ لے اور بھاگ جائے۔ اس نے رحمو موچی کے گھر میں بد نیتی سے جھانک کر دیکھا تھا وہاں بہت سے آدمی اور گوشت کاٹنے کے اوزار تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا حملہ کرے نہ کرے،پھر وہاں سے پلٹ آیا۔

وہ عالمےؔ کے سانپ ڈسوانے کے دن تھے مگر پتہ نہیں دنیا بھر کے سانپ کن بلوں میں جا چھپے تھے۔ اس کا جسم پھوڑے کی طرح پک رہا تھا اور اسے یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی اس کے جسم سے زہر کے پرنالے بہنے لگیں گے۔

اگر اس کے ڈسوانے کے دن نہ ہوتے تو عالمے ناتو پر مادو کا راز کبھی نہ کھلنے دیتی۔ مگر اب وہ مادوؔ کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔۔ پتہ نہیں وہ

اس کے ساتھ کیا سلوک کرے، اسے کہاں بیچ دے اور اس کے بدلے میں اپنا بیاہ رچا لے۔۔ عالمے نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر ایک ہی دھکا کھا کر اٹھنے کے قابل نہ رہی تھی۔

ناتو کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر شیرو سے نہ رہا گیا وہ تلخی سے ہنس کر بولا :

''اسے چھوڑ دے ناتو۔۔ یہ عورت نہیں ہے۔''

''عورت نہیں ہے؟'' ناتو کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔

''ہاں پتر۔۔ یہ رب کی قدرت ہے۔۔ یہ عورت ہے نہ مرد،یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

پھر اس نے آگ پر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بھونتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

''جب رب اسے بنانے لگا، مٹی کم پڑ گئی۔۔ رب کو اور بہت سے کام ہوتے ہیں،اس نے اور بہت کچھ بنانا ہوتا ہے۔'' ناتو نے غصے سے رب کی طرف دیکھا مگر رب نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے شیرو کی طرف دیکھا۔ وہ ادھ بھنا گوشت ہڑپ کئے جا رہا تھا۔

اس نے غصے سے کہا۔ ''میں سب کو دیکھ لوں گا۔''

اس نے ٹوٹے ہوئے دروازے کو زور سے ٹھوکر مار کر گرا دیا اور باہر نکل گیا۔

اگلے روز چودھریوں نے ڈنگر ڈاکٹر کو بلوایا اور کہیں شام کو جا کر پتہ چلا کہ زندہ گائے کی داہنی ران کو چیر کر سیر دو سیر گوشت نکالا گیا اور کھال میں بھس بھر کر اسے تندی سے سی دیا گیا ہے۔ لوگ ناتو کی تلاش میں نکلے مگر وہ کوکے کولے پینے اور پھل فروٹ کھانے شہر چلا گیا تھا۔

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ شہر میں کچھ عرصے سے چوری کی انوکھی وارداتیں ہو رہی ہیں چوروں کی ایک ٹولی بنگلوں میں گھس کر کھانے پینے کی ہر چیز چٹ کر جاتی ہے۔

پولیس کا خیال ہے کہ اس ٹولی میں کم از کم چھ سات آدمی ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ایک ہی آدمی ہے جو کئی صدیوں سے بھوکا ہے۔

***

میں وہ اور وہ

میں اور وہ آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔

جب وہ تھک جاتا ہے میں آگے نکل جاتا ہوں جب میں تھک جاتا ہوں وہ آگے نکل جاتا ہے۔ یہ دوڑ کئی برسوں پر پھیلی ہوئی ہے اور پتہ نہیں کب تک جاری رہے گی۔ شائد اس وقت تک جب تک ہم ایک ہی ہڈی کو دانتوں سے پکڑے اپنی اپنی طرف کھینچتے رہیں گے۔ پتہ نہیں کون--- کب چھوڑ دے۔ اور دوسرا ہڈی سمیت اندھے کنوئیں میں لڑھک جائے۔

ہاں--- ہم دونوں کے عقب میں ایک ایک اندھا کنواں ہے ہمارا اپنا اپنا کنواں---

یہ کنویں ہم نے ایک دوسرے سے کھدوائے ہیں۔ اور ان پر اپنے اپنے نام کی تختیاں لگا دی ہیں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کی مکاری کے چوہے دانوں میں بند ہو گئے ہیں اور وقت ایک بھوکی بلی کی طرح ہمارے چاروں طرف میاؤں میاؤں کر رہا ہے۔

اور وہ---‘‘

وہ اوپر کی منزل میں رہتی ہے۔

میں جب سے پیدا ہوا ہوں اس کے قدموں کی چاپ سن رہا ہوں۔ اور اس وقت سے جب میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں دل میں اس کی محبت کا خراس چل رہا ہے--- مگر اب--- اس کے ریشمی بدن پر خراشوں کے نشان ہیں میں یہ خراشیں اپنے ہاتھ کی ریکھاؤں کے حوالے سے دیکھتا اور پریشان ہوتا ہوں۔ یہ خراشیں اسے اس لئے آئی ہیں کہ وہ اسے کبھی لباس میں نہیں دیکھتا خواہ وہ کتنے ہی گاڑھے رنگوں کے کپڑے کیوں نہ پہنتی ہو۔

میں اور وہ!

میں سمجھتا ہوں میں جس چٹان پر چڑھ کر ابھرتے سورج کو رہ روز دیکھنا چاہتا ہوں وہ اس کے دوسری طرف سالہا سال سے بلاسٹنگ کر رہا ہے۔ اس بلاسٹنگ سے جگہ جگہ دراڑیں آ گئی ہیں اور ہر طرف سنگریزے بکھر گئے ہیں۔

اور وہ---!

جب وہ میرے مقابلے پر نہیں آیا تھا۔ وہ میرے انتظار میں پہروں بالائی چھت پر جھنڈے کی طرح گڑی رہتی تھی-یہ درست ہے کہ وہ میرے کمرے میں کبھی نہیں آئی لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا خیال رات رات بھر اس کے ذہن میں لکڑیاں چیرتا رہتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ وہ بالائی منزل سے نیچے اتر کا آئے۔ میرے لئے وہ ماچس کی ایسی تیلی تھی۔ جسے میں نے کبھی رگڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

پھر وہ آیا۔ اور ہم ایک دوسرے کے بستر اور کپڑوں پر نفرت کی جوئیں پھینکنے لگے۔ اور رات رات بھر حسد کے کھٹمل ہمارے جسموں پر جگہ جگہ کاٹنے لگے--- نچلی منزل ہمیشہ خالی رہتی تھی وہ ہمیشہ کے لئے وہاں آ گیا اور تب سے ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے دو بھٹوں کی طرح اپنی اپنی چمنیوں سے دھواں اگل رہے ہیں۔

جس طرح ہماری چھتوں دیواروں اور جسموں کا بوجھ بنیادوں کی وساطت سے ایک ہی قطعہ زمین پر منتقل ہوتا ہے اسی طرح گھر سے باہر ہماری چائے کی میز بھی مشترکہ ہے جس کے گرد بیٹھ کر ہم ایک دوسرے کے منہ پر تھوکتے اور اپنی اپنی نظروں کی قے کرتے ہیں۔ ہمارے اندر کی غلاظتوں کی قے سے ہوٹل کی فضا میں بدبو پھیل جاتی ہے۔ تو وہ ہماری حسرتوں کے لوبان جلاتی اور ہمارے سامنے میز پر چڑھ کرنا پینے لگتی ہے۔ اس کے ناچ کے دوران ہم ایک دوسرے کی آنکھ بچا کر ایک دوسرے کی پیالی میں زہر ملا دیتے ہیں۔ وہ ناچتے ناچتے تھک کر گھنگرو کھولنے بیٹھ جاتی ہے پھر باری باری پیالیاں اٹھا کر پینا چاہتی ہے ہم اس سے ایک دوسرے کی پیالی چھین لیتے ہیں۔

اسی لمحے ہوٹل سے باہر شور سنائی دیتا ہے۔ ہم تینوں کے سوا سب لوگ باہر چلے جاتے ہیں وہ اداس ہو جاتی ہے اور کہتی ہے۔

آج پھر جلوس نکلا ہے۔ شہر کی عورتیں گھروں کے دروازوں پر کھڑی چھاتیاں پیٹ رہی ہیں۔ اور ہر چور اہے میں سروں کا ایک ایک مینار آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔

وہ رو دیتی ہے

اس کے آنسوؤں کے تیزاب میں ہماری متحیر نظروں کے لٹمس نیلے پیلے ہونے لگتے ہیں۔ وہ میز پر اپنی جگہ ایک طویل سسکی چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ ہم اس کی ایک سسکی کو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کر کے چپ کا کفن اوڑھ لیتے ہیں۔

جلوس گزر جاتا اور شور دور چلا جاتا ہے لوگ واپس آ جاتے ہیں مگر وہ نہیں لوٹتی۔

مجھے سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے تنہائی کا احساس میرے بدن کو آکاس بیل کی طرح جکڑ لیتا ہے مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ زندگی کی بے معنویت میرے سامنے اپنے سارے کپڑے اتار دیتی ہے۔ مجھے اچانک یوں لگتا ہے جیسے میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور زندگی کے قلم سے سیاہی ختم ہو گئی ہے اور اسے جھٹک جھٹک کر گھسیٹ رہا ہوں۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی آنکھیں کوٹھے کی کھڑکیوں کی طرح چوپٹ کھلی ہوتی ہیں۔ وہ چپ کا کفن پھاڑ کر اچانک قہقہہ لگاتا ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بجلی سے چلنے والے آرے نے مجھے دولخت کر دیا ہو۔ میرے جسم کے دونوں ڈکرے بوند بوند لہو ٹپکانے لگتے ہیں وہ اس کے جسم کی خراشوں پر لگانے کے لئے میرے جسم کا برادا جمع کرتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے وہ مجھے برادے کے ڈھیر میں بدل دینا چاہتا ہے اور میں اس کے ریشمی بدن کی خراشوں کے لئے ہر روز آرے سے گزرتا ہوں چائے آتی ہے۔

ہم جلدی جلدی چائے پی لیتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں پھر جب ہماری باتوں کی کالک سے ہوٹل کی چھت اور دیواریں سیاہ ہو جاتی ہیں اور ہماری میز اور ہوٹل کے بیرے کے درمیان اندھیرا حائل ہو جاتا ہے تو ہم اپنی اپنی زبانوں سے اپنے اپنے چہروں سے تھوک چاٹتے ہیں۔ تھوک چاٹتے چاٹتے ہم ایک دوسرے کی نظریں بچا کر اندھیرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں ہم میں سے وہ۔۔۔۔۔ جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ چائے کابل ادا کرنے سے پہلے دوسرے کی قریب ترین خاتون کی بے حرمتی کرتا ہے اگر کبھی ہم میں سے کوئی دوسرے کے لئے چائے منگا بھی لے تو اس کا ہر گھونٹ دوسرے کے حلق میں گوشت کے اس ٹکڑے کی طرح اٹک جاتا ہے۔ جو مچھلی پکڑنے کے کانٹے پر لگایا جاتا ہے۔

وہ نچلی منزل میں جاگتا رہتا ہے وہ عین میرے اوپر والے کمرے میں سوتی ہے۔ میں اسے اندر باہر آتے جاتے محسوس کرتا رہتا ہوں۔ بہت سی آہٹوں میں سے میں اس کے قدموں کی چاپ الگ کر سکتا ہوں۔جب وہ کام کاج سے فارغ ہو کر اوپر والے کمرے میں لیٹ جاتی ہے تو میرے ذہن میں چلتے ہوئے گراموفون کی سوئی اچانک اٹک جاتی ہے۔ گڑھی کی ٹک ٹک کا شور چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ وہ سیمنٹ کنکریٹ کی چھت کاٹ کر ایک ٹانگ سیلنگ فین پر سے لٹکا کر بیٹھ جاتی ہے اور مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں میرے بدن کو شیشے کی دھار کی طرح لہو لہان کرتی رہتی ہیں۔میں با نہیں پسارے رات رات بھر جاگتا رہتا ہوں مگر وہ نیچے نہیں آتی۔۔۔۔ میرے جذبات کے پیاسے اور بے مہار اونٹ اس رویے کی سرد اور خشک ریت پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتے ہیں مگر میرے سینے کی دیواروں سے پاگل ہاتھی دیر تک ٹکریں مارتے رہتے ہیں۔ پھر قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ یہ آہٹ قریب آتی جاتی ہے اور جنگ کے دنوں کے سائرن کی طرح ناگوار گزرتی ہے۔ پھر قدموں کی آہٹ کے بمبار ہوائی جہاز تابڑ توڑ بم گراتے ہیں۔

سارا مکان ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ میرے جسم کی بوٹیاں ہوا میں اڑنے لگتی ہیں۔

صبح جب وہ مجھے سیڑھیوں میں ملتا ہے۔ تو مچھر کی طرح میرے کان میں بھنبھنا کر کہتا ہے۔

''رات بجلی چلی گئی تھی موم بتی نہ جلا سکا ایک ہی تیلی باقی تھی جسے میں نے منہ میں ڈال ڈال کر خراب کر دیا تھا اور اس خوف سے رگڑ کر نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کہیں اس کا مسالہ نہ اتر جائے''

میں اس کے منہ پر تھوکتا ہوں وہ میرے منہ پر پر تھوکتا ہے ہم اپنی اپنی تفرقوں کی قے کرتے ہیں۔

وہ بالکونی میں کھڑی بال نچوڑتے ہوئے میٹھی نظروں سے مجھے دیکھتی ہے۔ میں ہوا کے ایک ہی جھونکے سے فاسفورس کی طرح جل اٹھتا ہوں۔

شام کو پھر ایک جیسے چہروں اور ناموں والے لوگوں کا جلوس گزرتا ہے۔شہر کی عورتیں اپنے اپنے گھر کے دروازوں پر کھڑی ہو کر چھاتیاں پیٹتی ہیں۔ ہر چوک پر سروں کا ایک ایک مینار آسمان سے باتیں کرتا ہے اور اندر ہوٹل کی میز کے گرد بیٹھ کر ہم ایک دوسرے کے منہ پر تھوکتے اور ایک دوسرے کی پیالی میں زہر ملاتے ہیں۔

***

نئی دستک

ابا کی اور میری گہری دوستی تھی۔ اس دوستی کی وجہ سے مجھ میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ میں چاہتا تھا کہ جمی سے بھی میری ایسی ہی دوستی ہو جیسی میری اور ابا کی تھی۔ میں اور ابا ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں جمی کی عمر کا تھا تو یہی جی چاہتا تھا کہ ہر بات کی تہہ میں جاؤں اور ہر معاملہ میں اپنا شک دور کروں۔ ابا میرے بے تکے سوالوں سے کبھی پریشان نہ ہوتے تھے۔ اور نہ کبھی جھنجھلاتے تھے بلکہ مجھے اکثر مطمئن کر دیا کرتے تھے۔ لیکن میں جمی کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ اسے بھی کرید کی عادت ہے اور وہ بھی اپنا علم بڑھانا اور شک دور کرنا چاہتا ہے۔ میں اکثر کوشش کرتا ہوں کہ اسے مطمئن کروں لیکن عموماً مجھے اس کا دوست نہیں بلکہ باپ بن کر جواب دینا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اس کی شخصیت کی نشوونما کے لئے نقصان دہ ہے لیکن اس کے سوا مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مثلاً پچھلے برس کی بات ہے اوپر کے کام کے لئے ہم نے سجاول نامی ایک لڑکے کو ملازم رکھ لیا۔ جمی کو ایک نیا موضوع ہاتھ آ گیا۔

’’ابو! سجاول اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہیں رہتا؟‘‘

’’بیٹے وہ ہمارے یہاں ملازم ہے اسے تنخواہ ملتی ہے‘‘

’’تنخواہ؟۔۔۔ آپ کو بھی تنخواہ ملتی ہے ابو‘‘

’’ہاں بیٹے ملتی ہے‘‘

’’آپ بھی دفتر میں اوپر کا کام کرتے ہیں ؟‘‘

’’میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اوپر کا کام بھی کرنا پڑتا ہے‘‘

’’ابو سجاول کیوں نہیں پڑھتا۔۔۔ آپ اسے میرے ساتھ سکول کیوں نہیں بھتیجے؟‘‘

’’بیٹے۔۔۔ اس کے ماں باپ غریب ہیں وہ اسے پڑھا نہیں سکتے‘‘

’’سجاول کے ماں باپ غریب کیوں ہیں ابو؟‘‘

’’اس لئے بیٹے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں ‘‘

''سجاول بھی غریب ہے--- ہے نا ابو''

''ہاں ''

''ہم امیر ہیں ابو؟''

''نہیں بیٹے ہم امیر ہیں نہ غریب''

''تو پھر کیا ہیں ابو؟''

''ہم امیر بننے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ درمیان میں ہیں۔''

''تو پھر سجاول کو بھی سکول بھیجا کریں نا ابو--- وہ بھی امیر ہو جائے گا''

''نہیں بیٹے اس کا کام برتن دھونا اور گھر کی صفائی کرنا ہے''

''میں بھی سکول نہیں جاؤں گا۔ سجاول کے ساتھ کام کروں گا''

''بری بات ہے بیٹے--- اچھے بچے سکول جاتے ہیں ''

''سجاول اچھا بچہ نہیں ہے ابو؟''

''اوہو--- تم خاموش نہیں ہو گے؟''

''اب--- بو؟''

آواز جمی کے حلق میں کٹ کر رہ جاتی اور مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے اس کی بات کا تسلی بخش جواب نہ دے کر اس دوستی اور اعتماد کے جذبے کو ٹھیس پہنچائی ہے جو میں جمی سے قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ جمی کی روز روز کی تکرار سے پریشان ہو کر ہم نے سجاول کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا اور جمی سے کہہ دیا کہ اب وہ اپنے ماں باپ کے ہاں مزے سے رہتا اور سکول جاتا ہے مگر کچھ ہی عرصے بعد جب ہمارے پڑوسی شیخ صاحب نے نئی کار خریدی تو جمی کو دوسرا موضوع مل گیا۔

''ابو آپ سکوٹر بیچ کر کار خریدیں ''

''کار مہنگی ہوتی ہے بیٹے--- زیادہ پیسے خرچ ہوتے ہیں ''

''کتنے زیادہ؟''

''بہت زیادہ''

''تو آپ چھوٹی والی لے لیجئے ابو''

''اس کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں ''

''امی کے پاس ہیں ان سے لے لیجئے''

''وہ تو گھر کے خرچ کے لئے ہوں ''

''میرے گلے میں بھی ہیں ''

''اتنے پیسوں میں کار نہیں آتی''

''آپ بنک سے لے لیجئے''

''بنک سے صرف اس کے پیسے ملتے ہیں جس نے وہاں جمع کرائے ہوں ''

''آپ جمع کرا دیجئے نا''

''میری تنخواہ تھوڑی ہے مشکل سے گزارہ ہوتا ہے''

''پپو کے ابا سے بھی تھوڑی؟''

''ہاں وہ میرے افسر ہیں۔ ان کی تنخواہ مجھ سے زیادہ ہے''

''پپو کے ابا آپ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں ؟''

''نہیں بیٹے--- جب میں کالج میں پڑھاتا تھا تو وہ میرے شاگرد تھے مگر اب ان کی ترقی ہو گئی ہے اور میں ان کے ماتحت کام کرتا ہوں ''

''آپ کی ترقی کیوں نہیں ہوئی ابو''

''ترقی کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے''

''آپ کرتے کیوں نہیں ابو؟''

''بیٹے تم نہیں سمجھو گے بس اب چپ ہو جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو''

میں جانتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ خود جمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کا چہرہ مرجھا جاتا ہے اور وہ آنکھیں جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔مجھے اس کے ذہن پر پھیلا ہوا اندھیرا محسوس ہوتا رہتا ہے۔ اس اندھیرے میں اعتماد، یقین اور سچائی کا دیا روشن کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اندر ی اندر سلگنے لگا ہے۔ اندر ہی اندر مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ میں اس سے دور نہیں ہونا چاہتا۔ میں اسے اعتماد میں لینا چاہتا ہوں اور اس سے دوستی چاہتا ہوں جیسی میری ابا سے تھی۔ بے لاگ، پر اعتماد اور سچی!--- ابا مجھے شک میں مبتلا نہیں ہونے دیتے تھے۔ہر بات صاف صاف مجھ سے کہہ دیتے تھے خواہ اس کے لئے انہیں اپنی لغزشوں اور جوان کی بے اعتدالیوں کا اعتراف ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ اپنی نا کامی سے مجھے خوف آنے لگتا ہے کہیں جمی مجھ سے نفرت نہ کرنے لگے۔ اس کی شخصیت

ادھوری نہ رہ جائے۔ وہ خود اعتمادی سے محروم نہ ہو جائے۔ میں پھر نئے سرے سے عزم کرتا ہوں اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہ پوچھتا ہے۔

''ابو آج پھر اخبار میں بچوں کے اغوا کی خبر چھپی ہے''

''ہاں چھپی ہے''

''تصویر بھی ہے'' ابو۔۔ اس گڑھے کی جہاں بچوں کو قتل کر کے پھینکا جاتا ہے،

''ہاں میں نے دیکھی ہے''

''ابو وہ بچوں کا کیا کرتے ہیں ؟''

''انہیں قتل کر دیتے ہیں ''

''کیوں کرتے ہیں ؟''

''دیکھو نا جمی کسی بچی نے سونے کی بالیاں پہنی ہوں تو بالیاں اتار کر بچی کو اس لئے قتل کر دیتے ہیں کہ پکڑے جائیں تو بچی شناخت نہ کر سکے''

'' اور لڑکے۔۔ وہ تو بالیاں نہیں پہنتے ابو؟''

''بیٹے یہ برے لوگ ہیں بس قتل کر دیتے ہیں ''

''مگر کیوں ابو۔۔ کس لئے؟''

میں لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو جاتا ہوں۔ پھر دل کڑا کر کے سچ بولنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔

''جمی بیٹے۔۔۔ وہ برے لوگ بچوں سے بد فعلی۔۔۔''

الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ جمی پوچھتا ہے۔

''ابو بد فعلی کیا ہوتی ہے؟''

''بری بات ہوتی ہے بیٹے۔ بہت بری بات۔ بس اب تم چپ ہو جاؤ''

جمی چپ ہو جاتا ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ چیخ چیخ کر مجھ سے اپنے سوال کا جواب پوچھ رہا ہے۔ میں اس کی کس کس بات کا جواب دوں اور کہاں تک دوں ! چند ماہ پہلے کی بات ہے میں اپنے ایک رشتہ دار عبدل سے جی میں ملاقات کے لئے گیا۔ عبدل پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا اور وہ حال ہی میں ہمارے شہر کی جل میں منتقل ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ دن عبدل کی ملاقات کا نہیں تھا۔ میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو چٹ بھیجی کہ میں دفتر سے شارٹ لیو لے کر آیا ہوں مہربانی کی اور عبدل کو ملاقات

کے کٹہرے مین بھجوا دیا۔ عبدل اس خلاف توقع ملاقات اسے بہت خوش ہوا۔ میں بسکٹ اور سگریٹ کے چند پیکٹ ساتھ لے گیا تھا۔ عبدل یہ چیزیں پا کر اور بھی خوش ہوا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کو بری کروانے کی کوشش کروں۔مجھے معلوم تھا کہ وہ قاتل ہے اور اس کو سزا ملے گی۔ پھر بھی میں نے اس کی تسلی کے لئے رسماً کہہ دیا۔

''تم فکر نہ کرو عبدل۔ خدا بہتر کرے گا''

اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے بعد کی پیشی میں عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور عبدل شک کی رعایت سے بری ہو گیا۔ اس اچانک رہائی کی وجہ خود عبدل کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور اس کے خاندان والوں نے اندازہ لگایا کہ میں نے عبدل سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے اور سب کچھ میری سفارش سے ہوا ہے۔

مجھے گھر بیٹھے بٹھائے پیغمبری مل گئی۔ برادری میں میرے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ اظہار تشکر کے لئے رشتہ داروں کا تانتا بندھ گیا۔ تحفے آئے۔ تعریفی خطوط آئے اور پتہ نہیں کیا کیا۔ یہاں تک کہ خود مجھے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ میں نے ہی کیا ہو گا۔ پتہ نہیں جمی کے کام میں اس واقعہ کی بھنک کیسے پڑ گئی۔

ایک رات وہ ٹیلی ویژن پروگرام دیکھ کر میرے کمرے میں آیا اور میرے ساتھ لیٹ کر بولا۔

''ابو۔۔۔ چچا عبدل کو آپ نے رہا کرایا؟''

''نہیں۔۔۔ ہاں بیٹے!''

''ورنہ ان کو پھانسی ہو جاتی؟''

''یقیناً ''

آپ نے بہت اچھا کیا ان کو پھانسی سے بچا لیا۔ ابو آپ کتنے اچھے ہیں۔ ''میرے دل پر چوٹ لگی۔ میں نے سوچا کاش میں ایسا ہوتا۔ پھر بھی میں خوش تھا کہ جمی کے دل میں میرے لئے اچھے جذبات تھے۔

جمی کو نیند آئی ہوئی تھی وہ جلد ہی سو گیا۔ ورنہ مجھے ڈر تھا کہ وہ کرید کرید کر مجھے پریشان کرے گا۔

لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ کچھ ہی دنوں بعد عبدل کی شادی طے پائی تو عبدل اور اس کے گھر والوں نے ہمیں خاص طور پر بلایا۔میری بیوی گاؤں کی شادیوں سے کتراتی ہے لیکن عبدل کی شادی پر جانے کے لئے وہ بھی زور شور سے تیاریاں کرنے لگی۔ کیونکہ ہم دونوں جانتے تھے کہ عبدل کے ہاں ہماری غیر معمولی آؤ بھگت ہو گی بلکہ ہمیں یوں لگتا تھا جیسے یہ عبدل کی شادی نہیں ہماری تاجپوشی کا

جشن ہے۔ جس روز ہم عبدل کے گاؤں پہنچے، اگلے روز برات کو ساتھ والے گاؤں میں جانا تھا۔ صبح جب میں کپڑے تبدیل کر چکا تو جمی میرے پاس آیا ور سہمی ہوئی آواز میں بڑے روز دارانہ لہجے میں بولا۔

''ابو یہ چچا عبدل ہیں جن کی شادی ہے انہوں نے اکبرے کو قتل کیا تھا''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے پوچھا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''سب بچوں کو پتہ ہے اپ کو نہیں پتہ؟''

''نہیں '' میں نے مشکل سے جواب دیا۔ جمی چپکے سے بولا

''چچا عبدل نے اکبرے کے پیٹ میں بلم بھونک دیا تھا۔ ابو بلم کیا ہوتا ہے؟''

''لاٹھی کے سرے پر چھری سی لگی ہوتی ہے''

''سب کے سامنے مارا تھا؟ جمی نا کہا'' پھر پولیس پکڑ کر لے گئی۔

میں پریشان ہو گیا۔ میں اسے ڈانٹنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ ہوئی وہ بولا۔

''ابو آپ کو پتہ نہیں تھا۔ اس لئے اپ نے انہیں جیل سے رہا کرایا ہے نا!''

''ہاں بیٹے مجھے پتہ نہیں تھا''

''پولیس کو بھی پتہ نہیں تھا''

جمی میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔میں اس کی زبان سمجھ رہا تھا۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دے چنانچہ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''تم ہر بات میں اپنی ٹانگ نہ اڑایا کرو جمی۔۔۔ جاؤ باہر جا کر کھیلو''

جمی اداس نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں ہمیشہ کے لئے اس کی دوستی اور اعتماد سے محروم ہو گیا ہوں۔

***

ننگا پیڑ

وہ اپنے زمانے کے مانے ہوئے حکیم تھے ان کا دور دور تک شہرہ تھا اور ان کے مطب کے سامنے ہر وقت مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ انہوں نے نہ صرف دیسی طب کی بہت سی کتابیں پڑھی تھیں بلکہ ان کی نظر طبی میدان میں ہونے والے نئے عالمی تجربات اور تحقیق پر بھی خاصی تھی کیونکہ وہ شہر سے جدید طبی سائنس پڑھ کر لوٹے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اطبا کو علاج کے لئے زیادہ سے زیادہ ملکی وسائل اور مقامی جڑی بوٹیوں پر انحصار کرنا چاہئے کیونکہ وہ لوگوں کے مزاج کے زیادہ قریب ہوتی ہیں اور نسبتاً کم ناخوشگوار اثرات چھوڑتیں ہیں ان کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں بڑی قیمتی جڑی بوٹیاں ہیں جن کو تلاش کرنا اور ان پر تحقیق کرنا نہایت ضروری ہے۔ حکیم صاحب کا ایک اصول یہ تھا کہ وہ جب تک کسی دوا یا جڑی بوٹی کو خود آزما نہ لیتے تھے اس کے افعال و خواص کا خود مطالعہ اور تجربہ نہیں کر لیتے تھے مریضوں کو استعمال نہیں کراتے تھے چنانچہ ان کے اہل خانہ ان کی اس عادت سے اکثر پریشانی میں مبتلا رہتے کیونکہ وہ زہریلی اور تند و تیز مزاج کی جڑی بوٹیاں چکھ کر یا کھا کر خود بیمار پڑ جاتے تھے اور اس وقت تک دوسری کوئی دو استعمال کر کے اچھا ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ جب تک متعلقہ جڑی بوٹی یا دوا کے تمام خواص، مزاج و افعال، کیفیات اور علامات اپنے بیٹوں کو قلمبند نہیں کرا لیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کسی درخت کے تلخ اور سخت قسم کے تخم کھا لئے تو ان کے بدن میں اینٹھن اور تشنج پیدا ہو گیا۔ اعضا شکنی ہونے لگی۔کمر اور ہاتھ پاؤں میں درد ہونے لگا۔ چہرہ نیلگوں پڑ گیا آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔ جبڑے کے عضلات میں بھی تشنج ہونے لگا اور سارے گھر اور گاؤں بھر میں خوف و دہشت طاری ہو گئی۔ دونوں بیٹوں نے علامات اور کیفیات قلمبند کر لی تھیں چنانچہ حکیم صاحب کی طرف سے پہلے سے دی گئی ہدایات کے مطابق انہیں قے کرائی گئی اور تریاق دوائیں استعمال کرانی گئیں جب جا کر ان کی حالت سنبھلی۔

بعد میں حکیم صاحب ان تلخ اور سمی تخموں کو مدبر کر کے نہایت اعتماد سے اپنے مریضوں کو استعمال کراتے رہی اور کامیابی سے امراض عصبانیہ و بلغمیہ اور ضعف اعصاب و اعضائے رئیسہ کا علاج کرتے رہے۔

حکیم صاحب نے سینکڑوں نباتی، حیوانی اور جمادی ادویہ مفردہ کی ماہئیت،مزاج، افعال اور خواص اپنے ذاتی تجربوں اور تحقیق سے معلوم کئی اور انہیں اپنی بیاض میں قلمبند کر لیا تاکہ اپنے بیٹوں اور آنے والی نسلوں کے کام آئیں اور عام لوگوں کو ان کے نسخوں سے شفاء کا ملہ نصیب ہوتی رہے۔حکیم صاحب اپنے دونوں

بیٹوں کو سارا علم اور حکمت سکھانا چاہتے تھے مگر وہ پڑیاں بنانے اور لوگوں سے دام وصول کرنے میں لگے رہتے اور پڑھنے لکھنے اور سیکھنے کی طرف کم توجہ دیتے حکیم صاحب کامعمول تھا کہ ہفتہ عشرہ بعد قریبی پہاڑوں کی طرف نکل جاتے اور دشوار گزار جنگلوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتے رہتے پھر گھر آ کر ان نئی دواؤں پر طرح طرح کے تجربات کرتے۔

ایک دفعہ حکیم صاحب پہاڑوں اور جنگلوں سے جڑی بوٹیاں تلاش کرنے کے بعد لوٹے تو ایک عجیب خبر لائے انہوں نے بتایا کہ ایک دشوار گزار راستے پر انہوں نے ایک ایسا قیمتی اور بابرکت پودا دیکھا ہے جو دنیا میں بہت کمیاب ہے اور جس کی انہیں برسوں سے تلاش تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ اس پودے کو بڑھنے اور درخت بننے میں ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے لیکن جب ایک بار تن اور درخت بن جائے اور اس پر پھل آنا شروع ہو جائے تو یہ نہایت قیمتی کارآمد اور برکت والا درخت ہوتا ہے۔ حکیم صاحب اگرچہ سائنس اور جدید علوم سے بہرہ ور تھے مگر روحانی قدروں پران کا پختہ یقین تھا اور ان کا کہنا تھا کہ اس درخت کی موجودگی اور اس کا سایہ خوش قسمتی کی علامت ہے اس کا پھل نہایت شیریں اور لذیذ ہوتا ہے بھوک اور پیاس کا غلبہ نہیں ہوتا اعصاب کو قوت ملتی ہے اور حاملہ عورتیں اس پھل کو کھائیں تو ان کے بطن سے صحت مند اور خوبصورت بچے جنم لیتے ہیں ح حکیم صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس کے سائے میں بیٹھنے سے جسم میں توانائی اور دل و دماغ میں فرحت و سکون پیدا ہو گا اور امراض عامہ و امراض خبیثہ کا دفعیہ ہو گا۔

حکیم صاحب سے اس بابرکت درخت کی تعریفیں سن کر تمام اہل خانہ بے تاب ہو گئے اور اسے دیکھنے اور جلد از جلد کھود کر گھر لے آنے کا اصرار کرنے لگے مگر حکیم صاحب نے بتایا کہ اس درخت کو کھود کر گھر لانے سے پہلے اس کے لئے مناسب موسم، مٹی اور جگہ کا انتخاب ضروری ہے چنانچہ انکی حویلی کے صحن کے عین وسط میں ان کی ہدایت کے مطابق ایک گڑھا کھودا گیا انہوں نے مٹی کا اچھی طرح سے معائنہ کیا ہاتھوں میں لے کر اس دیکھا اور سونگھا اور نہایت خوش ہو کر کہا۔

''ہاں وہی مٹی ہےبالکل دیسی ہی۔ خوب پھلے پھولے گا۔''

اہل خانہ یہ سن کر نہایت خوش ہوئے اور زیادہ بے تابی کا مظاہرہ کرنے لگے مگر حکیم صاحب نے انہیں موسم تبدیل ہونے تک انتظار کرنے کو کہا۔

بہار کے آغاز کے ساتھ ہی ایک دن حکیم صاحب نے روانگی کا اعلان کر دیا۔ ان کے بیٹے اور پوتے بھی ان کے ہمراہ تھے سب کے پاس کسیاں، کلہاڑیاں اور کدالیں تھیں اور ایک بہت بڑا ٹوکرا بھی جس میں گاچی سمیت درخت کو جو ابھی پودے کی صورت میں تھا کھود کر لانا تھا۔

وہ سب لوگ راستے کی صعوبتیں اٹھاتے، خار دار جھاڑیاں اور نوکیلے پتھروں سے زخمی ہوتے بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہوتے حکیم صاحب کی رہنمائی میں

دشوار گزار جنگل عبور کرتے گئے اور آخر کار اس بابرکت پودے کو کھود کر گھر لے آئے۔

بیٹوں اور پوتوں کا کہنا تھا کہ وہ درخت واقعی بڑا بابرکت تھا کیونکہ اس کے پاس پہنچتے ہی راستے کی ساری تھکن خود بخود اتر گئی تھی۔ خار دار جھاڑیوں سے زخمی ہونے والے جسموں میں درد کی ٹیسیں رک گئی تھیں اور کسی انجانی قوت کے زیر اثر دلوں میں ولولہ اور خود اعتمادی کے جذبات موجزن ہو گئے تھے۔

جونہی وہ لوگ واپس آئے اہل خانہ خوش سے کھل اٹھے اس رات حویلی میں گھی کے چراغ جلائے گئے--- اور گاؤں بھر کے بچوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ حکیم صاحب نے اسی وقت دوبارہ گڑھا کھودا بھر بھری مٹی میں اپنے ہاتھوں سے پودے کیگاچی لگائی اور اسے پانی دیا۔ پھر سرکنڈوں کی باڑھ چاروں طرف لگا دی تاکہ مویشیوں اور اندھیرے میں چلنے والوں سے تازہ تازہ لگا ہوا پودا محفوظ رہے۔ حکیم صاحب نے پودا لگا کر ہاتھ منہ دھوتے ہوئے کہا۔

’’اگرچہ زمین نہایت زرخیز اور آب و ہوا مناسب اور اچھی ہے لیکن جب تک پودا اپنی جڑیں اچھی طرح سے نہیں پکڑ لیتا اور نئی شاخیں نہیں نکال لیتا نہایت احتیاط اور خبر گیری کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ یوں تواس درخت کے پتے، چھال،لکڑی اور پھول سب ہی کچھ نہایت کارآمد ہے اور ان سے بعض امراض میں عارضی اور وقت سکون حاصل ہو سکتا ہے مگر اس سے متوقع مستقل طبی اور روحانی فوائد اسی وقت حاصل کئے جا سکتے ہیں جب یہ پھیل کر تن اور درخت بن جائے اور اس پر پھل آنے لگے۔

حکیم صاحب جب تک زندہ رہے خود صبح سویرے اٹھ کرپانی دیتے، سہ پہر کو مطب سے نکل کر گوڈی کرتے۔کیاری میں کھاد ڈالتے، سرکنڈوں کی باڑھ ٹھیک کرتے اور ایک ایک پتے اور ٹہنی کا خیال اور حساب رکھتے مگر ابھی بمشکل پودے نے جڑیں پکڑی تھیں اور ایک آدھ نئی کونپل پھوٹی تھی کہ ایک روز کسی جڑی بوٹی کی اپنے اوپر آزمائش کرتے ہوئے حکیم صاحب کی حالت بگڑ گئی انہیں بروقت تریاقی دوا نہ دی جا سکی اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

حکیم صاحب کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک دونوں بھائی مل جل کر رہتے رہے اور ایک ساتھ پودے کی دیکھ بھال اور مطب کرتے رہے مگر پھر ان میں مطب کی آمدنی کی تقسیم پر اکثر جھگڑا ہونے لگا۔جس کے نتیجے میں دونوں نے الگ الگ مطلب قائم کر لئے۔ وہ دونوں روپیہ کمانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے لیکن دونوں نیم حکیم تھے تاہم جلد ہی بڑے بھائی کو یاد آیا کہ عارضی سکون کے لئے بعض امراض میں اس درخت کی پتیاں استعمال کی جا سکتی ہیں چنانچہ اس نے پتوں سے اپنے مریضوں کا علاج شروع کر دیا۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ سرعت اور تیز رفتاری کا آغاز تھا لوگ وقتی سکون سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے تھے۔ بڑے بھائی نے خوب دولت کمائی اور اس کا شہرہ دور دور تک ہو گیا۔

چھوٹے بھائی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے وہ دن رات پریشان رہتا لوگ کہتے تھے کہ اس کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ وہ کامیابی کے لئے دن رات ہاتھ پاؤں مارتا رہتا مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ آخر ایک روز ٹنڈ‌ٹنڈ درخت کو دیکھ کر اسے اپنے بھائی کی کامیابی کا راز معلوم ہوا اور اس نے بھی چھال اتار کر بطور دو استعمال کی اور اسے بے حد حیرت ہوئی جب اسکا مریض بھی عارضی طور پر سہی مگر صحت یاب ہو گیا۔

پتے اور چھال ختم ہو گئے تو انہوں نے اس کی ٹہنیاں کاٹ کر اور پیس کر آزمائیں اور انہیں بھی امراض شکم میں سکون بخش اور منفعت بخش پایا۔چنانچہ دونوں ایک دوسرے سے چوری اس کی ٹہنیاں اور لکڑی کاٹنے اور دواؤں میں شامل کرنے لگے۔

دوا کی پڑیوں میں ایک جیسی لکڑیاں چباتے اور برادہ پھانکتے پھانکتے مریضوں کو شک گزار تو ایک رات کچھ لوگ آئے اور باقی ماندہ پودے کو جڑوں سمیت اکھاڑ کرے گئے اور انہوں نے اسے سکھا کر اور پیس کر برابر تقسیم کر لیا۔۔۔لیکن اگلی بہار میں گھر والے یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ پر کئے ہوئے گڑھے کی جگہ پر ایک ویسا ہی درخت اگ آیا ہے شاید کوئی زندہ جڑ باقی رہ گئی تھی!!

***

نظر آ لباسِ مجاز میں

شروع شروع میں مجھے شبہ تھا کہ اس کی موت حادثاتی نہیں سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی اور اس سازش میں پرائے ہی نہیں اس کے اپنے بھی شامل تھے۔ اگرچہ وہ کوشش بسیار کے باوجود میرے بارے میں پتہ نہ چلا سکے مگر انہیں کسی طرح یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ان کی خواہش اور فیصلے کے برعکس اپنی پسند کی کورٹ میرج کرنے والی تھی مگر جب گذشتہ برس میں اس کی چھوٹی بہن رحیلہ سے، جواس کی راز دار بھی تھی، رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے میرے شک کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے یقین دلایا کہ زیبا کی دردناک موت کسی سازش کا نتیجہ نہیں ایک اتفاقی حادثہ ہی تھی جس میں اس کے علاوہ دوسرے بہت سے مسافر بھی جل کر راکھ ہو گئے تھے۔مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی کہ اس کی روتی ہوئی معصوم آنکھیں جھوٹ،تصنع اور چالاکی سے یکسر نا آشنا تھیں۔

وہ مری تھی یا مار دی گئی تھی بہرحال اب اس دنیا میں نہیں تھی لیکن میں نے اسے دل کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ پربھی زندہ رکھا ہوا تھا۔میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی یاد میں تاج محل تعمیر کروا دیتا مگر مجھ میں تو اس کی قبر پر جانے کا بھی حوصلہ تھانہ اس کی اجازت۔اسے اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا جہاں ہمہ وقت گورکن اور چوکیدار موجود رہتے اور کسی غیر کا گذر ممکن نہ تھا۔یہی وجہ تھی کہ مجھے انٹرنیٹ پر اس کا مزار تعمیر کرنا پڑا تا کہ اس پر یادوں کے چراغ روشن کئے رکھوں۔

دنیا اگر توہّم کا کارخانہ ہے تو انٹرنیٹ جھوٹ اور جعلسازیوں کی فیکٹری۔کہتے ہیں جہاں لالچ وہاں ٹھگ۔انعامات،تحائف اور لاٹریاں۔چند ڈالروں کے عوض کروڑ پتی بننے کے نسخے۔ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا۔ٹھگوں کو ٹھگنے والے ٹھگ۔ ویب کے سمندر میں ہر طرف مچھلیاں پکڑنے کی کنڈیاں،جن میں پر فریب اشتہارات کے ذریعے طمع کا چارہ لگا ہوتا۔ چٹکیوں میں ذہنی،جسمانی اور اقتصادی مسائل حل کر دینے کے دعوے، خلوص سے تہی دوستیاں اور وفا سے خالی

محبتیں۔بوڑھے نوجوان بن کر اور لڑکے لڑکیاں جنس بدل کر اور جعلی کوائف بتا کر ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے۔چیٹنگ کرنے والوں کے زیادہ تر بلکہ تقریباً سبھی نام اور نک نیم فرضی، جعلی اور عجیب و غریب ہوتے مگر میں نے ویب پر اس کی ادبی حیثیت اور شان قائم رکھی تھی۔ میں نے علی بابا اور چالیس چوروں کی کہانی والے پاس ورڈ ''کھل جا سم سم'' سے اس کا ای میل اکاؤنٹ کھولا اور اس کی نظموں کو اپ لوڈ کرنے سے پہلے ایک استاد قسم کے شاعر دوست سے ان کی اصلاح کروا لی۔ اور اگرچہ مجھے سچ بولنے یا کہنے کا کوئی دعویٰ تھانہ شوق پھر بھی میں نے ای میل اور ویب میں اس کا اصلی نام دیا۔درحقیقت یہ ان پابندیوں کے خلاف ایک رد عمل تھا جو اس کے قدامت پسند خاندان میں زندہ اور مردہ خواتین پر لگائی جاتی تھیں۔وہ زندہ ہوتی تو شائد میں کبھی اس کی ویب سائٹ بناتا نہ اس کی تصویر اس میں شامل کرتا اور اس کی نظمیں تو صرف میرے لئے ہوتیں مگر اب میں چاہتا تھا جیسے وہ میرے دل میں زندہ تھی نیٹ پربھی ایک زندہ وجود اور جیتی جاگتی شخصیت کے طور پر آباد رہے اور میں جب چاہوں اسے دیکھ اور اس کے نام ا ی میل بھیج سکوں۔اسے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا اس سے بہتر طریقہ میرے پاس نہیں تھا۔

انٹر نیٹ پر اس کی ویب سائٹ وسیع و عریض جنگل میں ایک چھوٹے سے گوشے کی طرح تھی۔ عام ڈگر سے ہٹ کر ایک گمنام سا مقام، جہاں میرے خیال میں کم ہی لوگوں کا گذر ہو سکتا تھا۔میں نے بھی کسی سے اس کا ذکر کیا تھا نہ اس کا پتہ بتایا تھا۔ رحیلہ کو بھی نہیں۔یہ اگرچہ خود کو دھوکہ دینے والی بات تھی مگر میرا کسی دوسرے کو دھوکہ دینے کا ارادہ ہر گز نہیں تھا مگر وہاں ہر کوئی دھوکہ دینے اور کھانے پر کمر بستہ نظر آتا۔پتہ نہیں لوگوں کو کیسے اس کی سائٹ اور ای میل ایڈریس کاپتہ چل جاتا تھا۔میں جب بھی اس کا میل باکس کھولتا وہ ڈاک سے اٹا پڑا ہوتا۔میں مزار پر صبح و شام جھاڑو دینے والے کسی مج اور کی طرح اس کے میل باکس سے اشتہارات اور فضول قسم کی ای میلز ڈیلیٹ کرتا۔کبھی کبھی بعض ای میلز پڑھ کر مجھے لگتا جیسے میں نے اسے بازار میں لا بٹھایا ہو میں فوراً ایسے پتے بلاک کر دیتا مگر پھر آہستہ آہستہ برداشت کرنے کی عادت پڑتی گئی اور کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ دلچسپ لگنے لگا اور میں نہ صرف بعض منتخب خطوط دلچسپی سے پڑھنے بلکہ ان کے جواب بھی دینے لگ گیا۔

کہتے ہیں اللہ اچھی اور خوبصورت چیزوں کو جلدی واپس لے لیتا ہے شاید وہ انہیں زیادہ آلودگی سے بچانا چاہتا ہے کیونکہ ہر خالق اپنی خوبصورت تخلیق سے زیادہ پیار کرتا ہے۔اسے زندگی کے میلے پر بھیجتے وقت اسے تو علم ہی تھا اس نے کچھ خریدنا خرچنا نہیں،سارا بچا کر لے آنا ہے اس نے اسے میلہ دیکھنے کی فرصت دینے میں جتنی بخیلی برتی تھی اتنی ہی فیاضی سے بنا سنوار اور جیبیں بھرکر بھیجا تھا۔کاش انسانی کلوننگ اس کے جل جانے سے پچیس تیس برس پہلے شروع ہو چکی ہوتی اور کسی شخص کے سیل سے اس کی ہو بہو کلونڈ کاپی بنانا ممکن ہو چکا ہوتا۔

کیمرے کا لینز حساس تو ہوتا ہی ہے میرا خیال ہے اس میں زندگی کی رمق اور حسِّ جمال بھی ہوتی ہو گی کیوں کہ اس کی ہر تصویر شاندار آتی تھی مگر یہ تصویر جواس نے مجھے خود گفٹ کی تھی اور اب و یب سائٹ میں شامل تھی شائد کسی نہایت ہی با ذوق کیمرے نے اتاری تھی۔تھوڑے ہی دنوں میں اس کی سائٹ وزٹ کرنے والوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔یہ سلسلہ بڑا دلچسپ اور مضحکہ خیز تھا۔ ایک مر چکی لڑکی سے دوستی کی خواہشمند اصلی یا نقلی لڑکیاں اور فلرٹ کرتے ان گنت لڑکے جو اس سے چیٹنگ اور ملاقات کرنا چاہتے بہت ہی احمق معلوم ہوتے۔چونکہ وہ شاعرہ تھی اور اس نے ایم اے اردو کیا ہوا تھا اس لئے ہر کوئی شاعرانہ مزاج کا حامل،ادب و آرٹ کا شیدائی اور تنہائی کا ستایا ہوا۔اس کی نظموں کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جاتے اور ان کے جواب میں اور اس کی تصویر پر نظمیں گھڑی جاتیں۔انٹرنیٹ اشتہارات اور بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتے

مبارک ہو تمہارا نام اول انعام کے لئے چن لیا گیا

مژدہ کہ تم یورپ یا امریکہ کا ٹکٹ جیت سکتی ہو

اگر تم شاعرہ ہو تو انعامی مقابلے کے لئے اپنا کلام اس پتے پر بھیجو

فلاں یونیورسٹی کی ڈگری یا ڈپلوما حاصل کرنے کا سنہری موقع

خوش خبری،اب تم گھر بیٹھی ہر ماہ ہزاروں ڈالر کما سکتی ہو

نوید ہو کہ تمہاری اتنے کروڑ کی لاٹری نکل سکتی ہے وغیرہ

لاہور کا ایک نوجوان جو کمپیوٹر پروگرامنگ یا شاید سافٹ ویئر میں ایم ایس سی کر رہا تھا اور جس کانک نیم ''کوئی تنہائی سی تنہائی ہے ''تھا تو اس پر بری طرح فریفتہ ہو گیا۔بار بار منع کرنے کے باوجود اس نے ڈاک سے کچھ قیمتی تحائف بھی بھجوا دئیے۔جو ظاہر ہے ڈاکئے، چوکیداریا گورکن کے کام آئے ہوں گے۔یہاں تک تو خیریت گزری مگر وہ ایک روز اسے ملنے اسلام آباد چلا آیا اور ڈھونڈتا ہوا اس کی قبر تک پہنچ گیا۔ میرا اندازہ ہے بعض اور عاشق مزاج نوجوانوں نے بھی اس کے ابدی گھر کا چکر لگایا اور سخت پریشان اور مایوس ہو کر لوٹے ہوں گے۔

یہ سلسلہ کچھ عرصہ یونہی چلتا رہا لیکن پھر اچانک ایک عجیب بات ہو گئی۔ایک روز مجھے اپنے ذاتی ای میل ایڈریس پر پیغام ملا۔بوجھو تو کون تم سے ملنا چاہتا ہے ؟مجھے کالج کے دنوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ہماری کلاس پکنک پر نتھیاگلی گئی تھی مگر وہ ساتھ نہیں آئی تھی۔ سبھی کا خیال تھا اسے گھر سے اجازت نہیں مل سکی ہو گی۔میں ایک ڈھلوان پر بور اور اداس بیٹھا تھا کہ ایک دوست کی آواز سنائی دی ''دیکھو تو کون تم سے ملنے آیا ہے''

میں نے پلٹ کر دیکھا تو پل اوور پہنے زیبا کھڑی مسکرا رہی تھی۔بعد میں پتہ چلا کہ اسے گھر سے اجازت تو مل گئی تھی مگر وہ لیٹ ہو گئی اور اس کے ماموں اسے اپنی گاڑی میں چھوڑنے آئے تھے۔اس کی آمد سے اچانک نتھیاگلی کا موسم خوبصورت ہو گیا۔ ڈھلوان پر ہری ہری گھاس اگ آئی۔پھو ل مہکنے، مترنم جھرنے بہنے، آسمان میں بادل رقص کرنے اور برف پوش چوٹیوں پر پڑی برف مسکرانے لگی۔

میں نے اردو اٹیچمنٹ کھولی اور حیران ہوا میں دوسروں کو بیوقوف بناتا تھا اس کا کسی نے مجھ سے خوب بدلا لیا تھا۔ای میل میں لکھا تھا

''نوید میں زیبا ہوں۔تمہاری اپنی زیبا۔میں زندہ ہوں ''

ظاہر ہے کہ یہ مذاق تھا۔میں کیوں اور کیا جواب دیتا لیکن اگلے روز پھر ای میل آ گئی۔

''معلوم ہوتا ہے تمہیں میرے زندہ ہونے کا یقین نہیں آیا ورنہ تم جواب ضرور دیتے۔ اور ہاں ابھی میرے بارے میں کسی سے کچھ مت کہنا۔رحیلہ سے بھی نہیں ورنہ میں مزید مصیبت میں پھنس جاؤں گی''

مجھے اس کی موت کا پہلے ہی مشکل سے یقین آیا تھا۔یہ پیغام اور اس میں رحیلہ کا حوالہ دیکھ کر میں تذبذب میں پڑ گیا۔کہیں یہ سچ ہی نہ ہو۔کئی طرح کے قصے اور امکانات ذہن میں آئے کیا پتہ اسے کسی نے اغوا کیا اور یرغمال بنایا ہوا ہو۔ان دنوں بعض لوگوں کو ملکی یا غیرملکی تفتیشی ادارے اچانک گھروں سے پکڑ کر لے جاتے تھے کہیں کوئی ایسی ایجنسی یا ادارہ؟مگر اس کا سیاست اور سیکیورٹی سے کیا واسطہ۔کیا معلوم ٹریفک حادثے میں ملنے والی مسخ شدہ نعش کسی اور لڑکی کی ہو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اور وہ زندہ اور سلامت ہو مگر پتہ نہیں وہ کس قسم کی مصیبت میں گرفتار تھی اور میں اس کی کیسے مدد کر سکتا تھا۔تاہم میں نے فی الحال اس سے اتنا ہی پوچھنا مناسب سمجھا'' اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم زیبا ہی ہو؟''

میرا خیال تھا کہ اب یا تو اس کا جواب نہیں آئے گا یا وہ گول مول سا جواب دے گی اور ٹالنے کی کوشش کرے گی مگر اگلے روز نہ صرف اس کا جواب آ گیا بلکہ اس نے اپنی تازہ نظم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بات کا حوالہ دیا تھا جو میرے اور زیبا کے سوا کسی کے علم میں نہیں تھی۔میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ تو کیا وہ سچ مچ زندہ تھی۔مگر اس کے مصیبت میں گرفتار ہونے کے خیال نے مجھے اداس کر دیا۔میں نے بے تاب ہو کر پوچھا

'' تم کہاں اور کس حال میں ہو ؟ اب تک خاموش کیوں تھیں۔ واپس اپنے گھر کیوں نہیں آئیں۔مجھے فوراً بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتاہ وں ''

وہ فوراً جواب نہیں دیتی تھی۔ شاید دے نہیں سکتی تھی۔ اس نے میرے اس خط کا بھی ایک دن کے وقفے سے جواب دیا

'' نوید میری جان، میں کچھ عرصہ کے لئے واقعی مر گئی تھی، سب کچھ بھول گئی تھی پھر ایک مہربان دوست کی وجہ سے مجھے نئی زندگی حاصل ہوئی مگر میں اپنے گھر اور لوگوں میں نہیں آسکتی۔فی الحال میں تم سے ای میل کے ذریعے بھی محدود سا رابطہ رکھ سکتی ہوں۔ اور نہیں جانتی یہ سہولت بھی کب چھن جائے۔کاش میں تمہیں مزید کچھ بتا سکتی۔اپنا خیال رکھنا۔۔۔۔تمہاری زیب ''

شک کی اب کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی میں عجیب مخمصے میں پڑ گیا وہ کس قسم کی مصیبت میں گرفتار تھی کہ ای میل تو کر سکتی تھی مگر مدد کے لئے اپنا ایڈریس نہیں بتا سکتی تھی۔میں نے اگلی ای میل میں اس سے بہت سے سوالات کر ڈالے اور آخر میں یہ بھی لکھا کہ اگر وہ والدین سے ناراض ہے تو میرا گھر بھی تو اس کا اپنا گھر ہے وہ میرے پاس کیوں نہیں آ جاتی۔ ہم فوراً شادی کر لیں گے۔وہ مجھے بلا تاخیر اپنا پتہ بتائے اور اطمینان رکھے میں اس کے لئے جان تک کی بازی لگا سکتا ہوں۔

اس ای میل کا جواب بھی حسب معمول ایک دن کے وقفے کے بعد آیا اور نہایت مختصر۔

''سنڈے،، صبح دس سے شام چار بجے،مقبرہ جہانگیر لاہور''

میں اس کے لئے کچھ بھی کرنے اور ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ اتوار کو لاہور پہنچ گیا اور اس کے بتائے ہوئے وقت اور مقام پر اس کا انتظار کرنے لگا۔ایک ایک لمحہ گزارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ہر آہٹ پر دل دھڑکنے لگتا مگر شام ہو گئی اور اس کا کہیں دور دور تک نشان نہ تھا۔میں نے ہوٹل آ کر اپنا ای میل باکس چیک کیا اس میں پیغام موجود تھا

''سوری نوید،مجھے بتائی ہوئی جگہ پر پہنچنے کی کا موقع نہیں مل سکا۔اب مجھے کراچی لے جایا جا رہا ہے۔ہو سکے تو تھرسڈے کو کلفٹن پر اکیلے ملو''

کلفٹن پر بھی میں صبح سے شام تک گھومتا،سمندر کی لہریں دیکھ دیکھ کر اداس ہوتا اور اسے تلاش کرتا رہا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔بار بار خیال آتا کہ کہیں کوئی مجھے بیوقوف تو نہیں بنا رہا تھا مگر اس کے مخاطب کرنے کا ایک خاص انداز تھا جو کسی دوسرے کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔میں اگلے اور اس سے اگلے روز بھی کلفٹن کی خاک چھانتا رہا مگر وہ تو کجا اس کی ای میل تک نہیں آئی تھی۔مگر جس روز مجھے واپس لوٹنا تھا اس کا پیغام مل گیا۔اس نے بہت دل گرفتگی کے ساتھ معافی مانگی اور اپنی مجبوریوں کے بارے میں بہت سی گول مول باتیں لکھ کر ایک پریشان کن اطلاع دی تھی

’’میں شائد کچھ دنوں کے لئے جواب نہ دے سکوں۔تم پریشان نہ ہونا اور مجھے اپنی خیریت برابر لکھتے رہنا‘‘

میں پریشان کیسے نہ ہوتا۔مگر اس کے سوا کر ہی کیا سکتا تھا۔اس کے بعد سچ مچ اس سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں کچھ روز اسے ای میل پیغامات بھیجتا اور اپنی خیریت کی اطلاع دیتا رہا لیکن یہ یک طرفہ رابطہ بڑا بے معنی،صبر آزما اور اکتا دینے والا تھا اس میں آہستہ آہستہ لمبے وقفے آنے لگے۔دریں اثنا میرے دل میں اس شک نے پھر ایک بار سر اٹھا لیا کہ وہ زیبا ہی تھی یا انٹرنیٹ کی کوئی شریر لڑکی یا لڑکا مجھے بیوقوف بنا رہا تھا۔ممکن ہے یہ ’’کوئی تنہائی سی تنہائی ہے‘‘ والا لاہوری نوجوان ہو جو مجھ سے اپنی پریشانی اور بیوقوف بنائے جانے کا بدلہ لے رہا ہو۔وہ بھی تو کمپیوٹر پروگرامنگ میں ماسٹر کر رہا تھا۔

میں نے نئے سرے سے سارے معاملے کی تحقیق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اور سب سے پہلے رحیلہ کو فون کیا۔اس کے والدین لڑکیوں کو ٹیلیفون پر بات کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اس لئے اس نے مجھے اپنی ایک دوست کے گھر کا فون نمبر دیا ہوا تھا۔میرے فون کے جواب میں تیسرے روز اس کا فون آ گیا۔اس سے براہِ راست زیبا کے زندہ ہونے کی بات کرنا مناسب نہیں تھا یہ اس کے معصوم جذبات سے کھیلنے کے مترادف ہوتا یوں بھی وہ گذشتہ ملاقات میں میرے شبہات کی تردید کر چکی تھی۔اس لئے میں نے بہانہ کیا

’’میں نے زیب کو خواب میں دیکھا ہے۔ کہہ رہی تھی وہ زندہ ہے‘‘

میری بات سن کروہ دکھی ہو گئی اور گلوگیر لہجے میں بولی

’’ہاں باجی مجھے بھی خواب میں ملی تھیں۔ اور یہی کہا کہ میں مری نہیں زندہ ہوں۔میں نے امی اور ابو سے ذکر کیا تو وہ کہنے لگے۔ بے شک جن لوگوں کی موت ایسی بیچارگی اور مظلومیت کے عالم میں ہوتی ہے وہ شہید کہلاتے اور زندہ رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ایسے لوگوں کو مرا ہوا مت کہو‘‘

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔یہ اتفاق تھا یا کوئی اسرار؟میں مزید کنفیوژن کا شکار ہو گیا۔

کچھ روز زیبا کی ای میل کا انتظار کرنے کے بعدمیں نے اپنی الجھن کا ایک دوست احمد علی سے ذکر کیا جو کمپیوٹر کے بارے میں زیادہ معلومات رکھتا تھا۔مجھے شک تھا کہ یہ کوئی وائرس یا انٹرنیٹ بوٹ نہ ہو۔میں نے مائیکرو سافٹ آفس پروگراموں میں بوٹس کو اسسٹنٹ کے طور پر مدد دیتے اور سرچ کے دوران میں ایک پلے کی صورت میں فائلیں سونگھتے اور دم ہلاتے دیکھا تھا مگر زیادہ تفصیل نہ جانتا تھا۔احمد علی کہنے لگا

'' حالیہ برسوں میں انٹرنیٹ پر مصنوعی ذہانت کی حامل مخلوق کے سلسلے میں بڑی پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ زندگی کی ایک نئی قسم کا ظہور ہے۔یہ ایجنٹس اور بوٹس حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔بالکل جیتے جاگتے اجسام کی طرح کام کرتے اور بعض ہو بہو زندہ انسان معلوم ہوتے ہیں۔اس حقیقی نظر آنے والی مخلوق کی بے شمار قسمیں اور گروپس ہیں۔چیٹنگ کرنے،آن لائن اسٹورز سے خریداری میں مدد دینے،سرچ اور انٹرنیٹ کے جملہ امور میں معاونت کرنے،تکنیکی اور نفسیاتی معاملات میں مشورہ دینے،گیمز میں رہنمائی کرنے اور آپ کے پرسنل سیکرٹری یا اسسٹنٹ کے فرائض سر انجام دینے والے ایجنٹس ا ور بوٹس۔ایسی ورچوئل لیڈی سکرٹریز جو آپ کی مصروفیات کا شیڈول مرتب کرتی،آپ کو ای میل کا متن پڑھ کر سناتی اور آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی ٹیلیفون کال سنتی اور جواب دیتی ہیں۔اس کا خیال تھا کہ مجھے زیبا کی نہیں کسی ایسی ہی اصلی یا ورچوئل شخصیت کی ای میلز وصول ہو رہی تھیں۔ لیکن مجھے اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔ میں نے کہا

'' میں نہیں مانتا۔زیبا نے بعض ایسی پرائیویٹ باتوں کا بھی حوالہ دیا ہے جو صرف میرے اور اس کے علم میں تھیں۔مشین جتنی بھی ذہین ہو جائے وہ انسانی ذہن میں چھپے ہوئے خیالات اور تنہائی میں ہونے والی باتیں کیسے جان سکتی ہے؟''

احمد علی میری بات سن کر خود بھی شش و پنج میں پڑ گیا پھر اس نے اپنے کسی پروفیسر کو فون کر کے ساری بات بتائی اور ان کی ہدایت کے مطابق مجھ سے کوائف اور پاس ورڈز لے کر نئے سرے سے اس مسئلے کی تحقیق شروع کر دی۔کوئی دو گھنٹے بعد اس نے مایوسی سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا

''مجھے افسوس ہے نوید،میں تمہیں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکتا۔ میں اب بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انٹرنیٹ پر زیبا کے نام سے تمہاری جو دوست بنی ہے وہ ایک مصنوعی شخصیت ہے اس نے تمہارے کمپیوٹر سے معلومات چرائیں اور ان کی بدولت تمہاری مر چکی محبوبہ کا روپ دھار لیا۔حقیقی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ''

مجھے لگا جیسے زیبا دوسری مرتبہ مری ہو۔ میں دہرے غم میں مبتلا ہو گیا اور میں نے آئندہ سے اس کی میل ہینڈل کرنے سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر لیا۔مگر ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ اس کا پیغام آ گیا ''فرائیڈے،گیارہ بجے دن، دامن کوہ ویو پوائنٹ''

اگر یہ بلاوا حسب معمول کسی دوسرے شہر کے لئے ہوتا تو میں ہرگز اس پر اعتبار اور عمل نہ کرتا مگر یہ محض چند کلومیٹرز کا فاصلہ ہی تو تھا۔میں جمعہ کو مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی دامن کوہ پہنچ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔یہ عام لوگوں کی سیر کا وقت نہیں تھا اس لئے وہاں کوئی خاص رش نہ تھا۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہی کوئی گاڑی آتی تھی۔میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا مگر وہ حسب معمول کہیں دکھائی نہ دی۔میں مایوس ہو کر لوٹ جانا چاہتا تھا کہ اچانک میری نظر

رحیلہ پر پڑی۔میں سمجھ گیا اس نے اسے بھی ملاقات کے لئے بلایا ہو گا۔میرے دل میں امید کا دیا روشن ہو گیا۔ یقیناً وہ زندہ تھی اور آج اس سے ملاقات ہو جائے گی۔

رحیلہ مجھے دیکھ کر قریب آ گئی۔سلام دعا کے بعد میں نے اس سے پوچھا

''یہاں کیا کر رہی ہو رحیل؟''

''وہی جو آپ کر رہے ہیں ''اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔وہ مجھے پہلے سے بڑی نظر آئی اور لمحہ بھر کے لئے اس پر زیبا کا گمان ہوا

''اس کا مطلب ہے اس نے تمہیں بھی بلایا ہے؟''

''ہاں ''وہ بولی ''لیکن مجھے معلوم ہے وہ آئیں گی نہیں ''

''کیوں ؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں ''وہ شوخی سے بولی ''کبھی کوئی مر کر بھی واپس آتا ہے؟''

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

***

اوور ٹائم

اسے اکثر دفتر بند ہو جانے کے ایک گھنٹہ بعد تک اوور ٹائم بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی اور ایک روپیہ فی گھنٹہ کے حساب سے بیس پچیس روپے ماہوار تنخواہ سے زیادہ مل جاتے تھے اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ اسے ایک گھنٹہ مزید اوور ٹائم کام کرنے کی اجازت مل جائے لیکن اس کے انچارج نے کبھی اس کی منظوری نہیں دی تھی۔

آج بھی وہ دفتر بند ہو جانے کے ایک گھنٹہ بعد گھر جانے کے لئے باہر نکل رہا تھا کہ چوکیدار نے اسے جی ایم صاحب کی والدہ کے انتقال کی خبر سنائی۔

دکھ کی ایسی خبروں میں جن کا تعلق کسی دوسرے سے ہو آدمی کے کہیں اندر اطمینان کا ایک پہلو بھی موجود ہوتا ہے کہ یہ حادثہ یا المیہ اس کے اپنے ساتھ پیش نہیں آیا۔ اس نے بھی یہ خبر ایسے ہی اطمینان بخش ملال کے ساتھ سنی۔ ویسے بھی اس کا جی ایم صاحب سے براہ راست کوئی تعلق یا واسطہ نہیں تھا البتہ پچھلے ہفتے اس نے اپنی ترقی کے لئے ان کے نام ایک اپیل تھرو پراپر چینل بھجوائی تھی جس میں ذاتی طور پر حاضر ہونے اور اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت بھی مانگی تھی اور وہ اسی روز سے پریشان اور خائف تھا کہ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گا اور اپنا موقف کس طرح بیان کرے گا۔اس کے اور جی ایم صاحب کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ درمیان میں کتنے ہی بڑے بڑے افسران دشوار گزار پہاڑوں کی طرح ایستادہ تھے جن کے سامنے جا کر اس کی ٹانگیں کانپنے اور زبان لڑکھڑانے لگتی تھی پھر وہ سب سے بڑے افسر جی ایم صاحب کا سامنا کیسے کرے گا افسروں کے سامنے اس کے ہمیشہ بلاوجہ ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔

اس نے پلٹ کر آر اینڈ آئی برانچ اور ٹیلیفون ایکسچینج میں جھانکا۔ آر اینڈ آئی برانچ کا مختصر سا عملہ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور ٹیلی فون ایکسچینج کے دوسری شفٹ کے آپریٹرز تیزی سے مختلف نمبر ڈائل کرنے، افسران کو ان کی اقامت گاہوں پر اطلاع دینے اور نماز جنازہ کا وقت بتانے میں مصروف تھے۔ اسے خیال آیا کہ اگر وہ

جی ایم صاحب کے بنگلہ پر اظہار تعزیت کرنے اور نماز جنازہ میں شرکت کے لئے چلا جائے تو جونیئر اسٹاف کی غیر موجودگی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی اور جب وہ کچھ دنوں بعد جی ایم صاحب کے سامنے اپنی اپیل کے سلسلے میں حاضر ہو گا تو ''فی الحال نہیں '' لکھتے یا کہتے وقت ان کی نگاہوں میں اپنی والدہ کا جنازہ گھوم جائے گا اور وہ ''منظوری دی جاتی ہے'' لکھ دیں گے۔اس خوشگوار خیال کے ساتھ ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر اگر بتی سی سلگنے لگی اور اس کا سارا اندر خوشبودار دھوئیں سے بھر گیا۔

اس نے جی ایم صاحب کے بنگلے پر جانے کا تہیہ کر لیا لیکن ابھی جنازہ اٹھنے میں خاصی دیر پڑی تھی اور اگرچہ اسے پتہ تھا کہ تعزیت کے لئے جانے میں تھرو پراپر چینل کے دفتری ضابطے لاگو نہیں ہوتے پھر بھی اس کا اپنے سینئر افسران سے پہلے جی ایم صاحب کے بنگلے پر پہنچ جانا مناسب نہیں تھا۔

ایک بار اس نے سوچا کہ وہ پہلے اپنے گھر چلا جائے اور کھانا کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جی ایم صاحب کے ہاں جائے لیکن اس طرح دگنا کرایہ خرچ ہوتا تھا اور پھر اسے ڈر تھا کہ کہیں اڑوس پڑوس میں اس کا کوئی کولیگ نہ مل جائے وہ اگلے روز دفتر میں سب کو جی ایم صاحب کے بنگلے پر جانے،نماز جنازہ میں شرکت کرنے اور جی ایم صاحب سے ہمکلام ہونے کی خبر سنا کر حیرت میں ڈال دے گا اور کم از کم اس کے انچارج کی آنکھیں ضرور کھل جائیں گی جنہیں آدمی کی بالکل قدر نہیں تھی۔

وہ دفتر سے نکل کر خوش خوش بس اسٹاپ پر آیا اور بس میں سوار ہو کر اس چوک پر اتر گیا جہاں سے ایک سڑک جی ایم صاحب کے بنگلے کی طرف جاتی تھی۔ابھی جنازہ اٹھنے میں کافی دیر تھی اس لئے وہ سڑک سے ہٹ کر ٹہلتا ہوا قریبی سینما ہاؤس میں آ گیا اور وقت گزاری کے لئے پوسٹر اور تصویریں دیکھنے لگا۔ بڑے عرصہ سے اس نے فلم نہیں دیکھی تھی۔ گھر کے اخراجات ہی پورے نہ ہوتے تھے اوپر سے بیوی اکثر بیمار رہتی اور اس کے علاج معالجے پر خاصے پیسے خرچ ہو جاتے تھے۔اس لئے جب کبھی اس کا فلم دیکھنے کو جی مچلتا وہ کسی سینما ہاؤس کا رخ کرتا اور ''آج شب کو'' والے بورڈ پر لگی سٹلز (Stills) دیکھ کر فلم کی کہانی اور موضوع کا اندازہ کر لیتا تھا۔ بعض سینما ایسے تھے جہاں باہر کھڑے ہو کر مکالمے اور گانے بھی سنائی دیتے تھے اس نے دیکھا۔۔ اس فلم میں ہیروئین کو نہایت غریب دکھایا گیا تھا۔ کہیں وہ جھاڑو دے رہی تھی کہیں بوجھ اٹھا رہی تھی اور ایک تصویر میں برتن دھو رہی تھی قریب ہی مالکن جو شاید ہیرو کی ماں تھی کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑی اسے کسی بات پر برا بھلا کہہ رہی تھی۔ایک اور تصویر میں ہیروئین ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا میں ششدر کھڑی تھی اس کے سامنے رنگا رنگ ملبوسات بکھرے پڑے تھے۔ وہ پریشان ہو گیا وہ یہاں کیسے آ گئی لیکن پھر اس کی نظر ایک اور تصویر پر پڑی وہ خوش شکل ہیرو کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

فلم شروع ہو چکی تھی اور بند دروازوں سے چھن چھن کر دلکش سازوں میں لپٹی ہیرو اور ہیروئین کے گانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھی شاید یہ اسی سین کا گانا تھا۔

اس نے بہت سی تصویروں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ہیرو ہیروئین کی شادی کی تصویریں ڈھونڈھنے لگا۔جو اسے جلد ہی مل گئی۔ ہیروئین کو دلہن بنایا جا رہا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں جھونپڑی نما مکان اور معمولی قسم کے لوگ نظر آ رہے تھے شاید کسی کچی بستی میں امیر کبیر دولہا کی برات آنے والی تھی۔ اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور باہر آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا اس کی ترقی ہو گئی اور اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تو وہ ہر ماہ کم از کم ایک فلم ضرور دیکھے گا،کبھی کبھی بیوی کو بھی ساتھ لے آیا کرے گا۔ پھراسے جی ایم صاحب کی والدہ کا خیال آیا یقیناً وہ نیک عورت تھی جس نے مر کر اسے جی ایم صاحب کی نظروں میں آنے اور اپیل منظور ہو جانے کا موقع بخشا تھا اسے جی ایم صاحب پر بھی ترس آنے لگا ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ماں کو نہیں مرنا چاہیے خواہ کسی کی ماں ہو۔ماں مر جائے تو لگتا ہے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اور آدمی خلاء میں معلق رہ گیا۔

باہر آ کر اس نے چنے خریدے، نل سے پانی پیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوبارہ اس سڑک پر آ گیا جو جی ایم صاحب کے بنگلے کی طرف جاتی تھی۔ اچانک گھوڑا گاڑی ایک بس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ گاڑی بان بس ڈرائیور کو گندی گالیاں دیتا ہوا مریل گھوڑے کو بری طرح پیٹنے لگا۔گھوڑے کی پیٹھ پر بڑے سے کھرنڈ سے خون بہنے لگا وہ لمحہ بھر کے لئے گھوڑے کی جگہ جت گیا۔کچھ دیر چابک کھاتا اور درد سے بلبلاتا رہا پھر جب گھوڑا گاڑی دوسرے طرف مڑ گئی تو اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ گھوڑا نہیں آدمی ہے اور مزے سے فٹ پاتھ پر جا رہا ہے۔ وہ سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے خوبصورت درخت تھے جن کے تنوں کو سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ آس پاس پھول، پودے اور ہری بھری گھاس تھی اس نے جی ایم صاحب کا بنگلہ نہیں دیکھا تھا لیکن اسے لوکیشن کا اندازہ تھا ویسے بھی شادی بیاہ اور ماتم والا گھر تلاش کرنا مشکل نہیں ہوتا۔

ایک سبزہ زار کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ یقیناً سامنے کا شاندار بنگلہ جی ایم صاحب کا ہی تھا۔۔ بنگلے کے باہر کشادہ جگہ پر کاریں اور جیپیں اس طرح کھڑی تھیں جیسے میلہ مویشیاں میں لاتعداد مویشی۔چند ایک کاروں کو پہچان کر اسے اطمینان ہوا کہ وہ وقت سے پہلے نہیں آ گیا۔

گیٹ سے اندر بہت بڑا لان تھا جس میں خوبصورت شامیانے لگے تھے اور نہایت عمدہ قسم کی رنگ برنگی کرسیاں بچھی تھیں مگر زیادہ تر لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ادھر ادھر کھڑے باتیں کر رہے تھے وہ جس طرف سے گزرتا،سلام کے لئے اس کا ہاتھ خودبخود اٹھ جاتا لوگ اسے چونک کر دیکھتے یا شاید اسے ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے اس کا سلام کرنا ناگوار گزرا ہو۔ اسے فکر دامن گیر تھی کہ وہ جی ایم

صاحب سے اظہار تعزیت کیسے کرے گا یوں اس نے احتیاطاً چند جملے سوچ رکھے تھے۔

''اللہ کا حکم سر۔''

''رب کی رضا سر۔''

''صبر کریں سر۔''

لیکن اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ یہاں رسمی اظہار افسوس کی ضرورت تھی نہ گنجائش۔ جو آتا تھا خاموشی سے بیٹھ جاتا تھا یا دوسروں سے محو گفتگو ہو جاتا تھا۔ اس نے دیکھا جی ایم صاحب بہت مصروف تھے کبھی اندر جاتے کبھی باہر آتے۔ اسے ان کے قریب جانے کی ہمت نہ ہوئی تاہم وہ ایسی جگہ کرسی رکھ کر بیٹھ گیا جہاں سے آتے جاتے ان کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔

پھر اس کی نظر اپنے سینئر افسر پر پڑی پھر اس سے سینئر افسر پر۔ اسے لگا جیسے وہ اس کی جرأت پر حیران ہوں اور اندر ہی اندر غصے میں کھولتے اس کی جواب طلبی کی ڈکٹیشن دے رہے ہوں۔

وہ بہت مرعوب اور دل و دماغ کو شل کر دینے والی نظروں سے بچنا چاہتا تھا لیکن کہیں جائے امان نہ تھی اگر کہیں تھی تو جی ایم صاحب کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس نے پریشان ہو کر نظریں جھکا لیں اور اپنے سامنے اور آس پاس چلتے پھرتے لوگوں کے جوتوں اور ایڑیوں پر نظریں گاڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا قد سکڑ کر بالشت بھر رہ گیا ہے یا لان میں موجود لوگ اچانک دیو قامت ہو گئے ہیں۔ وہ چاروں طرف سے بہت سے بڑے بڑے لوگوں اور انیس، بیس، اکیس اور بائیس گریڈ والے افسروں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ وزیر،وہ سفیر،یہ چئیرمین،وہ سیکرٹری۔یہ آئی جی، وہ ایم ڈی۔ یہ ای ڈی، وہ ڈی جی۔ اسے یہ دیکھ کر ندامت ہوئی کہ اس کے آس پاس بڑے بڑے لوگ کیپیٹل لیٹرز کی طرح کھڑے تھے اور وہ حمزہ سا مزے سے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔اپنی کوتاہ عقلی پر اس کا ماتم کرنے کو جی چاہا۔ اس نے فوراً کرسی چھوڑ دی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا مگر ٹہلتے اور باتیں کرتے ہوئے لوگ خودبخود اس کے قریب آ جاتے۔ پھر اسے چونک کر دیکھتے جیسے اتنے چھوٹے قد کا آدمی انہوں نے پہلی بار دیکھا ہو۔

کاش وہ اپنے کسی کولیگ کو ساتھ لے آیا ہوتا۔۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں شاید اسے کوئی اپنے قد کا آدمی مل جائے مگر وہاں سب نو گزے تھے۔ اس کا دل ڈوبنے سا لگا کہیں اس نے یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی۔ اگر جی ایم صاحب اسے دیکھ لیں ۔۔ ایک بھرپور نظر۔۔ نہ بھولنے والی۔۔ تو وہ چپکے سے اٹھ کر گھر چلا جائے۔

تھوڑی دیر میں اور بہت سے لوگ آ گئے۔

گیٹ کے باہر کاروں کی تعداد اور بڑھ گئی۔اندر لان میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تو کچھ لوگوں کو ڈرائنگ روم میں جانے کی دعوت دی گئی۔ وہ اندر جانے والوں میں شامل ہو گیا۔وہ زیادہ نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے صرف جی ایم صاحب کی ایک بھرپور نظر کا انتظار تھا۔ ڈرائنگ روم میں گنتی کے چند لوگوں میں اس کا امکان زیادہ تھا۔

سجا سجایا ڈرائنگ روم اس کے دو کمروں کے کوارٹر سے زیادہ کشادہ اور نہایت خوبصورت تھا۔کھڑکیوں کے بیش قیمت اور نفیس پردے، خوشنما قالین اور عالیشان صوفے دیکھ کر اندر داخل ہوتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہونے لگی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی شاید بیٹھنے کے لئے معمولی قسم کی کرسی، اسٹول یا مونڈھا مل جائے مگر اسے گدے دار صوفے میں بیٹھنا پڑا۔ تھری سیٹر صوفے میں اس سمیت چار آدمی بیٹھے تھے شائد اس نے کچھ بھی جگہ نہیں گھیر رکھی تھی۔

اس نے دیکھا کارنس پر بڑی بڑی خوبصورت ٹرافیاں، میڈل اور سجاوٹ کی چیزیں پڑی تھیں۔ دروازے کے سامنے باریک تاروں میں پروئی ہوئی مچھلیاں معلق تھیں۔ ہوا کے جھونکوں سے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کے پیچھے لپکتی تھیں۔ اسے لگا کہ تیرتے تیرتے اس کے پر اور گلپھڑے تھک گئے ہیں اور اپنا بڑا سا منہ کھولے شارک اس کے پیچھے لپکتی چلی آ رہی ہے لیکن پھر اسے یہ جان کر اطمینان ہو گیا کہ بڑی اور چھوٹی مچھلیوں کے درمیان فاصلہ کم نہیں ہوتا اور وہ آپس میں ٹکراتی نہیں تھیں۔ اسی لمحے ساتھ والے کمرے سے کسی نے ڈرائنگ روم میں جھانکا جیسے اندھیری رات میں اچانک بجلی کوندتی یا سامنے سے آنکھوں پر سرچ لائٹ پڑتی ہے، اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ تعظیماً کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ وہ پردے کے پیچھے چلی گئی مگر پردے کے نیچے سے دیر تک اس کے سفید اور اجلے پاؤں نظر آتے رہے۔ اس نے سامنے پھیلے ہوئے اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لئے۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا تھا کہ اس کے پاؤں اس قدر مٹیالے اور بھدے تھے۔

پھر اس کی نظر وال کلاک پر پڑی۔ اتنا بڑا، خوبصورت اور انوکھے ڈیزائن کا کلاک اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا کیا پتہ وہ ماسٹر کلاک ہو۔ اس نے سنا تھا کہ مختلف کمروں میں لگے ہوئے کلاک ماسٹر کلاک سے کنٹرول ہوتے ہیں سب کے الارم ایک ساتھ بجتے ہیں اور سب کی سوئیاں ماسٹر کلاک کے تابع ہوتی ہیں اس نے یہ بھی سنا تھا کہ ماسٹر کلاک پر وقت عموماً درست ہوتا ہے لیکن اگر کبھی وقت ماسٹر کلاک سے آگے نکل جائے یا پیچھے رہ جائے تو ماتحت کلاک بھی غلط وقت بتانے لگتے ہیں۔

اچانک جی ایم صاحب اندر آ گئے اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہوا کے جھونکے کی طرح دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔اس نے دیوار پر لگی پینٹنگ میں پناہ لی۔

اس نے دیکھا۔

شام ہونے کو تھی۔۔ پہاڑی لڑکی اپنی بھیڑوں کو ہانکتی ہوئی گھر جا رہی تھی اس کے ہاتھ میں زیتون کی شاخ تھی اور اس کے ہمراہ اس کے وفادار کتے۔۔ چاروں طرف سبزہ تھا تھوڑے فاصلے پر گھنا جنگل، عقب میں نیلی نیلی پہاڑیاں ۔۔ اسے خیال آیا اگر کوئی بھیڑیا یا چیتا حملہ کر دے تو؟ اس نے پہاڑی لڑکی سے پوچھا۔

''تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''

''لگتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''لیکن نہیں لگتا تھا۔ میرے کتے شیر سے زیادہ بہادر، چیتے سے زیادہ پھرتیلے اور بھیڑیوں سے زیادہ خونخوار تھے میرا بھائی قریب ہی جنگل میں لکڑیاں کاٹتا تھا اس کے کلہاڑے کی دھمک سے جنگل گونجتا تھا اور اس کی للکار سن کر جانور سہم جاتے اور پرندے پھڑپھڑا کر درختوں سے اڑ جاتے تھے لیکن پھر میں اپنی بھیڑوں، وفادار کتوں اور نیلی پہاڑیوں سمیت تصویر میں قید ہو گئی۔ اب میری بھیڑیں خاموش ہیں،کتے ساکت اور بھائی کے کلہاڑے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

اس نے چونک کر دیکھا سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر اطمینان سے بیٹھے تھے مگر وہ کھڑا تھا۔ جی ایم صاحب کے کمرے میں آنے اور لوٹ جانے کے بعد وہ اب تک کھڑا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ وہ جلدی سے پھر صوفہ میں دھنس گیا۔

میت کو لان میں لایا گیا تو سب لوگ باہر آ گئے اور نماز جنازہ کے لئے صفیں بنانے لگے۔۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اس ہجوم میں جی ایم صاحب کو ڈھونڈ نکالے اور نماز جنازہ پڑھتے ہوئے ان کے قریب کھڑا ہو مگر وہ اسے نہ مل سکے۔ بار بار اپنے دوسرے سینئر افسران سے اس کا سامنا ہو جاتا۔

دعا کے بعد وہ لپک کر آگے بڑھا اور جنازے کو کندھا دینے والوں میں شامل ہو گیا۔ دو ایک بار جی ایم صاحب قریب آئے مگر انہوں نے اسے نہیں دیکھا۔

بہت سے لوگ نماز جنازہ پڑھ کر رخصت ہو گئے تھے اس کا خیال تھا اب تھوڑے لوگوں میں وہ اسے ضرور دیکھ لیں گے اور یاد بھی رکھ سکیں گے لیکن وہ دوسری جانب کندھا دے کر پیچھے ہٹ گئے اور سر جھکا کر جنازے کے پیچھے چلنے لگے۔

چند ایک بار اس کی جگہ بدلی گئی مگر وہ اس خیال سے پھر اپنی جگہ پر واپس آ جاتا کہ شاید وہ اس کی جگہ لینے آئیں تو ان سے آنکھیں چار ہو جائیں۔ لیکن ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد بھی انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔

قبرستان پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا اور کچھ فاصلے سے ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔

دفتر سے نکلے اب اسے تقریباً پانچ گھنٹے ہو چلے تھے اسے اپنے پانچ گھنٹے ضائع ہوتے نظر آ رہے تھے تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری اور میت کو لحد میں اتارتے وقت نیچے اتر گیا اور قبر کے اندر کھڑے ہو کر اوپر دیکھتا رہا کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں یا نہیں۔قبر پر مٹی ڈالتے اور گلاب کا عطر چھڑکتے وقت بھی وہ پیش پیش رہا اور دعا کے دوران آمین کہتے ہوئے بھی اس کی آواز نمایاں تھی۔

اس کے دوسرے سینئر افسران میں سے بہت سے اب بھی موجود تھے اور مسلسل اس کی کارکردگی کا نوٹس لے رہے تھے مگر وہ سب درخواست فارورڈ(For ward)کرنے والے تھے۔ آخری فیصلہ جی ایم صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے تھے۔

پھر قبرستان کے باہرکچھ کاریں آ کر رک گئیں۔ ان میں شاید جی ایم صاحب کی ایئر کنڈیشنڈ کار بھی تھی۔

دعا کے بعد جی ایم صاحب بچے کھچے بلند قامت لوگوں کے ہمراہ کار کی طرف چلے گئے اور وہ گم صم قبر پر کھڑا رہ گیا۔

لیکن پھر ایک شخص جو گورکنوں کو پیسے دے رہا تھا اس کی طرف آیا اور اس کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

اس کا جی چاہا وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ دفتر میں اوور ٹائم کام کرتا تو بھی اتنے ہی پیسے بنتے اس نے پانچ روپے کا نوٹ جیب میں ڈالا اور ایک طرف چل دیا

***

پکی سڑک (مائی فٹ)

یوں تو ان دنوں ہر جگہ سخت گرمی پڑ رہی تھی مگر اپنے آبائی گاؤں پہنچ کر مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے ہم ایک لمبی سخر دوپہر کی زد میں آ گئے ہیں۔ دن بھر آگ برستی اور لو کے تھپیڑے گھروں، آنگنوں، گلیوں اور کھیتوں کھلیانوں میں اپنی پیاسی زبانوں سے حسن اور ہریالی چاٹتے۔۔ سورج کسی خونخوار درندے کی طرح جبڑوں سے لگا خون چاٹتا اپنے کچھار کو پسپا ہوتا تو لوگوں کی جان میں جان آتی مگر زمین اس قدر تپی ہوئی اور ہوا اس قدر دہکی ہوئی ہوتی کہ گئی رات تک لو چلتی اور جھلسے ہوئے نڈھال جسموں کو تازگی نصیب نہ ہوتی۔۔ میں اسے ایسے موسم میں یہاں لا کر پشیمان ہو رہا تھا مگر اس نے ابھی تک کوئی شکایت نہ کی تھی۔

اگلے روز ہمیں واپس جانا تھا اس لئے اس کے اصرار پر میں اسے شام کو گھمانے لے گیا مگر دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔اسے کہاں لے جاؤں کیا دکھاؤں۔اس نے میرے بچپن کے گاؤں کی خوبصورت اور رومانی باتیں میرے افسانوں میں پڑھی تھیں اور شاید تصور میں بھی بسا رکھی تھیں۔ مجھے لگتا تھا جیسے اس کی خوبصورت آنکھیں ہر جگہ میرا بچپن تلاش کر رہی تھیں مگر ننگ دھڑنگ اور میلے کچیلے بچوں کو گلیوں میں بھاگتے دوڑتے اور جوہڑوں میں چھلانگیں لگاتے دیکھ کر مجھے خفت ہو رہی تھی اور اپنی بے پردگی کے احساس کی دھول سے میرا حلق بند ہو رہا تھا۔

گاؤں اب میرے خیال میں بہت بدل گیا تھا۔گاؤں سے ملحقہ زمین میں سیم اور تھور کا کوڑھ دور تک پھیل گیا تھا۔وہ اکلوتا باغ جہاں ہم آنکھ مچولی کھیلتے، جھولے جھولتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے تھے اجڑ چکا تھا۔ برگد کے نیچے جہاں دوپہروں کو محفلیں جمتی تھیں اور ہیر اور سیف الملوک گائی جاتی تھیں اب وہاں بھینسیں بندھی تھیں اور گوبر کا تعفن پھیلا ہوا تھا۔ وہ میدان جہاں کبڈی اور کشتی کے مقابلے ہوتے تھے اور فصلوں کی کٹائی کے دنوں میں جہاں رہس دھارئیے سوانگ رچاتے اور کٹھ پتلیوں کے ناچ دکھاتے تھے، ایک غلیظ تالاب کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ آٹا پیسنے کی چکی کے گھگھو کی ٹوہ ٹوہ، کتوں کے لڑنے، بلیوں کے غرانے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازوں سے مل کر عجیب وحشت سی پھیلاتی

رہتی۔۔ وہ ناز و نعم میں پلی۔۔ مہذب معاشروں میں رہ کر آئی تھی۔میں اسے اپنا گاؤں دکھانے لایا تھا مگر اس کی موجودگی میں مجھے اپنا گاؤں اور بھی پسماندہ لگ رہا تھا۔ ویسے بھی موجودہ گاؤں میرے بچپن کے گاؤں سے اس قدر مختلف تھا کہ خود مجھے لگ رہا تھا میں کسی اجنبی جگہ پر آ گیا ہوں۔ لوگوں میں پہلے کی طرح محبت نہیں رہی تھی ایک دوسرے کی بجائے اب وہ شہر کے لوگوں کی طرح روپے پیسے سے محبت کرنے لگے تھے۔ غالباً اس نے میری پریشانی بھانپ لی تھی۔ کہنے لگی۔

’’یہ گاؤں بہت اچھا ہے میرے خیال میں اب لوگ زیادہ حقیقت پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ موجودہ بحرانی دور کے بطن سے جلد ہی ایک نئے عہد کا آغاز ہو گا۔‘‘

’’خاک ہو گا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ تو ہمارا اجتماعی رویہ بن چکا ہے ہم سب میلے پر آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم ایک بے فکری قوم ہیں۔ آتش فشانوں کے دہانوں پر بیٹھ کر چین کی بانسری بجانے والے اور یہ چھوٹا سا گاؤں بھی ہمارے اسی مجموعی رویے کا ایک حصہ ہے۔ تم دیکھ نہیں رہی ہو۔۔ ہر شخص دوسرے سے کیسے الگ تھلگ ہے۔ ترقی یافتہ شہروں کی مشینی بے مروتی اور بے سکونی کا دھواں اور آپا دھاپی کی آنچ یہاں بھی پہنچ گئی ہے۔‘‘

کہنے لگی۔ ’’کچھ بھی ہو یہاں کی فضا میں مجھے آزادی اور وسعت کا احساس ہوا ہے ورنہ پچھلے کئی ماہ سے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ اپنے ہونے نہ ہونے کا کچھ پتہ نہ چلتا تھامیں تو یہاں آ کر زمین و آسمان سے نئے رشتے استوار کر رہی ہوں۔‘‘

اس کی ایسی ہی باتوں سے میری ڈھارس بندھی اور خفت کا احساس کم ہوا۔۔ اسی شام ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔۔

جب ہم گھر لوٹ رہے تھے گلی میں پیراں دتہ سے ملاقات ہو گئی۔ گاؤں میں اسی کا ایک تانگہ تھا جو سواری ملنے کی صورت میں جوتا جاتا تھا۔ ہم نے اسے دو ایک روز پہلے ہی اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ وہ ہفتہ کی صبح کو کہیں ادھر ادھر نہ جائے اور ہمیں پکی سڑک پر بسوں کے اڈے پر پہنچا آئے۔ اسے اپنا منتظر پا کر ہمیں خیال آیا کہ وہ صبح کے پروگرام کے بارے میں اطمینان کرنے آیا ہو گا مگر اس نے ہمیں کوئی متبادل انتظام کر لینے کا مشورہ دے کر پریشان کر دیا۔

’’کیوں کیا ہوا؟۔۔ کیا گھوڑا بیمار ہو گیا؟‘‘

’’نہیں جی۔‘‘ وہ کہنے لگا۔ ’’ابھی ابھی چودھری نور محمد کا پیغام ملا ہے کہ صبح انہیں تحصیل جانا ہے۔‘‘

’’ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم انہیں بھی ساتھ لے لینا۔‘‘

’’نہیں جی۔۔ وہ بڑے آدمی ہیں ۔۔ سواریوں والے تانگے میں نہیں بیٹھیں گے۔‘‘

''بڑے آدمی !کیا بہت موٹے اور لمبے ہیں۔'' وہ بولی۔ '' اور کیا ہم تمہیں بونے نظر آتے ہیں۔''

پیراں دتہ نے خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر بولا۔

''ان کے لئے ہمیشہ سالم لے جانا پڑتا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''تو ہم نے تمہیں پہلے سے کہہ رکھا ہے تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہو گا۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ شہر نہیں جہاں سواریوں اور سیٹوں کی ریزرویشن ہو جاتی ہے۔ یہ گاؤں ہے اور چودھری نور محمد اس کے دو تہائی حصے کا مالک ہے اور پیراں دتہ اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتا مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ کہنے لگی۔

''آپ خود چودھری سے بات کریں اور اسے بتائیں کہ ہمارا پہنچنا ضروری ہے اور ہم نے تانگہ بک کر رکھا ہے۔''

''وہ بے حد مغرور اور اجڈ آدمی ہے اسے اپنی ہتک سمجھے گا اور برا منائے گا۔''

''تو کیا آپ اس سے ڈرتے ہیں ؟۔'' وہ چمک کر بولی۔ ''میں خود اس سے بات کر سکتی ہوں۔''

''یہ مناسب نہیں۔'' میں نے کہا

''بی بی جی۔۔ عزت دار آدمی کو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔'' پیراں دتہ نے کہا۔

''کمال ہے'' وہ غصے سے بولی۔ ''آدمی آدمی سے ڈرے۔۔ کیسی عجیب بات ہے۔''

''سبھی آدمی۔۔ آدمی نہیں ہوتے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''آدمیوں کے روپ میں راکشس بھی ہوتے ہیں اورکبھی کبھی اژدہے بھی آدمیوں کی جون بدل لیتے ہیں۔بہرحال تم کسی فلمی کہانی کی ہیروئن نہ بنو اور پریشان نہ ہو۔ کوئی دوسرا انتظام ہو جائے گا۔۔''

''لیکن یہ ایک غلط اور اصول کے خلاف بات ہے۔''

''بہت سی غیر اصولی باتیں ہمارے اردگرد ہر لمحے ہوتی رہتی ہیں اور ہم چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے انسان بعض معاملات میں بے بس ہوتا ہے مگر تم اس معمولی سی بات پر جی میلا نہ کرو۔''

''عجیب بات ہے کہ ایک شخص دوسروں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا محض اس لئے کہ کاغذوں میں اس کے نام اس کی ضرورت سے زیادہ اراضی لکھی ہوئی ہے۔ مگر اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس دور میں رہتا ہے۔''

''وہ اپنے علاقے میں صاحب اقتدار ہے اور اپنے عہد میں رہتا ہے اس وقت میں اور تم بھی چودھری نور محمد کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں ۔۔ یہ لوگ دیہات کو پسماندہ رکھنا چاہتے ہیں سکو ل نہیں بناتے اور سڑکیں نہیں بننے دیتے۔پکی سڑک کے ساتھ علم و آگہی کی روشنی پھیلتی ہے جس میں ان کے اصلی چہرے بے نقاب ہوتے ہیں۔''

وہ دیر تک بولتی رہی اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے کلاس لئے کئی روز ہو گئے ہیں۔ پیراں دتہ چلا گیا تو میں اسے تسلی دیتا ہوا گھر لے آیا۔۔

مجھے ڈر تھا کہ وہ رات بھر گھر والوں کا مغز چاٹتی رہے گی مگر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پیراں دتہ پھر آ گیا۔ کہنے لگا۔

''اجازت مل گئی ہے جی۔''

''وہ کیسے؟''

''میں نے انہیں بتایا کہ آج کل سڑک بہت خراب ہے۔جا بجا گڑھے پڑے ہوئے ہیں اور گرد و غبار سے کپڑے خراب ہو جاتے ہیں۔''

''پھر؟''

''پھر انہوں نے کالو کو بلا کر صبح سویرے گھوڑے پر زین ڈالنے کا حکم دے دیا۔''

''کون سے گھوڑے پر؟'' وہ چونک کر بولی۔

''اپنے مشکی گھوڑے پر۔۔ بڑی اچھی نسل کا ہے۔'' پیراں دتہ نے جواب دیا۔

میں نے پیراں دتہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے صبح تانگہ لانے کی تاکید کر کے رخصت کر دیا مگر شکیلہ کے ماتھے پر اب تک بل پڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگی۔

''وہ سواریوں والے تانگے میں نہیں بیٹھتا۔۔ ہونہہ۔۔ ڈرٹی ارسٹو کریٹک ایٹی چیوڈ''

میں نے اس کے کان میں کہا۔ ''اب غصہ تھوک دو۔۔ اس بے چارے نے تمہیں دیکھا نہیں ہے ورنہ سواریوں والے تانگے میں بیٹھنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔''

اپنے بے پناہ حسن کی تعریف سے اس کا سارا غصہ اتر گیا اور وہ مسکرانے لگی۔ ''مائی فٹ۔''

اگلی صبح جب ہم تانگے میں سوار ہو کر گاؤں سے تھوڑی دور پہنچے تو ہم نے دیکھا آگے آگے سڑک پر چودھری نور محمد اپنے گھوڑے پر سوار کلف دار طرہ لہراتا بڑی شان سے جا رہا تھا۔ گھوڑے کے سموں سے اٹھنے والی گرد سے بے نیاز اس کا ملازم کالو پیچھے پیچھے بھاگتا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ راستہ چلتے اور کھیتوں میں کام کرتے کسان اسے سلام کرتے۔۔ خیریت دریافت کرتے اور دعائیں دیتے۔ پیراں دتہ نے تانگے کی رفتار کم کر دی تھی۔ سورج نکلتے ہی خونخوار دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی اور آنے والی سخر دوپہر کے خوف سے چرند پرند سہمے ہوئے تھے۔ ہم دھوپ تیز ہونے سے پہلے اڈے پر پہنچ جانا چاہتے تھے مگر پیراں دتہ چودھری نور محمد سے آگے نکلنے کی گستاخی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کالو کو گھوڑے کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر ہمیں اس پر بہت ترس آ رہا تھا مگر ہم چودھری کے کسی معاملہ میں دخل نہیں دینا چاہتے تھے لیکن شکیلہ کے کہنے پر پیراں دتہ نے کالو کو تانگے میں سوار ہونے کے لئے آواز دے دی۔ چودھری نے مڑ کر خشمگیں نگاہوں سے تانگے کی طرف دیکھا پھر کالو کو تانگے میں سوار ہونے کی اجازت دے دی۔

نہر کے آخری پل پر چودھری کسی راہگیر کے پاس رک کر باتیں کرنے لگا تو ہم رسمی علیک سلیک کر کے اس کے قریب سے گزر گئے۔ وہ بولی۔

''دیکھنے میں تو خاصا مہذب اور با وقار لگتا ہے۔''

میں نے کالو کی موجودگی کا احساس دلا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا تو وہ چپ ہو گئی مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ اندر ہی اندر کلاس لے رہی تھی۔

اڈے پر خلاف معمول بے حد رش تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بس آتی مگر رکے بغیر نکل جاتی تھی لوگ گرمی سے بے حال ہو رہے تھے اور ہر شخص جلد از جلد سوار ہو کر اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اب چودھری نور محمد بھی اڈے پر پہنچ گیا تھا اور گھوڑے کی لگام کالو کے ہاتھ میں تھما کر بس کا انتظار کرنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا تھا۔

کافی دیر کے اکتا دینے والے طویل انتظار کے بعد ایک بس آ کر رکی سارے ہجوم نے ایک ساتھ ہلہ بول دیا مگر کنڈیکٹر نے سب کو پیچھے دھکیل دیا اور صرف دور کی سواریوں کو سوار ہونے کی اجازت دی۔ خوش قسمتی سے ہمیں دور جانا تھا اس لئے ہمیں سوار کرا لیا گیا اور نسبتاً قریب کی سواریاں جن میں چودھری نور محمد بھی شامل تھا دروازے سے چمٹی چیختی چلاتی اور منت سماجت کرتی رہیں۔ لوگ بار بار اندر گھسنے کی کوشش کرتے اور کنڈیکٹر انہیں دھکے دے کر سوار ہونے سے روکتا رہا۔ اس دھکم پیل میں چودھری نور محمد کی طرے دار دستار سر سے اتر کر نیچے گر گئی اور گرد سے اٹ گئی۔ اس نے جلدی سے اسے اٹھایا اور جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہن لیا اور بس کے دروازے کی طرف لپکا۔

جب کنڈکٹر کو یقین ہو گیا کہ دور کی سب سواریاں سیٹوں پر بیٹھ گئی ہیں تو اس نے قریب کی دوسری سواریوں کو بھی اندر آنے اور کھڑے ہو کر سفر کرنے کی اجازت دے دی۔

بس روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا۔ چودھری نور محمد نے اپنی دستار دونوں ہاتھوں سے تھامی ہوئی تھی اور دور اور نزدیک کی عام سواریوں کے درمیان پھنسا ہوا نیم ایستادہ تھا اور شکیلہ کے گلاب ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کی چٹک تھی!!

***

پانی میں گھرا ہوا پانی

چکنی مٹی سے گھوڑے بیل اور بندر بناتے بناتے اس نے ایک روز آدمی بنایا اور اسے سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا۔

سخر دوپہر تھی، چلچلاتی دھوپ کے شعلے ویران اور کلر زدہ زمین پر جگہ جگہ رقص کر رہے تھے۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ چرند پرند پناہ گاہوں میں چھپ گئے تھے۔ شرینہہ(سرس) کا بوڑھا پیڑ دھوپ میں چپ چاپ کھڑا جھلس رہا تھا اور زیناں اب تک روٹی لے کر نہیں آئی تھی۔

اس نے گاؤں سے آنے والے راستے پر دور دور تک دیکھا مگر چلچلاتی دھوپ کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا، اس نے چلم کو ٹٹولا وہ گرم تھی، مگر اس نے کش لیا تو اس کے منہ میں جل چکے تمباکو کی بو آئی۔ وہ اٹھ کر سائے میں آ گیا اور زیناں کی راہ دیکھنے لگا۔

ایک مدت سے اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسا باوا بنائے جسے کم از کم زیناں دیکھ کر ضرور دنگ رہ جائے اور اس کی کاریگری کی تعریف کرے۔ اس کے ذہن میں جوانی کے دنوں سے ایسے بہت سے لوگوں کی شکلیں اور قامتیں محفوظ تھیں،جن سے وہ کبھی نہ کبھی متاثر ہوا تھا۔وہ چاہتا تھا دیکھے ہوئے ان بہت سے چہروں اور جسموں کو توڑ کر ان کے خمیر سے ایک نہایت عمدہ قد و قامت اور چہرے مہرے والا آدمی بنائے جو ہر طرح سے مکمل اور نادر ہو۔ اس نے اپنے ذہن میں اسے کئی بار مکمل کیا تھا مگر بار بار اس کی شکل و صورت اور ساخت اس کے ذہن سے اتر جاتی یا دھندلا جاتی۔ وہ اسے مکمل یکسوئی اور اطمینان سے بنانا چاہتا تھا، لیکن اطمینان نصیب نہ ہوتا تھا اسے ہر گھڑی زیناں کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کئی بار اس نے کوشش بھی کی مگر پھر اسے ادھورا چھوڑ دیا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ اسے اس وقت یاد آتا جب مٹی کم ہوتی یا اچھی نہ ہوتی اور کبھی اس وقت جب وہ رات کو کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹ کر حقہ گڑگڑا رہا ہوتا۔ مگر آج گھوڑے، بندر اور بیل بناتے بناتے اچانک اس کے دل میں درد زہ کی سی ٹیس اٹھی اور اس نے اسے بنایا اور سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا۔

بیٹھے بیٹھے اس نے شرینہہ کی سوکھی ہوئی پھلی لے کر مروڑی اور بیج نکال کر گننے لگا، اسے خیال آیا کہ بوڑھے شرینہہ کے سوکھنے یا ٹوٹ جانے سے پہلے دوسرا شرینہ اگا دینا چاہیے لیکن پھر وہ کسی انجانے خیال سے اداس ہو گیا۔ اسی لمحے زیناں روٹی لے کر آ گئی، اس نے ہمیشہ کی طرح اطمینان کا سانس لیا پھر گھڑے سے پانی کا پیالہ بھرا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ زیناں اس کے سامنے بیٹھ کر دوپٹے کے پلو سے پنکھا کرنے اور نظر نہ آنے والی مکھیاں اڑانے لگی پھر بولی :

''تمباکو نہیں ملا۔۔ دکان والا پچھلے پیسے مانگ رہا تھا۔۔ تم کہو تو رمجے سے کچھ۔۔!''

''نہیں۔'' اس نے چھاچھ کا پیالہ خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں شام کو آ کر خود اس سے بات کر لوں گا فی الحال ایک آدھ چلم ہے کام چل جائے گا۔''

''میں تو کہتی ہوں۔'' زیناں شرینہہ کی ڈالیوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ کو ہاتھ کی پشت پر روک کر بولی۔ ''دوپہر کو گھر آ جایا کرو۔۔ درخت بوڑھا ہو گیا ہے اور لوگوں نے اس کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر اسے اور بھی ٹنڈ منڈ کر دیا ہے۔''

''یہ بڑا برکت والا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ نہ ہوتا تو بدھائی مانگنے والوں کو گھر تلاش کرنے میں دقت پیش آتی، سارے گاؤں میں یہی ایک تو شرینہہ ہے۔''

وہ روٹی کھا چکا تو وہ برتن سمیٹنے لگی۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ بے قراری سے بولا۔

''زیناں میں نے آج ایک کمال کی چیز بنائی ہے۔''

''کیا؟''

''بوجھو تو۔''

''مرتبان'' وہ بولی۔ ''تم نے اچھا کیا جب بھی لسی مانگنے جاتی ہو چودھرانی مرتبان کا ضرور پوچھتی ہے۔''

''وہ بھی بنا دوں گا لیکن یہ ایک دوسری چیز ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''مجھے پتہ چل گیا، جھانواں۔''

وہ بھی ہنس پڑا کہنے لگا۔ ''جھانواں تو نہیں پر ایک لحاظ سے جھانواں ہی سمجھو کیونکہ اس میں عقل تمیز نہیں ہے۔۔ میں نے باوا بنایا ہے۔''

''باوا؟''

''ہاں باوا اور ایسا بنایا ہے کہ بس جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہے تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ دنیا میں تم سے زیادہ خوبصورت چیزیں بھی ہیں یا بنائی جا سکتی ہیں۔''

''اچھا چلو دکھاؤ۔'' وہ اشتیاق سے بولی۔

وہ اسے لے کر وہاں آیا جہاں اس نے ساری چیزیں دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھی تھیں مگر وہ یہ جان کر پریشان ہو گیا کہ گھوڑے، بیل، بندر اور دوسری سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں مگر آدمی وہاں نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی دور دور تک چلچلاتی دھوپ اور چمکتا ہوا کلر پھیلا ہوا تھا کہیں آدمی نہ آدم زاد۔۔ پرندے تک گھونسلوں اور درختوں کی گھنی شاخوں کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ وہ پریشان ہو گیا۔

''پتہ نہیں آدمی کدھر گیا۔''

''سو بار کہا ہے۔'' زیناں بولی۔ ''دوپہر کے وقت آرام کر لیا کرو مگر تم مانتے ہی نہیں، مجھے ڈر ہے کسی روز تم سچ مچ سودائی ہو جاؤ گے۔''

''تمہیں یقین نہیں آیا۔'' وہ شکایت آمیز لہجے میں بولا، ''خدا کی قسم میں نے تمہارے آنے سے ذرا پہلے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا، آنکھوں سے بنا ہوا دیکھا اور یہاں رکھا تھا اور ابھی تو وہ اچھی طرح سے سوکھا بھی نہیں تھا۔''

''کہیں چلا گیا ہو گا۔'' زیناں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیا پتہ تمہارے لئے تمباکو لینے گاؤں چلا گیا ہو۔''

اس نے نظریں جھکا لیں اور نڈھال نڈھال ساشرینہہ کے نیچے آ گیا، زیناں کچھ دیر خاموش رہی پھر ناخنوں سے درخت کے تنے کی کھال کھرچتے ہوئے بولی۔

''تو تم نے سچ مچ باوا بنایا؟''

''تو اور کیا، میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں ؟''

''اگر ایسا ہے تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' زیناں بولی۔ ''تم گھر چلو۔۔ دیکھو یہ وقت ٹھیک نہیں ہوتا، ویسے بھی یہ سنسان جگہ مجھے تو پکی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دن میں واپس جا رہی تھی تو ٹبے کے پاس سے مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہو۔۔ میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہیں تم غلط نہ سمجھو۔۔ اللہ کی مخلوق۔''

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی :

''پتہ ہے ایک بار ابا گدھے پر سوار کہیں جا رہا تھا اس نے دیکھا اس کے آگے آگے ایک اور شخص بھی گدھے پر سوار جا رہا ہے پھر دونوں غائب ہو گئے آدمی بھی اور گدھا بھی۔''

ابا نے اتر کر دیکھا وہاں تک گدھے کے پاؤں کے نشان تھے جہاں سے وہ غائب ہوا تھا۔

''میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا۔'' وہ بولا اور پھر انہوں نے باوے کا کیا کرنا تھا؟

''اللہ جانے۔۔ میں تو کہتی ہوں گھر چلے چلو۔''

''نہیں زیناں ۔۔ میں گھر میں چھپ کر کب تک بیٹھ سکتا ہوں اور پھر تمہیں پتہ ہے مجھے گاؤں میں آ کر وحشت ہوتی ہے۔پورے گاؤں میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہے جو مجھے آدمی سمجھتا ہو۔لے دے کے ایک رمجا ہے وہ بھی تمہاری وجہ۔۔''

''ایسی باتیں نہ کیا کرو دتےؔ؟'' وہ اداس لہجے میں بولی۔ ''مجھے پتہ ہے کہ تم نفرتوں کے ستائے ہوئے اور کئی پشتوں سے محبت کے لئے ترسے ہوئے ہو،لیکن میں جو ہوں ۔۔ میری طرف دیکھو۔۔ میں بھی تو ہوں ۔۔ تم تو پھر دن بھر کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہو۔''

'' اور تم نے جو اتنے سارے گھگھو گھوڑے پڑچھتی پر سجا کر رکھے ہیں ؟''

''ہاں رکھے تو ہوئے ہیں مگر کیا فائدہ؟''

''لیکن تمہیں رب نے اتنا حسن دیا ہے کہ تم محض شیشہ دیکھ کر بھی وقت گزار سکتی ہو۔''

زیناں کی سمجھ میں نہ آیا روئے یا اترائے۔کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ ''دتے تم پانی میں گھرے ہوئے پانی ہو اور میں آگ میں گھری ہوئی آگ۔تمہیں کیا پتہ آگ کیا ہوتی ہے؟ تم آوی میں چیزیں پکاتے ہو لیکن تم نے خود آوی میں پک کر کبھی نہیں دیکھا۔''

''میں تو تمہیں پہلے ہی ناری سمجھتا ہوں۔''

''نہ اڑیا۔۔ مجھے خاکی ہی رہنے دے۔۔ میں تو ایک بھینس اور ایک گدھی کے عوض۔''

''بھینس اور گدھی کا ذکر بار بار نہ کیا کرو اگر میرے پاس قارون کا خزانہ ہوتا اور تم مجھے اس کے بدلے مل جاتیں تو بھی میں خود کو خوش قسمت سمجھتا۔''

’’ذکر کیوں نہ کیا کروں ۔۔ بھینس اب تیسرے چوتھے سوئے میں ہوتی اور گدھی۔‘‘

’’تم نہ آتیں تو میرا کیا بنتا۔۔ برادری والوں نے تو غریب سمجھ کر صاف جواب دے دیا ہوا تھا۔۔ میرا جنازہ‘‘

’’ہاں تمہاری روٹی کون پکاتا۔ کپڑے کون دھوتا اور تمہارا جنازہ کیسے جائز ہوتا؟‘‘ وہ اداس اور پریشان ہو گئی۔

وہ بولا۔ ’’اب تم گھر چلی جاؤ۔۔ میں اسے تلاش کرتا ہوں۔‘‘

’’دوسرا بنا لو۔‘‘ وہ برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔ ’’آخر ایک باوا ہی تو تھا۔‘‘

’’دوسرا تو میں کسی بھی وقت بنا لوں گا۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’لیکن پہلا کدھر گیا۔‘‘

’’ہاں تم ٹھیک کہتے ہو وہ پہلا والا کدھر گیا۔‘‘

’’عجیب بات ہے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔‘‘

’’کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی لیکن میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، اللہ اپنا فضل کرے۔۔ اچھا میں جاتی ہوں۔‘‘

وہ اٹھ کر چل دی۔۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، گم صم کھڑا رہا۔ جب وہ ٹبے کے پاس پہنچ گئی تو اس نے اسے آواز دی۔

’’زیناں ۔۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔‘‘

مگر زیناں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔پتہ نہیں وہ مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی تھی یا آواز کی سرحد پار کر چکی تھی اسے پشیمانی ہونے لگی۔ اس نے زیناں کو پہلے کیوں تاکید نہ کر دی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرے، لوگ اسے پہلے ہی بیوقوف اور حقیر جانتے تھے، نئی بات سن کر اور ہنسی اڑائیں گے اور اس کا جینا دو بھر کر دیں گے۔ پھر اس نے چشم تصور سے دیکھا زیناں گلی کے موڑ پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

’’رمجے۔۔ تیرے بھائیے نے آج آدمی بنایا۔‘‘

’’آدمی بنایا؟‘‘

’’ہاں اور وہ غائب ہو گیا۔‘‘

’’کون بھائیا؟‘‘

’’نہیں آدمی۔‘‘

’’بھائیا بھی تو آدمی ہے۔۔ کہو ہے کہ نہیں۔‘‘

’’ہے۔۔ مگر اس نے باوا بنایا تھا۔‘‘

’’دیکھ زینی۔۔ بجھارتیں نہ ڈالا کر۔۔ بھائیے کا باوا گم ہو گیا ہے تو تو اسے دوسرا بنا دے تو بھی تو کاریگرنی ہے۔‘‘

اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ورنہ زیناں پتہ نہیں کیا کہہ دیتی۔ شام کو وہ گاؤں پہنچا تو اس کا خدشہ درست ثابت ہوا، سارے گاؤں میں باوے کے گم ہو جانے کی خبر پھیل چکی تھی۔

تنور، چوپال، مسجد اور بڑی دکان پر ہر جگہ لوگ اس کی سادگی اور بیوقوفی پر ہنستے اور وہ جدھر سے گزرتا اسے چھیڑتے۔

’’سنا ہے دتے۔۔ تیرا بندہ گم ہو گیا ہے؟‘‘

’’یار دتے۔۔ بڑا افسوس ہے تو نے ساری عمر میں صرف ایک باوا بنایا تھا وہ بھی چیل اٹھا کر لے گئی۔‘‘

مولوی صاحب نے لاحول پڑھ کر کہا۔ ’’جب شرک کے کام کرو گے تو ایسا ہی ہو گا۔ کم بخت بت بناتے ہو، یاد رکھو، اللہ ایسے لوگوں کی مت مار دیتا ہے۔‘‘

اسے بے حد رنج ہوا۔۔ زیناں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے زیناں پر بہت غصہ آیا مگر وہ ضبط کر گیا۔ اسے پہلے ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ اس سے روٹھ نہ جائے اس کے پاس زیناں کو اپنے پاس رکھنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں تھا۔ پتہ نہیں کاغذ کی یہ ناؤ اب تک کیسے سلامت تھی۔ وہ ہر روز گھر آتا اور اسے گھر میں پا کر متعجب ہوتا تھا۔۔ اسے دوپہر کو اکثر شبہ رہتا تھا لیکن وہ خلاف توقع ہر روز روٹی لے کر آ جاتی تھی۔ باوے والی بات پر اس نے گاؤں والوں کی پھبتیاں، طعنے اور باتیں سنیں اور برداشت کیں اور بظاہر ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے وہ زیناں اور گاؤں والوں سے خود مذاق کر رہا تھا مگر اندر ہی اندر اس کے دل میں گرہ سی پڑ گئی اور اسے عجیب طرح کی چنتا لگ گئی، آخر وہ کدھر گیا؟ کون لے گیا؟

زیناں کو اس کی بات کا یقین آ گیا اور وہ جلد ہی بھول گئی۔ لوگ بھی بھول گئے مگر وہ پریشان اور اداس رہنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اس کے اور زیناں کے سوا وہاں کوئی نہیں آیا تھا تو وہ کدھر گیا۔ زیناں اس سے پریشانی اور اداسی کا سبب پوچھتی تو وہ اسے ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال دیتا۔

وہ گھگھو گھوڑے بناتا اور آوی میں پکاتا اور زیناں سر پر کھاری رکھے آس پاس کے دیہاتوں میں گلی گلی گھومتی اور کھلونے بیچتی رہی۔۔ شرینہہ کی ٹہنیاں کٹ

کٹ کر گاؤں کے مختلف دروازوں پر سجتی رہیں۔ بہت سا وقت گزر گیا مگر اس کی الجھن دور نہ ہوئی۔

اس دوران اس نے شہر جا کر جیوتشی سے پوچھا۔ سائیں بہار شاہ کے میلے پر طوطے سے فال بھی نکلوائی اور پیر ہدایت اللہ سے تعویذ بھی لیا مگر اس کی الجھن دور ہوئی نہ اس کے ذہن سے باوے کا خیال محو ہوا کئی بار اس نے سوچا کہ وہ پھر سے بنا لے۔ سامنے بیٹھ کر سکھائے اور پکائے لیکن یہ سوچ کر اسے ہول آتا تھا کہ اگر وہ اس کے دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا تو؟

اس نے ہرپور میں سے اچھے اچھے کھلونے نکال کر گھر کی پڑچھتی پر محفوظ کئے ہوئے تھے اگر باوا پڑچھتی پر پڑا پڑا غائب ہو گیا تو وہ سچ مچ پاگل ہو جائے گا اور زیناں تو خوف اور دہشت کے مارے بیہوش ہو جائے گی اور گھر کے در و دیوار سے خوف کھانے لگے گی۔

موسم آتے جاتے رہے۔ رتیں بدلتی رہیں۔ بہار کے موسم میں نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں اور برسات کے دنوں میں بادل امنڈ امنڈ کر آتے رہے۔ پھر ایک موسم برسات میں آسمان سے اس قدر پانی برسا کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ سیلاب کا پانی اترا تو کلر زدہ زمین پر جا بجا گھاس اور طرح طرح کی بوٹیاں اگ آئیں۔

ایک ایسی صبح کو جب منڈیروں پر کوے کلول کر رہے تھے اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں دتے کے گھر سے چلم کے لئے جلائے گئے اپلوں کا دھواں اور زیناں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں جو تھوڑی دیر بعد گھنگھریالے قہقہوں میں تبدیل ہو گئیں ۔۔ اور اسے پتہ چلا کہ اس کے گھر کے آنگن میں ایک ننھا سا شرینہہ اُگ آیا ہے۔پتہ نہیں شرینہہ کے بیج کب اور کیسے گھر میں آئے تھے۔ کیا خبر بیجوں کی کوئی پھلی زیناں کی کھاری یا چنگیر میں آ گئی ہو، کوئی بیج اس کے اپنے جوتوں کے ساتھ چپک کر وہاں پہنچ گیا ہو یا پھر ہوا کے جھونکے اسے اڑا لائے ہوں۔

’’شرینہہ برکت والا درخت ہے۔‘‘ اس نے سوچا ’’ اور اس کی نسل گاؤں میں ختم نہیں ہوئی بوڑھا شرینہہ ابھی کھڑا تھا کہ دوسرا اُگ آیا۔‘‘

پڑچھتی پر رکھے ہوئے کھلونوں کی گرد صاف کی گئی اور گھر کے اندر سارے فرش پر گوبر کا لیپ کیا گیا۔

زیناں ٹھیک ہو گئی اور کام کاج کرنے لگی تو وہ بھی ایک صبح کام پر روانہ ہوا۔ زیناں نے کہا۔ ’’دوپہر کو گھر آ جانا دتے۔۔ وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔‘‘

’’کیوں ٹھیک نہیں ؟‘‘

’’تمہیں یاد ہے وہ باوا؟‘‘

’’باوا؟‘‘ وہ چونک پڑا۔

’’ہاں وہی باوا۔۔ جس کے غم میں تم اتنا عرصہ اداس اور پریشان رہے۔‘‘

’’تو تم جانتی ہو؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’ اور تمہیں یقین ہے میں نے بنایا تھا۔‘‘

’’ہاں مجھے یقین ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہی ایسا آدمی ہے جو ان چیزوں سے بھی محبت کر سکتا ہے جو اس نے نہ بنائی ہوں۔‘‘

اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے زیناں کی طرف دیکھا اور اوزار اٹھا کر باہر نکل گیا۔

***

پے انگ گیسٹ

وہ اس گھر میں اتنے عرصے سے بے انگ گیسٹ کے طور پر رہ رہا ہے کہ اب وہ اسی کو اپنا گھر سمجھنے لگا ہے۔

وہ بھیا سے اپنے گھر کا فرد ہی سمجھتے ہیں۔

اڑوس پڑوس میں اکثر نئے لوگ آ گئے ہیں۔ ویسے بھی کسی کو یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں کہ اس گھر میں وہ کس حیثیت سے رہتا ہے۔عام لوگ اسے گھر کا مالک ہی سمجھتے ہیں۔ وہ خود بھی اکثر بھول جاتا ہے کہ وہ گھر کا مالک ہے یا پے انگ گیسٹ۔ ویسے بھی لینڈ لیڈی بیگم حمید اور اس کی بیٹیوں کو اس نے کبھی غیر نہیں سمجھا اور نہ ہی کبھی حساب کتاب کے جھنجھٹوں میں پڑا ہے۔ اسے معقول تنخواہ ملتی ہے اور وہ جو کچھ کماتا ہے، ان کے حوالے کر دیت ہے اس کے بدلے میں وہ اس کی ہر طرح سے خدمت کرتے۔ اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے اور اس کے بے حد عزت کرتے ہیں اور ان کے ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اسے اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیں لیکن وہ کچھ عرصے سے خود کو ہوم سک محسوس کر رہا ہے اور اس گھر سے اس کا دل اچاٹ ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے مصرف میں کوٹھی کا بہترین حصہ ہے۔ دفتر سے واپسی پر کار ہارن سنتے ہی ملازم بیگ تھامنے کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ فرصت ہو تو بیگم حمید ڈرائنگ روم کے دروازے پر آ کر مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہیں۔ بیگم حمید کی جواب بیٹیاں دو پٹے ٹھیک کرتی ہوئی باری باری آ کر سلام کرتی ہیں مگر سلام کرتے ہی یوں الٹے پاؤں جلدی جلدی لوٹ جاتی ہیں جیسے آدمی فقیر کے سامنے سکہ پھینک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ بس ایسی ہی باتوں سے کبھی کبھی کا دل اداس ہو جاتا ہے اور اسے اپنا گھر یاد آنے لگتا ہے۔

بیگم حمید کی مسکراہٹ اور اس کی بیٹیوں کے سلام وصول کر کے وہ اپنے کمرے میں پہنچتا ہے تو میز پر کھانا چنا ہوتا ہے۔ شروع شروع میں جب وہ پرہیزی کھانا نہیں کھاتا تھا اسے کھانے کے لئے ڈائننگ روم میں بلایا جاتا تھا مگر اب کھانا اس کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا جی چاہتا ہے وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے۔ کھانے کے ساتھ گپ شپ ہوتی رہے اور وہ ماں بیٹیاں اس سے ایسی باتیں کریں جس سے دفتر کے کام کی بوریت اور تھکن دور ہو جائے۔ مگر وہ سب اس کا قدر احترام کرتی ہیں کہ اس کی موجودگی میں بلند آواز سے بات بھی نہیں کرتیں۔

اس کے گھر میں داخل ہونے کے بعد ریڈیو کی آواز دھیمی کر دی جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کرتی ہیں اور دروازے کھولنے اور بند کرنے میں بھی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ زیادہ شور نہ ہو۔

وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے وہ سجے سجائے بیڈ روم میں نہیں ویران قبرستان میں لیٹا ہوا ہے۔ شام کو وہ کمرے کی قید سے رہائی پا کر ٹہلتا ہوا کلب چلا جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لے بھول جاتا ہے کہ اداسی کی چلچلاتی دھوپ نے اس کا بدن جھلسا دیا ہے لیکن جونہی وہ رات کو کلب سے باہر آتا ہے جمائیاں لیتی ہوئی تاریکی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے کلب کے صدر دروازے کے سامنے اکڑوں بیٹھی ہوئی اکتاہٹ کی خارش زدہ کیتا، اس پر زور زور سے بھونکنے لگتی ہے وہ گھر میں قدم رکھتا ہے تو در و دیوار سے آدم بو آدم بو کی آوازیں آتی ہیں۔ ہنستے بستے گھر میں چپ کی صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ دوپٹے ٹھیک کئے جاتے ہیں۔ دوپٹے ٹھیک جاتے ہیں۔ فرش پر سلاموں کے سکے کھنکتے ہیں اور ٹیلیویژن کا گلا رندھ جاتا ہے۔

رات کے کھانے کے بعد اس کا جی چاہتا ہے وہ سب یا ان میں سے کوئی اس کے پاس آئے اور اس سے باتیں کرے لیکن وہ سب اپنے کمروں میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ کوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے اکتا جاتا ہے تو دوسری کتاب اٹھا لیتا ہے کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے بیگم حمید اس کی خیریت معلوم کرنے آ جاتی ہیں لیکن ان کی باتیں اس کے لئے غیر دلچسپ اور بور ہوتی ہیں وہ گھر کے اخراجات، مہنگائی، خریداری، شادیوں اور لڑکیوں کے رشتوں کی باتیں کرتی ہیں ہیں پھر خود ہی جمائیاں لیتی ہوئی اکتا کر چلی جاتی ہیں۔ البتہ جب کبھی اس کی لڑکیاں بھی باری باری آتی ہیں۔ ٹیلیفون کر کے فوراً ڈاکٹر کو بلا لیا جاتا ہے یا ہسپتال سے ایمبولینس منگائی جاتی ہے۔ ملازم کو سخت تاکید کی جاتی ہے کہ وہ رات بھر اس کے پاس رہے۔ وقت پر دوا پلائے، پاؤں دبائے اور ایمرجنسی کی صورت میں بیگم حمید کو جگا کر اطلاع دینے میں تامل نہ کرے۔

بیمار ہو کر اس کے دل میں عجیب سی خواہش جاگتی ہے اس کا جی چاہتا ہے بیگم حمید خود اس کا سر دبائیں۔ آصفہ، رفیعہ اور فریدہ پاس رہیں اس سے باتیں کریں اور اپنے ہاتھ سے سے دوا پلائیں۔ لیکن پھر اسے یاد آ جاتا ہے کہ وہ اس گھر میں پے انگ گیسٹ ہے۔ اور گھر والوں کو اس کی تیمار داری اور خدمت گزاری کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں ان کی اپنی مصروفیتیں اور دلچسپیاں ہیں۔ بیگم حمید کو خریداریوں اور گھر کے کام کی نگرانی سے فرصت نہیں ملتی۔ پھر آئے دن کوئی نہ کوئی ملازم بیمار ہو جاتا یا چھٹی پر چلا جاتا ہے بڑی لڑکیوں کے رشتے آ رہے ہیں اور بیگم حمید مہمانوں کی خاطر تواضع اور جہیز وغیرہ کی الجھنوں میں لگی رہتی ہیں۔ آصفہ کو فلموں اور گانوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ وہ نئے نئے ریکارڈ اور ٹیپ جمع کرتی اور سنتی رہتی ہے۔ اسے پتہ چلا ہے کہ وہ خود بھی اچھا گا لیتی ہیں۔ شاید ناچ بھی لیتی ہو کیونکہ اس کا جسم رقص کے لئے بے حد موزوں نظر آتا ہے۔ اس کا

جی چاہتا ہے جب اس کا کومل بدن تھرکتا اور لمبی سیاہ زلفیں رخساروں پر بکھری ہوں اور وہ بند کمرے میں اکیلی ناچ رہی ہو وہ اسے چھپ کر دیکھے۔ کئی بار وہ اس ارادے سے آصفہ کے کمرے بڑھا مگر ہر مرتبہ گھر کے لوگوں اور ملازموں نے اسے یوں گھیر لیا ہے جیسے وہ اسے اغوا کرنے جا رہا ہے۔

منجھلی رفیعہ کو بناؤ سنگار اور فیشن سے گہرا شغف ہے وہ ہر وقت کریموں، پاؤڈروں، رنگوں، خوشبوؤں، لباسوں اور اپنی فیشن ایبل سہیلیوں میں گھری رہتی ہے اور اس کا جی چاہتا ہے ہر وقت دلہن سی نظر آنے والی رفیعہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لئے جائے اور ہوٹلوں، پارکوں اور سیر گاہوں میں لوگ اسے حسد و رقابت کی نظروں سے دیکھ دیکھ کر جلیں مگر رفیعہ اس کے سامنے آتی ہے تو نظریں نیچی کئے رکھتی ہے اور اپنے خوبصورت بالوں اور کھلے گلے کی قمیض کا اوپر کا حصہ بار بار دوپٹے سے ڈھانپتی رہتی ہے۔

فریدہ سب سے چھوٹی مگر اپنی عمر سے دو گنا زیادہ جوان ہے۔ اسے دیکھ کر ندامت سے اس کی گردن جھک جاتی ہے۔ فریدہ کی شکل اس سے بے حد ملتی جلتی ہے اور وہ اس ے اور بیگم حمید کے لئے بد نامی کا نیون سائن معلوم ہوتی ہے۔ گھر میں آنے جانے والے یہ نیون سائن دیکھتے اور پکار اٹھتے ہیں۔ ’’فریدہ کی شکل ہو بہو آپ پر گئی ہے‘‘۔

فریدہ کو دیکھ کر اسے لگتا ہے جیسے وہ کی برس چھوٹا ہو گیا ہو اور اس کی جنس تبدیل ہو گئی ہو۔ کئی بار غسل خانے کے آئینے میں اس نے اپنے جسم پر فریدہ کے جسم کر ٹکڑے چپکا کر دیکھے ہیں اور شرم سے پانی پانی ہوا ہے۔ شاید فریدہ بھی غسل خانے میں اپنے جسم کو اسی طرح دیکھتی اور پانی پانی ہوتی ہے کیونکہ وہ اس سے شرمائی شرمائی اور جھینپی جھینپی سی رہتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے وہ اس سے بے تکلفی سے ملے۔ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کوئی ایسی فرمائش کرے جیسے جسے پورا کرنا اس کے لئے آسان نہ ہو لیکن فریدہ بھی اپنی بہنوں کی طرح اس سے دور دور رہتی اور اس کی بے حد عزت کرتی ہے۔

اسے اس گھر میں جس میں وہ کئی برسوں سے پیئنگ گیسٹ کے طور پر رہ رہا ہے ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ ٹائم پیس کا الارم اسے ہر وقت جگا دیتا ہے۔ غسل خانے میں اسے گرم پانی رکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ غسل خانے سے باہر آتا ہے تو استری کئے ہوئے کپڑے اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ وہ گھنٹی بجاتا ہے تو ملازم ناشتہ لے کر حاضر ہو جاتا ہے۔ اسے کسی بھی چیز کے لئے کہنا نہیں پڑتا۔ ضرورت کی ہر چیز اسے خود بخود مل جاتی ہے لیکن اس کا دل خوشی سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ سب اس کا احترام کرتے۔ اس کے آرام کا خیال رکھتے۔ اور اس کی ہر بات بے چون و چرا مان لیتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کوئی اس سے لڑے جھگڑے۔ اسے گالیاں اور طعنے دے۔ دیر سے گھر آنے پر با پرس کرے اور اس سے پوری نہ کی جا سکنے والی فرمائش کرے مگر پھر اسے یاد آ جاتا ہے کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں۔ وہ یہاں پے انگ گیسٹ ہے۔

سب اپنے اپنے کمروں میں محو خواب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں خود کو تنہا اور اداس محسوس کرتا اور کہیں بھاگ جانا چاہتا ہے لیکن اس گھر میں اسے جو آرام میسر ہے وہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن گیا ہے اسے اپنے اردگرد نظر نہ آنے والے مسلح پہریدار کھڑے محسوس ہوتے ہیں لیکن وہ زنجیریں توڑ دینا اور مسلح پہرے داروں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جانا چاہتا ہے۔ اس خوبصورت اور پر تکلف ماحول میں اس کا دم گھٹ رہا ہے وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔

پھر ایک روز بیگم حمید کے ہاں بہت سے مہمان آتے ہیں۔ رات دیر تک دروازے کھلنے اور بند ہونے اور موٹروں کے انجن سٹارٹ ہونے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ وہ اٹھ کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا ہے کہ دستک دئیے بغیر بیگم حمید اس کے کمرے میں گھس آ تی ہیں۔ شاید وہ کسی سے لڑ کر آ رہی ہیں۔ وہ آتے ہی غصے میں لتھڑی ہوئی آواز سے اس پر حملہ کرتی ہیں۔ ''شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی مگر آپ کو کچھ فکر نہیں ''

''شادی!...... کس کی شادی''؟ وہ گھبرا کر پوچھتا ہے۔

بیگم حمید کو اور غصہ آ جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں ''حمید صاحب!... آپ تو اس گھر میں مہمان آئے لگتے ہیں ''

''صرف مہمان نہیں '' وہ تصحیح کرتا ہے ''میں پے انگ گیسٹ ہوں ''

***

بیک مرر

یہ جس بدقسمت مسافر بس کی کہانی ہے وہ آخر میں حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ بہت سے آدمی ہلاک ہو جاتے ہیں باقی زخمی ہو کر پہلے سڑک کے کنارے اور پھر ہسپتالوں میں تڑپتے اور کراہتے رہتے ہیں۔ حادثے کے وقت راہگیر ان کا سامان لوٹ لیں گے ان کی جیبیں خالی کریں گے اور ان کی زندہ اور مردہ کلائیوں سے گھڑیاں اور چوڑیاں اتاریں گے۔ ڈرائیور چھلانگ لگا کر فرار ہونے کی کوشش کرے گا مگر دائیں جانب والے اگلے پہیے کے نیچے آ کر اس کا سر کچلا جائے گا۔ زندہ بچ رہنے اور زخمی ہونے والے مسافر جھوٹے بیانات ریکارڈ کرائیں گے کہ انہوں نے ڈرائیور کو بس تیز چلانے، بیک مرر میں بار بار عورتوں کو جھانکنے اور کنڈکٹر کو اوور لوڈنگ سے منع کیا تھا لیکن یہ سب باتیں بعد کی ہیں۔ اس وقت بس شہر کے بڑے اڈے میں کھڑی ہے اور کنڈکٹر مسافروں کو سوار کرا رہا ہے۔

یوں تو بس بھر چکی ہے اور کوئی سیٹ خالی نہیں ہے لیکن کنڈکٹر سواریوں کو ادھر ادھر اٹھاتا بٹھاتا اور نئے آنے والوں کے لئے زبردستی جگہ بناتا ہے۔بہت سے لوگ تھوڑی دور جا کر سیٹ مل جانے کی امید میں کھڑے ہیں۔ بے چارے نہیں جانتے کہ انہیں کس صورتحال سے دوچار ہونا ہے۔

نارِدؔ (ایک تخریبی اساطیری کردار)ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے چھپا بیٹھا ہے۔جونہی ڈرائیور سیلف لگا کر بس اسٹارٹ کرتا ہے وہ سیٹ کے نیچے سے نکل کر اس کے برابر بیٹھ جاتا ہے اور زندہ جسموں کے تازہ لہو کی خوشبو سونگھتا اور ماس کھانے اور ہڈیاں چبانے کا تصور کر کے ہنستا ہے۔

ڈرائیور کو ڈرائیونگ برائے نام سی آتی ہے۔ وہ پہلے اسی بس کا کنڈکٹر تھا لیکن اس نے اوپر والوں کے کان بھر بھر کر اصلی ڈرائیور کو ملازمت سے نکلوا دیا ہے۔ جب مالکوں نے اس کی باتوں پر یقین کر کے پرانے اور تجربہ کار ڈرائیور کو فارغ کر دیا تو اس نے سفارش سے بنوایا ہوا لائسنس جیب سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور حلف اٹھایا کہ وہ ہمیشہ ان کا وفادار رہے گا اور انہیں زیادہ پیسے کما کر دے گا۔انہوں نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا اور بس کی چابیاں اسے تھما دیں اور آج وہ پہلی مرتبہ لمبے روٹ پر بس لے کر چلا ہے۔ بس کی سواریوں کو منزل پر پہنچانا اس کا فرض

ہے مگر وہ اپنے اناڑی پن، غفلت اور بے پروائی کے سبب بس کو حادثے سے دوچار کر دے گا۔

بس ابھی اڈے سے روانہ نہیں ہوئی۔۔ وہ اپنی نئی سیٹ پر بیٹھ کر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ ہارن بجاتا ہے، ہارن بجاتے ہوئے اس کی انگلیاں انجانی لذت سے لتھڑ سی جاتی ہیں۔ اسے ہارن بجاتے ہوئے بہت مزہ آتا ہے وہ اس دن کے خواب ہمیشہ سے دیکھتا رہا ہے۔

بس کا نیا کنڈکٹر مسلسل سواریاں بٹھاتا جا رہا ہے۔۔ موت کے فرشتے ہاکر بن کر بس کے آگے پیچھے آوازیں دیتے اور مسافروں کو بس کی طرف گھسیٹتے ہیں۔ مسافر ان اگلی سیٹوں کی طرف خوشی خوشی لپکتے ہیں جو حادثے کے وقت ان کی ہڈیوں سمیت چور ہو جائیں گی۔ بائیں جانب دھوپ ہے۔ اس سے بچنے کی خاطر ہر شخص دائیں جانب کی کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے۔ بے چارے نہیں جانتے کہ حادثے کے وقت بس کا یہی حصہ نیچے کی جانب ہو گا اور کھڑکیوں کے شیشے ان کے جسموں میں پیوست ہو جائیں گے۔

ایک آدمی کا دوسرے سے سیٹ پر پاؤں رکھنے اور اس کے کپڑے خراب کرنے پر جھگڑا ہو رہا ہے۔بے چارے کو اندازہ نہیں کہ اس کے کپڑے تھوڑی دیر بعد خون اور مٹی سے لتھڑ جائیں گے۔

ایک اور شخص اپنا ہینڈ بیگ سیٹ پر رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کی ریکسین خراب نہ ہو۔ اسے کیا علم کہ اس ہینڈ بیگ کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

دو جوان عورتیں اپنے گورے چٹے چہروں پر سے نقاب اٹھائے اندر آتی ہیں۔

نارؔد ڈرائیور کی بغل میں چٹکی لیتا ہے۔

وہ ہارن بجانے کی لذت سے لتھڑی ہوئی انگلیوں سے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیتا ہے۔

’’سانوں وی لے چل نال وے باؤ سوہنی گڈی والیا۔‘‘

ایک اور جوڑا اندر آتا ہے۔ مرد نے دو اڑھائی برس کا ٹماٹر جیسے گالوں والا خوبصورت بچہ گود میں اٹھایا ہوا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی بچہ قلقاری مارتا اور توتلی باتوں کے پھول بکھیرتا ہے۔ سواریاں یہ پھول اٹھا اٹھا کر سونگھتی ہیں اور بالوں اور لباسوں میں اڑس لیتی ہیں۔ سبھی پلٹ پلٹ کر بچے کو پیار سے دیکھتے ہیں۔ نارؔد بچے کو دیکھتا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے۔ بچے کی ماں سیٹ پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیتی اور اس کا وہ سر چومتی ہے جسے ایکسیڈنٹ کے وقت اچھل کر چھت سے ٹکرانا اور پاش پاش ہونا ہے۔

بس اڈے سے نکلتی ہے۔نارؔد قہقہہ لگاتا ہے۔

ڈرائیور پہلا، دوسرا، تیسرا اور پھر ٹاپ گیئر لگاتا ہے۔

اونچی نیچی سڑک پر بس ہوا سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ ڈرائیور کا دل خوشی سے کھل اٹھتا ہے۔ نارڈ اس کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ کر اسے ریر ویو مرر میں پیچھے کی سڑک اور ٹریفک کو دیکھ کر اپنا راستہ متعین کرنے کی بجائے بس میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ڈرائیور پیچھے دیکھنے والے شیشے کو سیٹ کرتا ہے۔

اسی لمحے چلتی بس میں قہقہے مارتی ہونیؔ سوار ہوتی ہے۔ نارڈ اسے ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ سیٹوں کے درمیان پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی ہے۔

ایک مسافر اور کنڈیکٹر کا پچاس پیسوں پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ہونیؔ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی ہے۔

نارّد ڈرائیور کی بغل میں ہاتھ ڈال کر گدگدی کرتا ہے۔

ڈرائیور ہنستا ہے۔ پھر دلوں میں گدگدی پیدا کرنے والے گانوں کی دوسری ٹیپ لگاتا ہے اور پیچھے دیکھنے والے شیشے میں نظر آنے والی اس نوجوان لڑکی کو آنکھ مارتا ہے جو آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں کو اپنی آہوں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہوسٹل میں اسے اپنے ابا کے مرنے کا ٹیلی فون کے ذریعے پیغام ملا تھا اور وہ جلد از جلد گھر پہنچ کر اس کا منہ دیکھنا چاہتی ہے، غریب کو کیا خبر کہ اس سے پہلے ڈرائیور اسے بس کے ساتھ کہاں پہنچے دے گا؟

بس کے میٹر کی سوئیاں رفتار کی سیڑھیاں چڑھتی ہیں۔

ہوا میں سے سینے پر دو ہتڑ مارتی ماؤں اور بلند آواز میں بین کرتی بہنوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

ہونیؔ اٹھ کر ایک ایک کھڑکی کے پاس جاتی اور شیشے چڑھاتی ہے۔ ڈرائیور ریر ویو مرر میں باپ کے جنازے پر پہنچنے والی لڑکی کو تاڑتا ہےـنارڈ بغل میں بیٹھ کر ہنستا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے،سڑ ک اور زندگی کا سفر کم ہوتا جا رہا ہے مگر اپنے انجام سے بے خبر مسافر سفر کم ہونے پر خوش ہوتے ہیں۔ بس ہر لمحے اس مقام کے اور قریب ہوتی جا رہی ہے جہاں کل(کال،قضا،موت) اس کا بیتابی سے انتظار کر رہی ہے۔

ایکسیلیٹر پر ڈرائیور کے پاؤں کا بوجھ بڑھتا ہے۔

باپ کے جنازے پر پہنچنے والی لڑکی سر اٹھاتی ہے ڈرائیور اسے پھر آنکھ مارتا ہے۔ ناردؔ بکرے بلاتا اور ہونی سیٹوں کے درمیان لڈّی مارتی ہے۔

مسافروں میں سے کوئی بھی ڈرائیور کو بس تیز چلانے اور بار بار بیک مرر میں دیکھنے سے منع نہیں کرتا۔

ہونیؔ اور ناردؔ تالیاں بجاتے اس پل کی جانب دیکھتے ہیں،جہاں کالے کپڑے پہنے کل منتظر کھڑی ہے۔

ڈرائیور ابھی تک بیک مرر میں دیکھ رہا ہے۔

اور یوں میرے سر سے اس کہانی کا بوجھ اتر گیا ہے۔

لیکن ٹھہرئیے!میں آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں۔

بس ابھی تک چلی جا رہی ہے۔ آج حادثے کا شکار نہیں ہوئی اور منزل پر پہنچ جاتی ہے لیکن آپ جانتے ہیں ایسا ہو تو سکتا ہے نا۔۔!

***

پھانس

’’خیر تو ہے... کیا ہوا؟‘‘

’’کچھ نہیں ‘‘

’’کچھ تو ہے ورنہ تمہارے اندر تو ہر وقت بہت سی ہنسی جمع رہتی تھی۔‘‘

’’اس دور میں اتنا ہنس لینا بھی غنیمت ہے۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم ہنستے ہنستے اچانک اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئے؟‘‘

’’لطیفہ اچھا تھا...!‘‘

’’یہی تو وہ کہہ رہا ہوں کہ اتنے اچھے لطیفے پر اتنی مختصر ہنسی۔‘‘

’’آئندہ تم ہر لطیفے کے ساتھ وقت بھی بتا دیا کرو کہ اس پر اتنے منٹ ہنسنا ضروری ہے۔‘‘

’’بتا دیا کروں گا... فی الحال تم بتاؤ کہ بات کیا ہے۔‘‘

’’کونسی بات... کیسی بات؟‘‘

’’دیکھو... مجھ سے جھوٹ مت بولو... کوئی بات ضرور ہے ورنہ تم ہنستے ہنستے اس طرح اچانک سنجیدہ نہ ہو جاتے۔ سچ اس لمحے تم مجھے بہت ّپرتفکر نظر آئے۔‘‘

’’یار اگر کوئی بات ہوتی تو میں تم سے چھپاتا؟‘‘

’’آج چھپا رہے ہو‘‘

’’کوئی خاص بات نہیں ہے‘‘

’’چلو عام سی بات ہو گی--- تم بتاؤ تو‘‘

’’عجیب سی بات ہے‘‘

’’پھر تو بڑا مزہ آئے گا‘‘

’’یار آج دن بھر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مجھے محسوس ہوتا رہا کہ میرے دل پر کسی ناخوشگوار بات کابوجھ میں نے بہت غور کیا مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ ایسی کونسی بات ہوئی ہے۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں ؟‘‘

’’یار کچھ پلے نہیں پڑا--- ذرا اپنی بات کی وضاحت کرو‘‘

’’میں کہہ رہا تھا کہ دب بھر تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوتا رہا کہ میں کسی وجہ سے کچھ ملول سا ہوں۔میرے اندیشہ۔ کوئی چنتا سی۔ اور جیسے آنکھ میں کوئی ذرہ پڑ جائے تو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی رڑک محسوس ہوتی رہتی ہے بالکل ایسے ہی میں دن بھر سارے کام معمول کے مطابق کرتا رہا مگر وہ جو ایک معلوم سا بوجھ مرے دل پر تھا وہ مجھے گاہے گا ہے اداس کرتا رہا۔ مگر مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد خبر یار نہیں ہے جس کی وجہ سے سے ناگواری کا احساس میرے ذہن سے چمٹ گیا ہے البتہ مجھے اندازہ ہے کہ یہ پریشان نہایت معمولی ناعیت کی ہے اور اس کا سبب بھی کوئی نہایت معمولی سا واقعہ یا بات ہے۔‘‘

’’یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟‘‘

’’یوں---- کہ اگر کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو مجھے یاد رہتی‘‘

’’پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟‘‘

’’ہاں کئی بار---- کوئی اچھی یا بری خبر---- جس کی نوعیت معمولی ہو مجھے خفیف سا خوش یا اداس کر کے میرے ذہن سے اتر جاتی ہے۔ مجھے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد خوشگواریت یا ناگواریت کا احساس ہوتا رہتا ہے مگر یہ یاد نہیں آتا کہ میں کیوں خوش یا ناخوش ہوں ؟‘‘

’’پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہوتا ہے؟‘‘

’’میں بھولی ہوئی اس بات یا واقعہ کو یاد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں، مگر ذہن اور الجھتا چلا جاتا ہے بعض اوقات کوئی بڑی پریشانی یا ذہنی مصروفیت مجھے اس معمولی قسم کی الجھن سے چھٹکارا دلا دیتی ہے مگر پھر کسی روز بیٹھے بٹھائے یا چلتے پھرتے وہ بھولی ہوئی بات جس نے مجھے اتنی دیر تک پریشان رکھا خود بخود یاد آ جاتی ہے، مگر اس کی نوعیت بعض اوقات اس قدر معمولی ہوتی ہے کہ اپنے آپ پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔‘‘

’’مثلاً‘‘

’’مثلاً۔۔۔۔۔ ایک روز مطالعہ کے دوران مجھے کسی لفظ کے بارے میں اب تک اس کو جن معنوں میں استعمال کرتا رہا ہوں وہ شاید درست نہیں تھے۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور اتفاق سے میرے کمرے میں ڈکشنری نہیں تھی۔ سوچا صبح اٹھ کر ڈکشنری دیکھ لوں گا مگر صبح ہوئی تو مجھے یہ تو بھول گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے مگر کسی کمی کا احساس یا یوں سمجھو کہ ایک ناگوار سا بال مسلسل ذہن سے چمٹا رہا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد دل میں کانٹا سا چبھتا رہا اور یہ صورت اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ پھر کبھی مطالعہ کے دوران وہی لفظ سامنے نہ آیا اور اس کے معانی جان کر میں نے اپنا شک دور نہ کر لیا۔‘‘

’’اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں بھول جانے کی عادل ہے‘‘

’’نہیں۔۔۔۔۔ اتنی سادہ سی بات مت سمجھو۔۔۔۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔میں جس شخص سے ایک بار مل لیا ہوں اور اس کے جتنے کوائف میرے علم میں آتے ہیں وہ میرے ذہن پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پرانا ریکارڈ کھنگالنے کی بجائے دفتر والے مجھ سے رجوع کرتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے کے یاد کئے ہوئے سنین، تاریخیں، حسابی گر، الجبرے کے فارمولے، جیومیٹری کے پرابلمز، یہاں تک کہ سارے پہاڑے پوری طرح یاد ہیں حالانکہ ان چیزوں کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ بعض اوقات مجھے اتنی چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتیں یاد رہ جاتی ہیں کہ سننے والے اور جاننے والے ششدر رہ جاتے ہیں۔‘‘

’’ہاں اس کا مجھے بھی اندازہ ہے۔یاد ہے وہ علی احمد والا کیس۔ اگر تمہیں وہ سارے حوالے یاد نہ ہوتے تو مارا گیا تھا بے چارہ۔۔۔ مگر سوال یہ ہے کہ تمہاری موجودہ الجھن کا سبب کیا ہے‘‘

’’کوئی خاص بات نہیں ہو گی۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔۔ خود ہی یاد آ جائے گی‘‘

’’حد ہو گئی۔۔۔ اچھا تو پھر کیا کریں ؟‘‘

’’تم میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ۔۔۔ ابھی مسئلہ ہل ہو جائے گا‘‘

’’تم نے اسے کھیل سمجھ لیا ہے۔۔۔ مگر خیر۔۔۔ پوچھو‘‘

’’تمہاری موجودہ کیفیت کب سے ہے‘‘

’’میرا خیال ہے صبح سے یا شاید کل سے‘‘

’’کل دفتر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ تو پیش نہیں آیا۔ یاد کرو‘‘

’’ اور کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔البتہ ایک چھٹی اوپر سے آئی تھی جس ایک غلط کیس کی سفارش کرنے کو کہا گا تھا۔‘‘

’’پھر تم نے کیا کیا؟‘‘

’’وہی جو ایسی صورت میں کیا جاتا ہے حکم عدولی بھی نہ ہو اور غلط بات کی سفارش بھی نہ کی جائے۔ گول مول سا جواب لکھ دیا لیکن اس بارے میں میرے دل پر اب کوئی بوجھ نہیں ہے‘‘

’’کوئی اور چٹھی؟ جس کے مندرجات سے تمہیں اتفاق نہ ہو؟‘‘

’’ہاں وہ ایک لیٹر تھا۔پندرہ تاریخ تک رپورٹ بھجوانی تھی اور یہ کل بیس تاریخ کو مجھ تک پہنچا۔ رپورٹ کے لئے تین دن درکار تھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس پر سخت سا جواب لکھ کر جی ہلکا کر لیا۔‘‘

’’کوئی سر کلر؟‘‘

’’ہاں وہ سر کلر۔۔۔ وہی جس کا میں نے ٹیلی فون پر تم سے ذکر کیا تھا۔یقین جانو میرا خون کھول اٹھا۔ سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بس اسی طرح ٹھونستے رہے ہیں اور پھر اس میں میری ذاتی پریشانی کی کوئی وجہ نہیں تھی‘‘

’’دفتر میں کسی سے تلخ کلامی ہوئی ہو؟‘‘

’’تم میری طبیعت سے واقف تو ہو‘‘

’’کوئی ٹیلی فون کال؟‘‘

’’نہیں ‘‘

’’کوئی آدمی ملنے آیا ہو دفتر میں۔۔۔ یا تم کہیں گئے تھے؟‘‘

’’وہ لڑکا آیا تھا۔۔۔ کمپاؤنڈر۔۔۔ جس نے ریکروٹنگ ایجنٹ کے اس پیسے جمع کرائے تھے ویزا کے لئے۔۔۔‘‘

’’یار وہ تو میری ذمہ داری بھی ہے‘‘

’’بلکہ تمہاری ہی ہے۔ میں تو کہتا رہا کہ اس جھمیلے میں نہ پڑیں ‘‘

’’کیا کہتا تھا؟‘‘

’’کہتا تھا اگر ویزا نہیں ملتا تو اس کی رقم واپس دلائی جائے۔ اب وہ کم بخت رقم کہاں لوٹتا ہے‘‘

’’تو تم نے بات کی اس سے‘‘

''ہاں کی تھی-- وہی سال بھر پہلے والا جواب کہ جلد ہی ویزا آ جائے گا''

''تو تمہاری پریشانی کی وجہ یہ بھی نہیں ''

''ہے تو سہی-- مگر وہ کوئی دوسری بات ہے اس سے زیادہ اہم جو مجھے یاد نہیں آ رہی''

''گھر میں-- میرا مطلب ہے بھابی سے تو جھگڑا نہیں ہو گیا تھا؟''

''ہوا تھا مگر وہ تو پرسوں کی بات ہے''

''کیوں-- کیا ہوا تھا؟''

''وہی جو بیویوں کی عادت ہوتی ہے فلاں کے گھر فلاں چیز آئی ہے۔ فلاں کے میاں نے گاڑی خرید لی ہی۔ یہ لادیں-- وہ لادیں۔''

''پھر؟''

''پھر صلح ہو گئی-- تم کوئی دوسرا سوال کرو''

''کوئی خوب دیکھا تم نے؟''

''خواب؟''

''ہاں خواب۔ کوئی ڈراؤنا۔ بھیانک خواب۔ اپنے یا کسی عزیز کے بارے ہیں ؟''

''نہیں ''

''پھر یقیناً تمہیں کسی کی یاد نے ستایا ہو گا-- وہ کیا نام تھا اُن صاحبہ کا جو بیاہ کر لندن چلی گئی تھیں، ہاں فرزانہ--''

''ہاں یار کل شب کو ریڈیو سے اس فلم کے نغمے نشر ہو رہے تھے جو ہم دونوں نے اس شام دیکھی تھی جب ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے تھے۔ مگر ایسا تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ہم ے جو فلمیں ایک ساتھ دیکھی تھیں جو گانے ایک دوسرے کی موجودگی میں سُنے تھے یا اُسے پسند تھے وہ جب بھی سنتا ہوں تو اس کی یاد آتی ہے اور پھر میری پریشانی تو یہ ہے کہ میں کچھ بھل گیاہوں فرزانہ کو تومیں نے کبھی نہیں بھلایا-- تم بے فکر ہو کر اگلا سوال پوچھ سکتے ہو''

''اچھا یہ بتاؤ-- تم نے کل اخبار پڑھا تھا''

''روز ہی پڑھتا ہوں ''

’’اس میں ہوائی جہاز کے حادثے کی خبر چھپی تھی جس میں سینکڑوں آدمی ہلاک ہو گئے اور وہ ویگن اور ٹرک کی ٹکر کی خبر بھی تو شاید کل ہی چھپی تھی؟‘‘

’’ہاں یار--- میں نے خبریں پڑھی تھیں۔ بہت افسوس ہوا۔ اس سال بہت حادثے ہوئے ہیں۔‘‘

’’حادثے سے مجھے یاد آ گیا--- وہ تمہارے یار نذیر لنگڑے کا کیا حال ہے؟‘‘

’’یاں یار--- کل اس کی خط آیا تھا‘‘

’’کل آیا تھا۔ تو پھر تم ضرور اسی کے بارے میں فکر مند ہو گے--- کیا کوئی بری خبر تھی اُس میں ؟‘‘

’’نہیں--- بہت خوشی کی خبر تھی--- وہ مقدمہ جیت گیا ہے‘‘

’’اچھا--- اس کا مطلب ہے اب ساری زمینیں اور جائیداد اُسے مل جائیں گی؟‘‘

’’یقینا‘‘

’’یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اسی لئے کہتے ہیں خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اُسے مبارکباد کا تار دینا چاہئے۔ مگر تم نے اتنی بڑی خبر مجھے اب تک کیوں نہیں بتائی؟‘‘

’’بس یار میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔‘‘

’’لیکن یہ تمہارے چہرے پر اطمینان بھری اُداسی کیوں پھیل گئی ہے کیا تمہیں اپنی پریشانی کا سبب یاد آ گیا ہے؟‘‘

’’نہیں تو‘‘

’’اس ساری گفتگو میں تم پہلی بار جھوٹ بول رہے ہو لیکن کوئی بات نہیں۔ میں خوش ہوں کہ تمہیں یہ تو پتہ چلا کہ تمہاری اُداسی کی اصل وجہ کیا تھی۔ خدا حافظ‘‘

’’خدا حافظ‘‘

* * *

پھندا

’’تین بار پھانسی۔‘‘

فیصلے کے الفاظ اگرچہ جوش و جذبے سے خالی اور لہجہ سپاٹ تھا مگر مفہوم کی سنگینی سے کمرہ عدالت میں لحظہ بھر کو سناٹا چھا گیا۔ جسے سزا پانے والے کے زوردار قہقہے نے توڑا۔

عدالت میں موجود زیادہ تر لوگ ایسے موقعوں پر سزا پانے والوں کے اس قسم کے رد عمل سے واقف تھے، جانتے تھے سزا کی ہولناکی سے بوکھلانے، اپنے اندر کے خوف کو چھپانے اور خود کو ڈھارس دینے کے لئے وہ اکثر ہسٹریائی حرکتیں اور بہادر نظر آنے کی اداکاری کرتے تھے مگر اس قہقہے کی نوعیت قدرے مختلف تھی۔ ایک عجیب آواز۔ جیسے پر لطف لطیفہ سن کر ہنسی بے ساختہ قہقہے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایک سچ مچ کا زندہ، تندرست اور بلند قہقہہ جس میں کوئی تصنع، اداکاری یا بوکھلاہٹ نہیں تھی۔ تو کیا وہ بے قصور تھا کہ فیصلہ اسے لطیفہ معلوم ہوا مگر اس نے تو خود اعتراف جرم کیا اور ڈنکے کی چوٹ تمام الزامات قبول کئے تھے۔ شاید اسے تین بار موت کی سزا پر ہنسی آئی ہو کہ ایک بار کی پھانسی کے بعد دوسری اور تیسری مرتبہ پھانسی کیسے دی جا سکتی ہے۔ مگر وہ ایسا نامعقول شخص نہ دکھائی دیتا تھا کہ جرم کی سنگینی ظاہر کرنے والے فیصلے پر ہنس سکتا ہو۔ مگر پھر پہریداروں کی معیت میں مجرموں کے کٹھرے سے باہر آتے ہوئے اسے یہ کہتے سنا گیا۔

’’خدایا تیرا شکر ہے تو نے مجھے سرخرو کیا اور شہادت کے لئے چنا۔‘‘

صاف ظاہر تھا وہ اپنے کئے پر نادم نہیں تھا بلکہ سزائے موت کو اپنے لئے اعزاز اور سعادت سمجھ رہا تھا۔ اخبار والوں نے اس کے قہقہے اور اطمینان کو سرخی کے لئے چن لیا۔

پہریداروں کی روک نے پھولوں کے ہاروں کو تو اس کے گلے تک نہ پہنچنے دیا مگر عزیز و اقارب اور خیر خواہوں کی مرحبا مرحبا اور آفرین آفرین کی آوازیں

اس تک ضرور پہنچ گئیں۔ اس کی خوش بختی کہ اس موقع پر آپ بھی بنفس نفیس موجود تھے اور فرما رہے تھے ''تم پر رحمت ہو۔''

ان الفاظ میں ایسی برکت اور تاثیر تھی کہ اسے لگا اس پر آسمان سے پھول کی پتیاں نچھاور ہونے لگی ہیں۔ اتنے پھول اور پتیاں کہ اخبار نویس، فوٹو گرافرز اور وڈیو کیمرے سب کچھ ان میں چھپ گیا۔ جیل تک لانے والی بند گاڑی جس راستے سے گزری وہ تمام راستہ جیسے پھولوں سے اٹا پڑا تھا۔ مگر جن لوگوں کی ظاہری آنکھیں ان پھول پتیوں کو دیکھنے سے قاصر تھیں وہ اس کی خوشی، طمانیت اور خوش نصیبی کا اندازہ کیسے کر سکتے تھے۔

اس رات قید خانے میں بھی رحمتوں کا نزول ہوتا رہا۔ وقفوں وقفوں سے گلاب پاشی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس رات وہ فرش کی بجائے گلاب کی پتیوں کے ڈھیر پر سویا اور یہی پتیاں اس نے کھٹملوں والے کمبل کی جگہ اوڑھیں۔

اگلی صبح پہریداروں نے اسے بتایا کہ تمام اخبارات میں اس کی تصویریں چھپی تھیں اور گذشتہ شب اسے ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا گیا تھا۔ یہ سن کر وہ خوشی سے سرشار ہو گیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے وضو کیا اور سجدہ شکر بجا لایا۔

''الحمد للہ کہ تو نے اپنے اس عاجز بندے کو یہ مرتبہ عنایت کیا، ایک عظیم مقصد میں کامیابی عطا فرمائی، ایک فتنے کا قلع قمع ہو گیا اور حق کی فتح ہوئی۔''

تب آپ کا نورانی چہرہ تصور میں ابھرا اور آپ کے الفاظ کانوں میں گونجے ''تم پر رحمت ہو۔'' اس کا دل فرط عقیدت، احترام اور محبت سے کھل اٹھا۔ کاش وہ آپ کے قدم چوم سکتا کہ آپ نے ایک گرے پڑے کنکر کو اٹھا کر گوہر آب دار میں تبدیل کر دیا تھا۔ آپ کی نگاہ کرم نے ایک ذرے کو آفتاب بنا دیا تھا۔

اسے وہ دن یاد آئے جب وہ بالکل گنوار تھا۔ اگرچہ اس نے دنیاوی علم کی دس بارہ جماعتیں پاس کر لی تھیں مگر اسے اصلی علم اور دین کا کچھ پتہ نہ تھا۔ صرف ایک کلمہ شریف اور کہیں کہیں سے بھولی ہوئی نماز یاد تھی۔ لیکن اللہ کو اس سے ظاہری عبادت سے زیادہ بڑا کام لینا تھا۔ اس کی آپ سے ملاقات ہو گئی۔ فاقوں اور بے روزگاری سے تنگ آ کر وہ ریلوے لائن کی طرف جا رہا تھا کہ ایک جگہ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت ہو رہی تھی شاید کوئی مذہبی یا سیاسی جلسہ شروع ہونے والا تھا۔ کاش اس وقت گاڑی آ جائے اس نے سوچا۔ مرنے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر ادھر گاڑی سامنے آئی اور ادھر آپ نے کھنکار کر گلہ صاف کیا، چند آیات مقدسہ پڑھیں اور الفاظ کے پھول برسانے لگے۔ اس آواز میں اتنا سحر اور کشش تھی کہ انجن سے لے کر آخری بوگی تک کھٹاک کھٹاک کرتی ساری ریل گاڑی اس کے سامنے سے گزر گئی اور وہ بت بنا خالی ریلوے لائن کو اور فضا میں اڑتے لفظوں کی پھول پتیوں کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ خوبصورت آواز جس نے اسے دوبارہ زندگی عطا کی تھی ایک پتنگ کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتی جاتی تھی۔ جیسے شوں شوں کرتی ہوائی اوپر اٹھتی اور آسمان میں جا کر پھٹتی ہے۔ فضا آتش

بازی کے پھولوں سے منور ہو گئی۔ اس نے سکول اور کالج میں تقریری مقابلوں میں حصہ لینے والے لڑکوں، کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے استادوں اور عبادت گاہوں میں خوش بیان خطیبوں کو تقریر کرتے دیکھا سنا تھا مگر اپنے ساتھ بہا لے جانے والا یہ جوشیلا لہجہ اور جادو بیانی وہ پہلی بار سن رہا تھا۔ زبان و بیان کی روانی، لفظوں کا شکوہ اور آواز کی ولولہ انگیزی اور طمطراق، اسے لگا وہ خود ایک پتنگ ہے جس کی ڈور کا دوسرا سرا کسی غیبی ہاتھ میں ہے جو اسے تنکے لگا لگا کر اپنی اور کھینچے لئے جاتا ہے۔

آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والے الفاظ، دقیق اشعار اور اصطلاحوں کا اپنا ایک فسوں ہوتا ہے۔ اگر وکیبلری کے ساتھ لہجے کی گھن گرج بھی شامل ہو جائے تو آواز بھونچال لا سکتی ہے۔ پہاڑوں کو ریزہ کر سکتی ہے وہ تو ایک معمولی پڑھا لکھا نوجوان ہے اس نے سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ مرنے سے پہلے وہ ایک بار اس آواز کے آقا کے ہاتھ پر ضرور بوسہ دے گا۔

جلسے کے اختتام پر مصافحہ کرنے والوں کا ہجوم تھا مگر اسے کوئی جلدی نہ تھی۔ آخر اس کی باری آ گئی۔ اس نے مصافحہ کے لئے بڑھا ہوا آپ کا دست مبارک تھام لیا، اپنی پرنم آنکھوں سے لگایا اور فرط عقیدت سے اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ آپ نے کمال شفقت سے کندھا تھپتھپایا، دعا دی اور اپنی درس گاہ پر حاضری کی دعوت۔ یوں ایک حقیر پر تقصیر بندے کو ان کے غلاموں میں شمولیت کا شرف حاصل ہو گیا۔ اس کے سارے دلدر دور ہو گئے اور وہ ترقی کی منزلیں جن کا خواب اس کے بوڑھے اور نابینا باپ نے دیکھا تھا،طے کرنے لگا۔

اسے اپنی تربیت کے ابتدائی دن یاد آئے۔ کس طرح ایک ایک کر کے اس کے دماغ میں بھرے ہوئے پتھر ہٹائے گئے۔ اس کے باہر کو دنیاوی آلائشوں اور باطن کو مادی خواہشات سے پاک کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ ہی عرصہ میں اس کا اندر باہر دمکنے لگا۔ قلب و نظر منور ہو گئے۔

تربیت کا دوسرا مرحلہ ایمان اور عقیدے کی پختگی اور استحکام کے متعلق تھا۔ جس کے لئے اپنے عقیدے کا دوسرے مذاہب، عقائد اور نظریات سے تقابلی اور تنقیدی جائزہ ضروری تھا۔ فرماتے تھے اجالے کا تصور اندھیرے کے بغیر نامکمل ہے۔ آپ دیگر عقائد کو محض زور بیان سے نہیں جھٹلاتے تھے۔ دانش منطق اور استدلال سے ان کی نامعقولیت کو ثابت کرتے اور ذہن نشین کراتے تھے۔ یہ مرحلہ طے ہو گیا تو اگلی منزل صاف، سیدھی اور آسان نظر آنے لگی۔حق اور باطل میں سے ایک کا انتخاب۔ حق کی نصرت اور باطل کی ابتری۔ فرمایا

''تم سب اس مقدس تنظیم کے ستون ہو۔ ایک نئے آسمان کے آفتاب و ماہتاب ہو۔ تم چنے گئے ہو۔ تم ساری دنیا پر چھا سکتے ہو۔ تاریخ شاہد ہے ایمان کی پختگی، عقیدے کی سچائی اور عزم صمیم نے چند افراد کو دوسروں پر غلبہ عطا کیا۔ تم وہ نڈر، صالح اور شجاع ہو،سمٹ کر پہاڑ جن کی ہیبت سے رائی۔ لاریب تم پرچم لے کر

اٹھو گے تو بحر و بر کو باطل سے پاک کر دو گے۔ مگر مصلحت اور دانش مندی کا تقاضا ہے عظیم مقاصد مرحلہ وار حاصل کئے جائیں تو فتنہ و فساد کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہو جاتا ہے۔''

ایک دوسرے موقع پر فرمایا :''ہر نیک کام کا آغاز اپنے گھر سے کرنا چاہئے اور تم یقیناً جانتے ہو کون لوگ اس گھر کو ناپاک کر رہے ہیں۔ وہ تمہاری روحانی ماؤں پر بہتان تراشی کرتے اور ان کے ناموس پر غلاظت پھینکتے ہیں اور تمہارے مقدس باپوں کی شان میں گستاخیاں کرتے اور تمہارے عقائد کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ تف ہے بے آبروئی اور بے عزتی کی زندگی پر۔ اٹھو اور ان ناپاک زبانوں کو گدی سے کھینچ ڈالو۔ خبیث اور ملعون لوگوں کو دین سے پاک کر دو۔''

اسے یاد آیا۔ آپ کا خطاب سن کر بعض جوشیلے نوجوان جن میں وہ پیش پیش تھا سر پر کفن باندھ کر اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر آپ نے نہایت تحمل سے فرمایا۔ ''جوش میں ہوش مت گنواؤ جلد بازی شیطانی عمل ہے۔ چور کو نہیں چور کی ماں کو مارو۔ محض چور کو مارو گے تو وہ دوسرا جن دے گی۔ شیطانی ٹولے کے سرغنہ کو پہچانو جو سارے فساد کی جڑ ہے۔ جڑ کو کاٹو۔ پیڑ اور شاخیں خودبخود مرجھا کر نیست و نابود ہو جائیں گی۔ ہاتھ کھڑے کرو۔''

اسے یاد آیا اتنے اچھے اچھے توانا ہاتھوں میں آپ کو اس کا حقیر ہاتھ پسند آیا اور عظمت اس کا مقدر ہوئی۔ اس کے ہم جلیسوں نے اس کے بخت پر رشک کیا۔ اسے ہدیہ تبریک پیش کیا اور اس کی کامرانی کی دعائیں کیں اور محلے کے وہ معززین جو اس کے سلام کا جواب اس لئے نہ دیتے تھے کہ نوکری لگوانے کا سوال نہ کر بیٹھے اور کم تر درجے کے محلے دار اس لئے منہ نہ لگاتے تھے کہ قرض نہ مانگ بیٹھے، اچانک فرش سے عرش پر پہنچ گیا۔ ایسا سربلند ہوا کہ ستارے اس پر رشک کرنے لگے۔

آخری مرحلہ عملی تربیت کا تھا۔ اندر جذبہ شوق و شہادت سے لبالب ہو تو ہر مشکل آسان ہوتی چلی جاتی ہے۔ اخروی زندگی کی جملہ نعمتوں کا حصول اس کے ایمان و ایقان کا حصہ بن گیا تھا اس نے سپاس گزاری کے جذبات سے مشن قبول کیا۔

اسے یاد آیا۔ پہلی کوشش ناکام ہو گئی تھی اس سے کوتاہی ہو گئی۔ اس نے نصیحت پر عمل نہ کرتے ہوئے ہوش کے بجائے جوش سے کام لیا اور درخت کو شاخوں پتوں اور جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ نتیجے میں کچھ ڈال ضرور گرے مگر اصل جڑ بچ گئی۔ دوسری کوشش میں بہت حد تک کامیابی ہوئی، درخت ٹنڈ منڈ ہو گیا، جڑوں تک ہل گیا۔ اندازہ تھا اب دوبارہ کبھی ہرا نہ ہو سکے گا مگر جرات اور پامردی کے اظہار کے جوش میں پھر بے احتیاطی ہو گئی اور وہ پہچان لیا گیا۔ اس کی سرزنش کی گئی کہ اب وہ اسے کھوجتے ہوئے کہاں کہاں نہیں پہنچیں گے مگر اس نے سارے الزامات اپنے سر لے لئے اور مہینوں جسمانی اذیتیں اٹھانے کے باوجود ثابت قدم رہا۔ وہ اس سے کچھ بھی نہ اگلوا سکے۔

اگرچہ اسے اس کا ملال تھا کہ وہ اصل ٹارگٹ کو ملیا میٹ نہ کر سکا مگر اس نے شر کی قوت کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ اس کے دوبارہ نمو پانے اور پھیلنے کے امکانات تقریباً معدوم ہو گئے تھے۔ اس کامیابی پر اسے دل اور کا خطاب، شہید کا رتبہ اور جنت کی بشارت عطا کی گئی تھی۔

اسے یاد آ رہا تھا۔

جیل میں آنے سے پہلے اس کے ذہن میں اپنے ابدی گھر کا خاکہ جس کی اسے نوید دی گئی تھی کچھ نامکمل اور ادھورا سا تھا۔ محض ایک ہیولا۔ مگر وہ ہر روز اس کے خاکے میں رنگ بھرنے کا کام کرتا۔ یوں بھی اسے فرصت تھی۔ مگر اس نے اس شخص کی طرح جس کے پاس تعمیر کے وسائل موجود ہوں اور مکان کا نقشہ کمیٹی نے منظور کر دیا ہو، ذہنی طور پر ابھی سے اپنے مجوزہ مکان میں رہنا بسنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اتنا عالیشان مکان تھا کہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہ تھی۔ اس فانی دنیا کے بہترین بنگلے اور شاندار ترین محل اس کے سامنے ہیچ تھے۔

مقدمے میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا مگر وہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ بہت سوں کو ملوث کرنا چاہتے تھے اس لئے مقدمہ کئی مہینے چلتا رہا۔ اس دوران ایک بہت بری خبر آئی۔ سوکھتی مرجھاتی جڑ پھر سے پھوٹ نکلی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے شیطانی قوتیں اس قدر توانا ہو گئی تھیں کہ آپ کی ذات کو نقصان پہنچانے کی بزدلانہ کوشش کی گئی۔ مگر خدا نے آپ کو محفوظ رکھا۔ تاہم آپ کے بہت سے جانثار آپ پر قربان ہو گئے۔ کاش وہ آزاد ہوتا۔ اس نے سوچا اور اس انتقامی کارروائی کا انتقام لے سکتا۔

اور اب اتنے مہینوں بعد اس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا تھا جسے سن کر اسے بے پناہ ہنسی آئی تھی کہ یہ عین اس کی توقع اور خواہش کے مطابق تھا۔ اس کی زندگی اکارت نہیں گئی تھی۔ اور حرام موت کی بجائے شہادت نصیب ہو رہی تھی۔ اب اس کی منزل قریب آ گئی تھی مگر دقت یہ پیدا ہو گئی کہ آپ نے اور دیگر خیر خواہوں نے سزا کے خلاف اپیل کر ڈالی۔ اور اس کے حق میں چھوٹے موٹے جلسے اور اخباری بیانات کا اہتمام بھی کیا جانے لگا مگر آخرکار وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ اپیل خارج ہو گئی مگر اسے کوئی پریشانی یا مایوسی نہیں ہوئی۔ سزا کے فیصلے کی طرح اسے اپیل کے نتیجے کا بھی پہلے سے اندازہ تھا۔

لیکن جس روز اپیل خارج ہونے کی اطلاع آئی اس سے اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو ایک عجیب احساس نے اسے آن گھیرا۔ اسے لگا وہ سو بھی رہا ہے اور جاگتا بھی ہے۔ جنت کے باغوں کی سیر بھی کر رہا ہے اور سلاخوں سے باہر کھڑے سنتریوں کو ٹہلتے، قیدیوں کو آتے جاتے اور پرندوں کو اڑتے بھی دیکھ رہا ہے جیسے وہ دو حصوں میں بٹ گیا ہو۔ راتوں رات اس کے اندر اس جیسا ایک اور پیدا ہو گیا ہو۔ دیکھنے میں عین مین اس جیسا مگر سوچ میں اس کے الٹ۔

اس نے اپنے اندر پیدا ہونے والے اس دوسرے پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر آنے والی ہر صبح کو پہلا دبلا اور دوسرا فربہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی موت کا پروانہ جاری ہو گیا اور وہ سب اس کی آخری ملاقات کو آئے۔ اسے اپنے روتے بلکتے عزیزوں پر ایک ساتھ رحم اور رشک آ رہا تھا۔ رحم اس لئے کہ اس کے مقابلے میں ان کی حالت خراب ہو رہی تھی اور رشک اس لئے کہ وہ زندہ تھے رو سکتے تھے۔ رو کر چپ ہو سکتے تھے اور گھر کو لوٹ سکتے تھے۔ اس کے ساتھی اور خیر خواہ بھی آئے۔ وہ بھی غم زدہ تھے اور اس کی بہادری،حوصلے اور عظیم قربانی کی داد دے رہے تھے مگر یہ صرف وہی جانتا تھا کہ اسے ہشاش بشاش نظر آنے کے لئے کتنی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔

سب سے آخری ملاقات آپ کی تھی۔ زہے قسمت کہ رخ انور کی زیارت نصیب ہوئی اور آسمان پر اس کے لئے بلند مقام مخصوص ہو چکنے کی بشارت عطا ہوئی۔

الوداعی ملاقات تمام ہوئی۔ وہ سب زندگی کی طرف اور وہ موت کی کوٹھری میں لوٹا تو اسے عجیب خالی پن کا احساس ہوا جیسے وہ پہلی بار اکیلا ہو گیا ہو۔ وہ کئی مہینوں سے قید تنہائی گزار رہا تھا مگر اس سے پہلے اس نے یہ اکیلا اور سونا پن محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے اندر کوئی چیز مر گئی ہو۔ مگر کیا؟ اس نے بہت سوچا مگر اس سونے پن کا سبب نہ جان سکا۔ کہیں وہ اب تک کسی موہوم امید کے سہارے تو زندہ نہیں تھا جو آج مر گئی۔ اس نے سوچا مگر نہیں اسے سزا سے بچنے کی خواہش تھی نہ امید۔ پھر وہ کیا چیز تھی جو مر گئی۔ کیا اس کا جذبہ ایمان کمزور پڑ گیا، بہتر زندگی کا تصور دھندلا گیا یا اس کے اندر پیدا ہونے والا دوسرا اس پر غالب آ گیا۔ اس نے اپنی ساری قوتیں جمع کر کے اپنے فربہ ہوتے ہمزاد کو پچھاڑنے کی کوشش کی اور اگلے روز تک اس پر قابو پا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اب پھر وہ خود تھا اور کال کوٹھڑی۔ رات کو اطمینان کی نیند سوتا اور دن بھر زندگی کی وڈیو فلم کو ریورس اور فارورڈ کر کے دیکھتا رہتا۔ بچپن، لڑکپن، سکول اور کالج کا زمانہ اور بے فکری کے شب و روز۔

مگر پھر اسے سوتے جاگتے میں کرامتیں، معجزے اور عجیب و غریب خواب دکھائی دینے لگے۔ ایک غیبی ہاتھ چپکے سے قفل کھول کر اسے باہر نکال دیتا۔ قید خانے کی چھت اڑ جاتی اور وہ لٹکتی ہوئی رسی پکڑ کر اڑن کھٹولے ایسی سواری میں سوار ہو جاتا۔ دشمن کے ہوائی جہاز جیل خانے پر بم پھینک دیتے اور سب کچھ تہ و بالا ہو جاتا صرف وہ ملبے سے سلامت نکل آتا۔ وہ جانتا تھا یہ سب اعلی روحانی مقاصد سے روگردانی کی ترغیبات اور نیت میں فتور پیدا کرنے والے شیطانی وسوسے ہیں جو اسے اجر عظیم سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ان خیالات پر بھی قابو پا لیا مگر اس کے باوجود اس کے اندر کی بے کلی پورے طور پر ختم نہ ہوئی۔

سزائے موت کا دن اور وقت مقرر ہو چکا تھا۔ سورج جلدی جلدی طلوع اور غروب ہونے لگا اور ایک روز اسے یہ جان کر دھچکا لگا کہ صرف دو روز رہ گئے

ہیں۔ صرف دو روز، سولہ پہر یا اڑتالیس گھنٹے۔ اس کے بعد وہ یہاں نہیں ہو گا۔ کہیں بھی نہیں ہو گا۔ اس نے اپنے بدن کو ہاتھوں سے چھوا اور دیر تک مختلف اعضا کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ سب بہترین حالت میں تھے۔ جسم پر چوٹوں اور خراشوں کے نشان ضرور تھے مگر جلد صاف، چمکیلی اور جھریوں سے پاک تھی۔ ٹانگیں محفوظ اور اچھی حالت میں تھیں۔ ہاتھ مشکل سے مشکل کام کو بھی آسانی سے کر سکتے تھے۔ دانت سخت چیزیں توڑ اور چبا سکتے تھے۔ ہاضمہ لکڑ ہضم پتھر ہضم۔ اماں کو گردے کی پتھری کی شکایت رہا کرتی تھی اور وہ اکثر درد گردہ سے تڑپا کرتی تھی مگر اسے اب تک معلوم نہ تھا جسم میں گردے ٹھیک کس جگہ ہوتے ہیں۔ آنکھیں ناک اور کان بھی درست تھے۔ وہ اب بھی چاند کی روشنی میں اخبار پڑھ سکتا تھا۔ سنتریوں کے قدموں کی مدھم چاپ سن سکتا اور بہت دور پکتے طعام کی ناگوار بو سونگھ سکتا تھا۔ آخر اس کی عمر ہی کیا تھی اور اس نے زندگی میں دیکھا ہی کیا تھا۔ اگر اسے غیر طبعی انداز میں مرنا نہ پڑ جاتا تو اپنی عمر سے دگنے یا تگنے عرصے تک بہ آسانی زندہ رہ سکتا تھا۔ مگر اس نے سوچا وہ سو برس تک جیتا تب بھی ایک روز موت کو تو آنا ہی تھا۔ پھر آدمی کیوں اس فانی دنیا میں جی لگائے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آدمی پچیس سال کی عمر میں مرے یا پچاس اور پچھتر سال کی عمر میں۔ اور اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آدمی نے کتنے شہر یا ملک دیکھے، کن کن لوگوں سے ملا، کون کون سی کتابیں پڑھیں اور فلمیں دیکھیں۔ اور کیا کچھ کھایا پیا۔ اور جب ایک دن بعد مرنا ہی ہے تو پچھتانے سے کیا حاصل؟

اگلی صبح پہریدار نے اس کی خواہش پر وہ اخبار لا کر دیا جس میں اس کی پھانسی کی مختصر سی خبر چھپی تھی۔ اسے اخبار والوں پر غصہ آیا۔ سب سے اہم خبر کے لئے اتنی تھوڑی سی جگہ۔ انہوں نے پھانسی لگ کر دیکھا ہوتا تب انہیں اس کی اہمیت کا احساس ہوتا۔

وقت گزاری کے لئے وہ اخبار پڑھنے لگا مگر اس کا جی کسی خبر میں نہ لگا۔ سیاسی لیڈروں کے بیانات کہ ہم یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے اور حکومت کے منصوبے اور دعوے کہ فلاں علاقے میں اگلے سال تک بجلی فراہم کر دی جائے گی۔ فلاں سڑک کو کشادہ اور دو رویہ کر دیا جائے گا اس کے لئے کیا معنی رکھتے تھے۔ اس نے اپنے پسندیدہ فلمی صفحے پر نظر ڈالی مگر اس کا جی ان چٹ پٹی خبروں میں بھی نہ لگا۔ کوئی اداکار آئندہ فلاں ہدایتکار کی فلم میں کام نہیں کرے گا یا فلاں ہیروئن فلاں ہیرو سے شادی کر لے گی تو اسے کیا؟ کھیلوں کا صفحہ اور بھی بے معنی نظر آیا۔ کرکٹ میچ میں کون جیتتا کون ہارتا ہے اور سکوائش میں کوئی کھلاڑی اپنے نمبر ون کا اعزاز برقرار رکھ سکتا ہے یا نہیں وہ کیا کرے۔ اتنے بڑے اخبار میں صرف ایک چھوٹی سی خبر سب سے اہم اور سچی تھی مگر وہ اسے دوبارہ پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جرائم سے متعلق خبروں کا گوشہ دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ ہمیشہ کی طرح ملک اور دنیا میں اب بھی قتل، اغوا، چوری، ڈکیتی، سمگلنگ، فرقہ وارانہ فسادات اور دہشت گردی کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ وہ اداس ہو گیا۔ کیا یہ سب اسی طرح ہوتا رہے گا۔ کچھ نہیں بدلا۔ کچھ نہیں بدلے گا۔ کیا اس کی قربانی رائیگاں گئی۔

اس نے اخبار واپس کر دیا اور اٹھ کر بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ دو روز بعد یہ کوٹھڑی خالی ہو جائے گی پھر اس کے بعد کوئی دوسرا اور پھر تیسرا یہاں آتا رہے گا۔ پتہ نہیں اس سے پہلے کون کون اور کیسے کیسے آدمی یہاں آ کر اگلے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ پتہ نہیں، خدا خود شر اور بدی کو مٹا کیوں نہیں دیتا تھا کہ اسے مٹانے کے لئے اس جیسے آدمیوں کو پھانسی لگنا پڑتا تھا۔ کچھ دیر وہ خیر و شر کے مسئلے میں الجھا رہا۔ پھر اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آئی۔ عجیب عورت تھی۔ شاید خدا نے اسے اپنی طرز پر بنایا تھا۔ بچپن میں بہن بھائیوں کی آپس میں لڑائی ہو جاتی اور کوئی دوسرے کو پیٹ ڈالتا تو ماں عدالت لگا کر نہیں بیٹھ جاتی تھی کہ معلوم کرے کس کا قصور تھا۔ وہ پٹنے والے کی چوٹ سہلانے اور پیٹنے والے کو کوسنے لگتی، خواہ اس نے پہل نہ کی ہو۔ تو کیا؟

اس کے آگے اس سوال کا جواب موجود تھا اور آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اس کے ذہن کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اس نے گھبرا کر اسے جھٹک دیا اور ذہن کو الٹے سیدھے سوالوں سے پاک کرنے کی تگ و دو میں لگ گیا۔

ایک صبح وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھا اس کی زندگی کا آخری سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس کا دل لرزنے لگا۔ اس کے غروب ہونے کے بعد وہ آخری رات آ جائے گی۔ جس کے کسی پہر میں اسے جاگتے یا سوتے سے اٹھایا جائے گا اور پھانسی گھاٹ کی طرف چلنے کو کہا جائے گا۔ ممکن ہے اس کی آخری خواہش بھی پوچھی جائے۔ اس کی آخری خواہش کیا ہونی چاہئے۔ اس نے کچھ دیر سوچا۔ مگر کوئی ڈھنگ کی خواہش ذہن میں نہ آئی۔ پھر شاید وہ اس کے ہاتھ پیچھے کو باندھ دیں گے۔ سیاہ کپڑے کا نقاب اس کے چہرے پر چڑھا دیں گے اور گلے میں پھندا ڈال دیں گے۔ جلاد کے کسی مشین کے لیور کو گھمانے کی آواز سنائی دے گی۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے تختہ سرک جائے گا اور اپنے ہی بوجھ سے اس کی گردن کا منکا ٹوٹ جائے گا۔ شاید وہ پھیل کر لمبی ہو جائے گی اور سانس رکنے سے گھبراہٹ ہونے لگے گی۔ وہ چیخنا چاہے گا مگر آواز حلق سے نہ نکل سکے گی۔ تب شاید آنکھوں کے سامنے پھیلا اندھیرا اور گہرا ہو جائے گا۔ جس میں وہ ڈوبتا چلا جائے گا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ صبح کی ہلکی ہلکی خنکی میں اسے پسینہ آ گیا تھا۔ اس نے چاہا اس سے آگے کے اس نوری سفر کے بارے میں قیاس کرے جب وہ اپنے جسد فانی سے نکل کر بلندیوں پر پرواز کرے گا مگر تختے پر کھڑے ہونے، گردن کا منکا ٹوٹنے اور سانس رکنے کے تصور کی ہیبت کے سامنے اسے اور کچھ سجھائی نہ دیا۔ اس نے اٹھ کر ٹہلنا چاہا مگر لگا جیسے ابھی سے جسم میں جان نہ رہی ہو لیکن وہ با وقار طریقے سے موت کا سامنا کرنا چاہتا تھا اس نے خود کو جمع کیا اور اٹھ کر صبح کی ضروریات میں لگ گیا۔

باہر دھوپ پھیل رہی تھی۔ گھڑیال وقفوں سے وقت کا اعلان کر رہا تھا۔ کبھی لگتا کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے گھنٹے جلدی جلدی بج رہے ہیں، کبھی لگتا وقت تھم گیا ہے اور ایک ایک لمحہ گزارنا دوبھر ہو گیا ہے۔ آج اسے ہر چیز بدلی بدلی سی معلوم ہو رہی تھی۔ پہریداروں کا رویہ، ناشتے اور کھانے کا ذائقہ اور گھڑیال کی آواز۔

اس سے پہلے کئی بار اسے پتہ نہ چلتا تھا اس نے دس بجائے یا گیارہ۔ مگر اب ایک ٹائم پیس سا اس کے اپنے اندر بھی چل رہا تھا۔ اور حالانکہ وہ چاہ رہا تھا جلد از جلد اگلے روز کا آخری گھنٹہ بج جائے بلکہ اس کے پاؤں کے نیچے سے تختہ سرک جائے مگر جب گھڑیال ایک اور گھنٹہ گزرنے کا اعلان کرتا تو وہ بڑبڑا جاتا۔

پھر آخری روز کے سورج کے ڈھلتے ڈھلتے جیل کے گھڑیال اور اس کے اندر کے ٹائم پیس میں ایک گھنٹے کا فرق پڑ گیا اور جب اس کے حساب سے تین بجنا چاہئیں تھے اس نے چار بجا دئیے۔ اس کا جی چاہا احتجاج کرے کہ وہ اس کا ایک گھنٹہ کھا گئے ہیں۔ مگر پھر اس نے سوچا اسے بھی تو مغالطہ لگ سکتا ہے اور اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ جہاں لاکھوں گھنٹے جو وہ جی سکتا تھا گم ہو رہے تھے ایک گھنٹہ اور سہی۔ بلکہ شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ اعصاب سے ایک گھنٹے کا بوجھ کم ہو گیا۔

آخری سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ کوٹھری کے بول و براز والے حصے سے ایک بڑا سا کاکروچ نکل کر ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ یہ کاکروچ اکثر نکلتے اور اس کے ہاتھوں ہلاک ہوتے رہتے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے بھی کچل دینا چاہا مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ وہ تو جا ہی رہا تھا اسے کیوں زندگی سے محروم کرے۔ اور وہ اسے کیا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ پھر پتہ نہیں کوٹھری میں کون کب آئے کوٹھری کو زندگی سے خالی نہیں رہنا چاہئے۔ لمحہ بھر کے لئے اسے ان بہت سوں کا خیال بھی آیا جو اس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے مگر اب آخری وقت وہ کسی تاسف اور پشیمانی کا بوجھ اپنے دل پر نہیں لانا چاہتا تھا۔ یوں بھی وہ سب اسے اپنے مقابلے میں خوش نصیب معلوم ہو رہے تھے کہ باتیں کرتے، سودا سلف خریدتے اور راہ چلتے اچانک موت نے انہیں آ لیا تھا اور وہ بغیر کسی خوف، ذہنی تناؤ اور اعصاب شکن انتظار کے مر گئے تھے۔ زخمیوں نے یقیناً اذیت اٹھائی ہو گی مگر زخم بھر جانے اور زندہ بچ جانے کے احساس نے ساری اذیت دور کر دی ہو گی۔ کیا ہی اچھا ہو اس نے سوچا کہ اسے بھی اتنی گہری نیند آ جائے کہ پتہ ہی نہ چلے کب وہ اسے لینے آئے کب اور کیسے وہ پھانسی گھاٹ تک پہنچا اور کب اس کا چہرہ ڈھانپا اور گردن میں پھندا ڈالا گیا۔ مگر نیند تو اسے گذشتہ شب بھی نہیں آئی تھی آج کہاں آ سکتی تھی۔ یوں بھی اس آخری رات کو سو کر گزار دینے کی کیا تک تھی۔۔ اس کے آگے سونا ہی سونا تھا ایک لمبی، چین اور بے فکری کی نیند۔

آخری سورج غروب ہو گیا فضا میں اذانوں کی آوازیں گونجنے لگیں اسے ان آوازوں میں بھی ایک چھپی ہوئی دہشت محسوس ہوئی جیسے زندگی کی شام کی منادی ہو رہی ہو۔ اس نے اٹھ کر نماز پڑھی اور ہمیشہ کی طرح آخر میں خدا سے معافی چاہی کہ اسے کہیں کہیں سے نماز بھولتی تھی۔ ایک آیت سے زبان پھسل کر تیسری یا چوتھی آیت پر جا رکتی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وہ حافظے میں محفوظ آیات کو دو دو بار پڑھ کر حساب برابر کر دیتا تھا۔ مگر آج اس نے ان کو تین تین چار چار مرتبہ دہرایا اور سوچا کہ اللہ بہت عظیم ہے۔ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں کی

باز پرس نہیں کرے گا۔ خصوصاً اب کہ وہ اس کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہو گیا تھا۔ خدا سے اسے اپنے خصوصی تعلق کا احساس ہو رہا تھا اس نے اس کی دنیا کو بدعتوں اور خرابیوں سے پاک کرنے کی خاطر اتنی بڑی قربانی دی تھی۔

آخری کھانے کے بعد اس نے تلاوت شروع کر دی۔ جیل کا گھڑیال اب بھی بجتا تھا مگر اس نے دانستہ طور پر گھنٹوں کی گنتی ترک کر دی تھی۔ اس سے خوامخواہ ایک ہول سا پیدا ہوتا تھا۔ مگر بلند آواز میں تلاوت کرتے کرتے اسے لگا جیسے وہ سو گیا ہے اور خود ہی اپنے سرہانے بیٹھ کر سورہ یٰسین پڑھ رہا ہے۔ اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہونے لگی۔ ہر آہٹ پر وہ لمحہ بھر کے لئے چونکتا کہ شاید وہ آ گئے۔ مگر پھر پتہ چلتا پہریداروں کے چلنے پھرنے کی آہٹ ہے۔ اور حالانکہ اسے غسل کئے کافی دیر ہو چکی تھی اور بند بند کوٹھری میں اسے ہر روز گرمی اور حبس محسوس ہوتا تھا مگر آج اچانک اسے سردی سی لگنے لگی۔ جوں جوں گذشتہ کئی روز کی اعصابی جنگ، خوف، جگراتے اور تناؤ سے نجات کی گھڑی قریب آ رہی تھی اس کی کپکپی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت اسے اپنے عزیز و اقارب یاد آ رہے تھے نہ خیر خواہ۔۔ اس کے دل میں کوئی خواہش تھی نہ حسرت۔ وہ کوئی وصیت کرنا چاہتا تھا نہ نصیحت۔ وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ صرف ایک کپکپی تھی جو اسے لرزا رہی تھی اور وہ اس سے بچنا چاہتا تھا۔ وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا مگر اگلے ہی لمحے اسے لگا جیسے خواب میں چند سائے اس کی کوٹھری میں آئے اور اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس نے چاہا کہ چیخ کر انہیں کہے کہ اصل دہشت گرد تو وہ ہیں مگر کپکپی سے اس کے دانت بجنے لگے تھے آواز اس کے حلق سے نہ نکل سکی۔ اس نے چاہا ایک بہادر آدمی کی طرح سینہ تان کر چلے مگر اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس نے چاہا ایک زوردار قہقہہ لگائے جس طرح عدالت کا فیصلہ سنتے وقت لگایا تھا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ لیکن پھر ان سایوں میں سے ایک نے اسے بتایا کہ وہ اپنے ساتھ یہ اطمینان لے کر جائے کہ دونوں مخالف تنظیموں کے درمیان صلح اور مفاہمت ہو گئی تھی اور رات ٹیلی ویژن پر اس کے سربراہوں کو گلے ملتے دکھایا گیا تھا۔

اس نے چاہا قہقہہ لگائے۔ وہ قہقہہ تو نہ لگا سکا ہنسنے میں ضرور کامیاب ہو گیا۔ مگر مشکل یہ پیش آ گئی کہ کپکپی کی طرح اب یہ ہنسی بھی روکے نہ رک رہی تھی۔ وہ مسلسل ہنستا چلا گیا۔

***

پھوڑا

کئی دنوں سے اس کا دل اچاٹ ہو رہا تھا۔ ہر بات سے نا گواری اور بیزاری کا احساس، اس کا جی کہیں جانے کو نہ چاہتا تھا ا ور کرائے کے اس غلیظ کمرے میں پڑا رہنے سے اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ ایک نا معلوم سی بے کیفی تھی جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی ایک بے نام سا بوجھ تھا جو اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا تھا۔ تیز ہواؤں سے درختوں کے پتے ایک ایک کر کے گرتے اور پھر سڑکوں پر اِدھر اُدھر بھٹکے پھرتے تھے۔ کھیت سونے پڑے تھے۔ درخت ٹنڈ منڈ ہوتے جا رہے تھے۔ شام کو پھیکی پھیکی اداس اور سرد چاندنی درد بن کر پھیل جاتی تھی، آسمان پر وہی صدیوں پرانے بے ڈھنگے ان گنت ستارے ابھر آتے اور ٹیڑھی میڑھی کہکشاں کا باسی ہار نظر آنے لگتا جس میں اب کوئی دل کشی نہ رہ گئی تھی۔ رات کو جب وہ کورس کی خشک کتابیں سمیٹے اور بتی بجھائے بغیر سونے لگتا تو اس کے ذہن میں ایک درخت سا اگ آتا جس کی لمبی لمبی شاخیں زمین تک جھکی ہوئی ہوتیں اور چاروں طرف سے ان گنت چیونٹے ان شاخوں کی طرف دوڑنے لگتے پھر یہ چیونٹے ان شاخوں کر الگ ہو جاتے پھر وہ ارادے کی کند اور زنگ آلود آری سے ذہن میں اگے ہوئے درخت کو کاٹنے لگتا مگر دوسرے ہی لمحے وہ درخت پھر سے اگ آتا۔ اس کی شاخیں زمین کو چھونے لگتیں اور ان گنت تیز رفتار چیونٹے ان شاخوں کی طرف لپکنے لگتے!

وہ بی اے کا طالب علم تھا۔

مگر کئی ہفتوں سے اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا تھا وہ اس سے پہلے دو بار امتحان میں فیل ہو چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کے فیل ہونے کا سبب اس کے ذہن میں اگنے والا یہی درخت تھا یا رات بھر شاخوں سے چمٹے رہنے والے برہم، رینگتے اور کاٹتے چیونٹے۔ اس کا غریب باپ اسے بہت بڑا افسر بنانے کے خواب دیکھتا تھا اور ہر ماہ باقاعدگی سے منی آرڈر بھیجتا تھا اس نے اپنے باپ کو اپنے فیل ہونے کی خبر نہ ہونے دی تھی۔ اور اب کہ وہ بی اے کے امتحان کی تیسری بار تیاری کر رہا تھا اس کے دیہاتی باپ کا خیال تھا کہ وہ سولہویں جماعت کا امتحان دے کر چکا ہوتا۔ اگر اس کی ذہنی حالت یہ نہ ہوتی کیونکہ اس سے پہلے سکول اور کالج کے ابتدائی زمانہ میں اس کا شمار ذہنی حالت یہ نہ ہوتی کیونکہ اس سے پہلے سکول اور کالج کے ابتدائی زمانہ میں اس کا شمار ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ مگر اب اسے نہ جانے کیسا زنگ سا لگ گیا تھا کہ کتاب کے حروف اسے رینگتے ہوئے نظر آتے تھے وہ کتاب کھول کر پڑھنے لگتا کئی کئی صفحے پڑھ جاتا مگر پھر اسے محسوس ہوتا کہ

اس نے کتاب کا ایک حرف تک نہیں پڑھا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ کتابیں دریا میں پھینک کر گاؤں چلا وہ اب ہل چلانے، نلائی کرنے اور مویشی چرانے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ پھر اس کا جی چاہتا کپڑے پھاڑ کر الف ننگا شہر کی سڑکوں پر ناچتا پھرے، لوگ اسے پتھر ماریں اس کا جسم لہو لہان کر دیں اور وہ قہقہے لگاتا رہے۔

اس کا جسم بہت مضبوط اور گٹھا ہوا تھا--- اگر وہ پڑھائی کے چکر میں نہ پڑ جاتا تو گاوں کے کبڈی کھیلنے والے مشہور نوجوانوں میں آس کا شمار ہوتا مگر اب صورتحال بے حد مختلف تھی اس کی مد مقابل کتابیں تھیں اور ہر کتاب ناقابل شکست کھلاڑی کی طرح اس کے سامنے سینہ تانے کھڑی تھی۔

کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ کمرے کی دیواروں سے ٹکریں مارے یا پھر لنگوٹ باندھ کر نعرے لگاتا ہوا گلی میں نکل آئے اور ہر آتے جاتے کو اٹھا کر پٹخ دے۔

میٹرک میں اس کی بڑی اچھی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ ایف اے میں بھی اچھی سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوا تھا۔ اس حساب سے اسے تھرڈ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کر لینا چاہئے تھے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اصول دوسرے لوگ بناتے ہیں۔

پھر اسے کتابوں میں نرم و ناز سے چہرے نظر آنے لگے۔ یہ وہ بے شما چہرے تھے جو وہ دن بھر شہر کی گلیوں بازاروں، بس سٹاپوں اور سینماؤں میں دیکھتا تھا۔ سیاہ برقعوں سے جھانکتے ہوئے سفید چہرے ادھ کھلے اور پورے کھلے چہرے گول اور بیضوی چہرے لپ اسٹک جوڑے، کاجل کر دوڑے--- وہ ان چہروں سے نظریں ہٹانے کی کوشش کوتا تو نیم عریاں جسم اس کی نگاہوں میں ابھرنے لگتے نئی وضع کا تنگ لباس جیسے لمبے جوڑے مضمون کو ایک ہی مصرعہ میں باندھ دیا گیا--- انار کلی سے مال تک حسن کا راوی پورے زور و شور سے بہتا تھا۔ ہر طرف چہروں اور جسموں کا میلہ لگا ہوا تھا اور اس نے اتنے بہت سے چہرے ذہن نشین کر رکھے تھے کہ اگر وہ شاعر ہوتا تو زندگی بھر ان چہروں پر غزلیں اور نظمیں کہہ سکتا تھا۔ مگر وہ شاعر تھا نہ۔ افسانہ نگار۔ اسے تشبیہوں، استعاروں، تمثیلوں اور علامتوں کے سہارے اپنے ذہن کی حدت کو اگلنے کا فن نہ آتا تھا۔ پچھلے دنوں جب اس کا جی چاہا کہ وہ کسی سے محبت کرے تو اس نے چند ایک عشقیہ خطوط لکھ کر اس کی ریہرسل بھی کی تھی۔ کئی بار اس نے تنہائی میں بڑے ہی خلوص سے کہا تھا ''مجھے تم سے محبت ہے۔'' اور پھر دیر تک اپنی آواز کی گونج سنتا رہا تھا۔ مگر اب اس کا جی کسی سے محبت کرنے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس کے اندر کسی سے لڑنے جھگڑنے یا کسی کو قتل کرنے کی خواہش بھڑک اٹھتی تھی یا پھر اس کا شراب پینے اور کسی دیوار کو ٹھوکر مار کر گرا دینے کو جی چاہنے لگتا تھا مگر اس کا کوئی شوق کبھی پورا نہ ہوا تھا اور اب وہ کتابوں سے بھی نفرت کرنے لگا تھا۔ وہ اس گلی سے نفرت کرنے لگا تھا جہاں عورتوں کی تو کثرت تھی مگر وہ اس کے کالج سے لوٹنے اور مردوں کے دفتروں سے آنے کے بعد کسی جھرو کے یا کھڑکی کے پاس نہ

آتی تھیں وہ اپنی بے مزہ، بے کیف اور تھکاوٹ سے چور زندگی سے تنگ آ گیا تھا اور اب اسے کسی نئی بیٹھک اور نئی گلی کی تلاش تھی۔

آخر اس ایک با رونق محلہ میں ایک بیٹھک مل گئی۔ یہ بازار نما گلی تھی جو پورے محلے کی گزر گاہ تھی اور یہاں چہروں کا سیلاب آتا تھا ان چہروں کا انتخاب وہ اپنے ذہن میں رکھتا تھا اور پھر ان کے ساتھ اپنی مرضی اور پسند کا جسم لگا لیتا تھا۔ آس پاس کئی کئی منزلہ خوبصورت مکان تھی جن کے دروازوں کھڑکیوں اور چھجوں پر جسم اور چہرے لہراتے تھے۔ وہ کالج سے سیدھا گھر آنے کی بجائے چہرے دیکھنے کیلئے مارا مارا پھرتا رہتا مگر ہر شام وہ اپنے گھر آ جاتا اور پھر بیٹھک کے تھڑے پر کرسی ڈال کر بظاہر کتاب پڑھتا مگر اندر ہی اندر عشقیہ خطوط ٹائپ کرتا رہتا۔

اس گلی میں آ کر وہ اور بھی بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا۔ رات کو جب کبھی وہ تھڑے پر کھڑا ہو کر بلند مکانوں کی کھڑکیوں کی طرف دیکھتا تو اس کا جی چاہتا کہ کمند پھینک کر وہ کسی مکان پر چڑھ جائے مگر پھر وہ اپنے بستر کر کتاب اٹھا لیتا اور ورق گردانی کرنے لگتا۔

کئیبار اس نے رات کی دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر پھوڑ لیا مگر خون کا کوئی قطرہ کبھی اس کے سر سے نہ بہہ سکا۔۔ کئی بار اس نے اپنے کپڑے تار تار کر دئیے مگر کبھی اس کی پتلون کی کریز تک خراب نہ ہوئی۔ کئی بار س نے رات کو خود کشی کر لی مگر دوسرے روز کالج جانے کے لئے وقت پر تیار ہو گیا۔

اس نئی گلی میں آئے ہوئے اسے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اس نے ایک آٹھ دس سالہ لڑکی پروین سے دوستی گانٹھ لی کیونکہ وہ جس مکان کی سیڑھیاں اتر کر آتی تھی۔ اس مکان کے چھجے پر کبھی کبھی ای نوجوان عورت نظر آتی تھی اور اسے معلوم تھا کہ پروین کی عمر کی لڑکیاں بے حد کار آمد ہوتی ہیں۔ یہ نابالغ فتنے فولاد کی آریاں بن کر گھر کے بڑے بڑے تن اور درختوں کو کاٹ کر رکھ دیتے ہیں خطوط اور پیغامات کے تبادلے ہوتے ہیں اور جب تک ان درختوں کی ٹہنیاں سوکھتی اور پتے چر مراتے ہیں یہ چھوٹے فتنے خود بڑھ کر طوفان اٹھاتے اور اپنی ہم جولیوں، پڑوسنوں اور ہم سِنوں کو گرد و غبار کی طرح میدان میں لے آتے ہیں کچھ ہی عرصہ میں پروین کی وساطت سے زینت اکثر چھجے پر آنے اور مسکرانے لگی۔

زینت کے گھر کے سامنے پیپل کا پرانا درخت تھا جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں وہ اکثر سوچتا کہ پیپل کے اس درخت پر چڑھ کر وہ زینت کے گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔ وہ اکثر تھڑے پر چارپائی بچھا کر رات بھر پیپل کو گھورتا رہتا۔ تب اس کے جسم میں اچانک سوئیاں سی چبھنے لگتیں اور اس کا جی چاہتا بہت سے کیڑے مکوڑے چیونٹے یا پھر جونکیں اس کے جسم سے لپٹ جائیں اور اس کا بہت سارا خون چوس ڈالیں۔ کئی بار س کا جی چاہا کسی نیم حکیم سے سینگیاں یا حجام سے پچھنے لگوائے یا پھر خود ہی چاقو سے ران کاٹ کر بہت سا خون بہا ڈالے۔

ایک شام زینت کے رشتہ داروں میں کوئی حادثے کا شکار ہو گیا۔ زینت کے گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ وہ حسب معمول تھڑے پر کرسی رکھے بظاہر پڑھ رہا تھا مگر اندر ہی اندر تانگوں میں سوار ہوتے ہوئے زینت کے گھر والوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے چھجے کی طرف دیکھا۔ زینت ہنس معمولی چھجے پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل خوشی اور کسی انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔ اسی لمحے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب ادھر سے گزرے۔ انہوں نے قریب آ کر کہا۔

''بیٹا تم یہاں رہتے ہو۔۔۔ مسجد میں تمہیں کبھی نہیں دیکھا،؟

''جی وہ۔۔۔'' اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، مولوی صاحب کہنے لگے۔

''بیٹا مسجد میں آیا کرو، خدا خوش ہوتا ہے اور دل کو سکون ملتا ہے۔''

مولوی صاحب یہی بات اگر کسی اور موقع پر کہتے تو شائد اتنی بری نہ لگتی مگر اب اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر مولوی صاحب نے جرح نہیں کی اور چلے گئے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر چھجے کی طرف دیکھنے لگا۔

جب دکانیں بند ہو گئیں اور گلی میں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو وہ تھڑے سے اتر کر زینت کے گھر کی طرف بڑھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اس نے ہولے سے دستک دی مگر دروازہ نہ کھلا۔ تب اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ ملا تھوڑے تھوڑے کے ساتھ وہ دروازے پر مکے مارتا رہا مگر دروازہ نہیں کھلا اسے ڈر سا لگا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ جاگ نہ جائیں۔ وہ واپس اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا اور پیپل کے درخت کے سہارے زینت کے گھر میں داخل ہونے کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

لیٹے لیٹے اس کے ذہن میں درخت اگنے لگا۔۔۔ یہ بالکل پیپل کا وہی درخت تھا جس پر چڑھ کر وہ زینت کے گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔ شاخوں پر ان گنت چیونٹے رینگ رہے تھے مگر وہ ان کے کاٹنے کی تکلیف کا دادی ہو چکا تھا وہ اس درخت پر چڑھنے لگا اچانک شاخوں سے لاکھوں کروڑوں چیونٹوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اور اسے نوچنے لگے۔ شدت درد سے وہ بلبلا اٹھا اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ پھسل کر دھڑام سے گلی کے پکے فرش پر گر پڑا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ اس کے جسم کا سار خون بہہ گیا۔ اس نے چیخنا اور مدد کے لئے پکارنا چاہا مگر اواز اس کے حلق میں گھڑ کر رہ گئی۔ وہ بیہوش ہوتا گیا۔ اس کے سینے پر ایک وزنی پتھر نہ جانے کس نے رکھ دیا تھا وہ حرکت بھی نہ کر سکتا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو بی اے کی گائیڈ اس کے سینے پر پڑی تھی اور فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

***

ریت اور پانی

جس روز اس کی تصویر اخباروں میں چھپی اس رات اس نے پھر وہی نہر میں پانی آگے آگے دوڑنے والا خواب دیکھا۔

اس نے دیکھا ا کہ وہ بلند کناروں والی نہر میں پانی کے آگے آگے اس طرف کو دوڑ رہا ہے جدھر پانی بہتا ہے۔ اس کے پاؤں ریت میں دھنس جاتے ہیں۔ مگر وہ گرتا پڑتا پھر سے اٹھ کر بھاگنے لگتا ہے اور شوکتا ہوا پانی اس کے پیچھے لپکتا چلا آ رہا ہے۔

جب اس کی آنکھ کھلی وہ پسینے میں تر تھا اور اس کے کپڑوں، نتھنوں، سر اور ڈاڑھی کے بالوں اور منہ میں ریت تھی اور دوڑ دوڑ کر اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔

اس نے اپنے کپڑوں سے گرد اور ریت جھاڑی۔۔۔ کھنکار کھنکار اور تھوک تھوک کر گلے اور دانتوں میں پھنسی ہوئی ریت کے ذرے نکالے اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اور وہ یہ دیکھ کر لرز گیا کہ اسکے چہرے کی رنگت بدل چکی تھی

اسے اسی دن سے خوف آتا تھا۔

اس نے اس پریشانی پر قابو پانے کیلئے کئی جتن کئے تھے۔ اس نے شہرت کے تن اور درخت اگائے۔۔۔ صدقات و خیرات کی نہریں بہائیں اور کیمیائی کھادیں ڈال ڈال کر نیکیاں کاشت کیں۔

وہ اکثر نیکیوں کی گٹھڑی اٹھائے شہر میں نکل جاتا اور اپنے رشتہ داروں اور جان پہچان کے لوگوں کے گھروں پر دستکیں دیتا اس کا خیال تھا کہ اس طرح کے چہرے کی رنگت تبدیل ہو جانے کے بعد بھی اُسے پہچانا جا سکے گا۔ لیکن پھر بھی ایک نا معلوم سا خوف گٹھڑی کھلتے ہی باہر نکل آتا اور اسے اپنی گٹھڑی میں باندھ لیتا۔

کچھ عرصہ سے اس کی گٹھڑی کا حجم چھوٹا ہو گیا تھا اور وہ زمین جس میں وہ نیکیاں کاشت کرتا تھا۔۔۔ بنجر ہو گئی تھی۔ شائد اس لئے کہ زمین محنت اور پسینہ مانگتی تھی اور محنت کے خیال سے ہی اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ ممکن ہے اس کے چہرے کی رنگت تبدیل نہ ہوئی ہو اور یہ اس کا وہم ہو۔۔۔ وہ دل کڑا کر کے دروازہ کھول کر بارہ آیا۔ اس کی بیوی صحن میں چہل قدمی کر رہی تھی اسے دیکھتے ہی چیخ مارکر اندر بھاگی۔ چیخ سن کر مالی، بیرا اور خانساماں دوڑتے ہوئے آئے اور اس پر حملہ آور ہوئے۔

اس نے بھاگ کر اپنی بیٹی کے کمرے میں پناہ لی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا اس کی بیٹی نیم عریاں حالت میں سو رہی تھی آہٹ سن کر جاگ اٹھی اور چلانے لگی۔

''بچاؤ بچاؤ''

''ثمینہ میری بیٹی۔۔۔ یہ میں ہوں ''

مگر ثمینہ کو یقین نہ آیا وہ چیختی رہی تب اسے یقین ہو گیا اس کے اور اس کے عزیزوں کے درمیان اس کے چہرے کی رنگت حائل ہو گئی ہے۔ ملازمین دروازہ توڑ رہے تھے وہ کھڑکی سے کود کر سڑک پر آ گیا ور سرپٹ بھاگنے لگا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا تو اس نے اس گھر کا رخ کیا جہاں اسے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا سا پیار ملا تھا اور وہ اسے بیٹا بناتے وقت پھولے نہیں سمائے تھے۔

جب وہ اندر پہنچا وہ بوڑھا جو اسے بیٹا بنتے وقت پھولے نہیں سمایا تھا اپنے اصلی بیٹے سے مصروف گفتگو تھا اسے دیکھ کر دونوں کی تیوریاں چڑھ گئیں بوڑھے نے کرخت لہجے میں دریافت کیا۔

''کون ہو تم۔۔۔ اور منہ اٹھائے کدھر چلے آتے ہو؟''

اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ریت اس کے گلے میں پھنس گئی اس نے بے بسی سے گردن جھکا لی اور باہر نکل آیا۔

چوک میں اسے اپنا دوست س مل گیا اور نے س سے لپٹ کر کہا۔

''خدا کا شکر ہے تم مجھے مل گئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے''

''لیکن تم کون ہو؟'' س نے اسے الگ کرتے ہوئے بے اعتنائی سے پوچھا۔

اس نے س کے منہ پر تھوکنے کی کوشش کی مگر اس کے منہ میں تھوک خشک ہو گیا تھا۔

پھر اس نے ہر جانے نوجوان نے کھڑکی سے سر بار نکال کر اسے فحش گالی دی اور چلا گیا وہ اپنے بیٹے کی اس حرکت پر اور ملول ہوا اور غصے اور ندامت کے احساس نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔

چلتے چلتے اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں اور زمین کے درمیان سو کول تار کی موٹی تہہ ہٹ گئی ہے اور اس کے پاؤں ریت میں دھنسنے لگے ہیں۔

اپنے آپ کو بلند کناروں والی نہر میں ریت پر چلتے ہوئے پا کر اسے اپنا خواب یاد آیا اس نے پلٹ کر دیکھا شوکتا ہوا پانی اس کے پیچھے لپکتا چلا آ رہا تھا۔

پانی کے آگے دوڑ دوڑ کر وہ تھک چکا تھا اس نے دل کڑا کر کے عمومی کنارے کا رخ کیا اور بھر بھری ریت اور گیلی مٹی میں نیچے گاڑ گاڑ کر اوپر چڑھنے لگا۔

جب وہ باہر آیا اس کی سائیکل پٹڑی پر کھڑی تھی۔ اس کے ہینڈل سے تھیلا لٹک رہا تھا جس میں مٹھائی تھی--- جو وہ اول درجے میں پاس ہونے کی خوشی میں ماں کے ہاتھ سے کھانا چاہتا تھا۔

اس نے سائیکل کے پچھلے پہئے کو ٹٹول کر دیکھا اس میں ہوا نہیں تھی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اور راستوں پر چپ کی تل پر ویرانی لدی مارتی پھرتی تھی۔ وہ سائیکل تھام کر پیدل چلنے لگا۔ اسے گھر کی چھت پر کھڑی ماں کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ گھر کی تاہنگ اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگی اور ماں کی نگاہیں بار بار اس کے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگیں۔

آج اسے بہت دیر ہو گئی تھی مگر وہ مطمئن اور خوش تھا کہ آج اس کا ایک سفر ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ بڑے شہر چلا جائے گا جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہوسٹل میں رہے گا اور پندرہ میل لمبے اس راستے پر پیڈل مار مار کر ہلکان ہونے کی پھر کبھی نوبت نہ آئے گی۔

اس کے راستے میں دس میل لمبی نہر اور پانچ میل لمبی کچی سڑک آتی تھی کچی سڑک نہر کے پل پر سے اتر کر سیدھی اس کے گاؤں جاتی اور اسے پہنچا کر آگے نکل جاتی تھی۔

دونوں جانب آبادیاں تھیں اور راستے کے تمام مویشی، پرندے، کتے، درخت، پل،میل، پتھر، کھمبے اور گڑھوں میں کھڑے ڈیڈمین اسے ازبر تھے۔ ہر شخص اسے پہچانتا تھا کہ وہ کس سال کون سی جماعت میں ہے۔ ہر آہٹ پر بے طرح سے بھونک اٹھنے والے اور ہر سوار کا دور تک پیچھا کرنے والے کتے اس کی آمد پر یوں چپ چاپ لیٹے رہتے جیسے اس نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہو کبھی کبھی وہ ان کی سرد مہری سے تنگ آ جاتا تو انہیں شِشکارتا سائیکل کی گھنٹی بار بار بجاتا مگر وہ کروٹ

تک نہ بدلتے۔ راستے کے لوگ اس کے آمد کے منتظر رہتے، سلام کر بدلے میں وہ دعائیں وصول کرتا جاتا۔۔۔

''مجھے پیاس نہیں ہے چچا۔۔۔ ابا میرا انتظار کر رہا ہو گا۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے ماسی۔۔۔ میری ماں راہ دیکھ رہی ہو گی۔''

وہ اس کے ہاتھ سودا سلف بھی منگا لیتے۔۔۔ ہل کر پھالا۔۔۔ ہاضمے کا چورن۔۔۔ کروشیئے کا دھاگہ، حقے کی نے تچ بٹن، پھمن، ٹلیاں اور گانیاں۔۔۔ گاؤں کا دکاندار تا جا بھی کبھی کبھی شہر آ جاتا۔ واپسی پر تا جا بہت سا سامان اس کے پیچھے بھی لاد دیتا پھر اس کا جی بہلانے کے لئے عجیب و غریب قصے سناتا، قبرستان میں آدھی رات کو الاؤ کے گرد ناچتی عورتوں، قبروں میں عذاب سے دو چار چیختے چلاتے مردوں، باتیں کرتے کرتے غائب ہو جانے والے ہم سفروں اور دئیے جلا کر راتوں کو آگے آگے چلنے والے بھوتوں کے قصے۔۔۔ وہ تاجا کی باتیں دلچسپی سے سنتا لیکن اسے خوف نہیں آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تاجاکو گپ ہانکنے کی عادت ہے۔

لیکن جب وہ اکیلا ہوتا راستے کے دونوں جانب تاجا کی گپوں کے تھوہرا لگتے اور دیکھتے ہی دیکھتے حد نظر تک پھیل جاتے۔ ہر درخت پل، میل پتھر اور سائفن کو دیکھ کر وہی کہانی یا گپ اسے یاد آ جاتی جو وہاں سے گزرتے وقت کبھی تا جانے سنائی ہوتی۔ وہ ان تھوہروں سے بچنے کیلئے بلند آواز میں ٹپے، ماہئے اور فلموں کے گیت گاتا اور اسے ایسا لگتا جیسے راستے کے دونوں جانب اس کے گیت سن کر خوبصورت کھمبیاں اگ آئی ہیں۔

نہر کی پٹڑی پر سائیکل تھامے چلتے چلتے اس نے دیکھا کہ اندھیرا پھیل گیا ہے اور خاموشی اور گہری ہو گئی ہے۔

اگر سائیکل خراب نہ ہوتی تو وہ زور زور سے پیڈل چلاتا اب تک گھر پہنچ گیا ہوتا۔ اسے اپنا گھر اور گھر کے سب لوگ دکھائی دے رہے تھے۔

ابا گھبرا کر گاؤں سے باہر نکل آیا تھا اور گھوڑ دوڑ والے میدان کے ٹیلے پر چڑھ کر اس کا انتظار کر رہا تھا اور اس کی سائیکل کی آہٹ کے لئے ترس رہا تھا۔

ماں۔۔۔ دن بھر کی جمع کی ہوئی چھوٹی چھوٹی کھانے پینے کی چیزوں کی طرف بار بار دیکھتی تھی اور چنگیر میں رکھی گرم روٹیوں کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں بھی ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔ ننھا شام سے بلا وجہ ضد کر رہا تھا اور چھوٹی بار بار کوئی ایسا سوال پوچھ بیٹھتی تھی کہ ماں کا خون کھولنے لگتا تھا۔

''ماں گیڈر آدمی کو کھا تو نہیں سکتا نا۔''

''ماں، آدمی بہتے پانی میں گر جائے تو فوراً نہیں ڈوب جاتا؟''

دوپہر کو گاؤں میں ریڈیو پر میٹرک کا نتیجہ نکلنے کی خبر سن کر وہ باپ سے مٹھائی کے پیسے اور ماں سے دعائیں لے کر روانہ ہوا تھا۔ وہ اگلے روز بھی جا سکتا تھا مگر اسے پاس ہونے سے زیادہ اپنی ڈویژن کی فکر تھی۔

اچانک اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا ایک تیز رفتار اونٹ جس کی پیٹھ پر ایک سفید ریش بوڑھا سوار تھا اس کے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی مگر وہ خوف زدہ نہیں ہوا۔ پھر اونٹ بلبلایا بوڑھے نے قہقہہ لگایا اور دونوں غائب ہو گئے۔

اگلے پل پر اسے بہت سے کتوں نے آ گھیرا بہت سے کتے اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں جمع ہو گئے اور اس کی ٹانگوں کی طرف لپک رہے تھے اس نے انہیں چمکارا۔۔۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو کر دمیں ہلانے لگے۔

اچانک اس کے ہاتھ سے کسی نے سائیکل چھین لی۔

اس نے چونک کر دیکھا۔

اس کے سامنے پولیس کا سپاہی کھڑا تھا۔ مال روڈ کی بتیاں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں اور اس کے چاروں طرف لوگ جمع تھے۔

***

راستے بند ہیں

وہ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

میں اس سے پوچھتا ہوں۔

’’جب تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی تو تم میلہ دیکھنے کیوں آئے ہو؟‘‘

وہ پہلے روتا اور پھر ہنستا ہے اور کہتا ہے۔

’’میں میلے میں نہیں آیا۔۔ میلہ خود میرے چاروں طرف لگ گیا ہے اور میں اس میں گھر گیا ہوں۔ میں نے باہر نکلنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر مجھے راستہ سجھائی نہیں دیا۔‘‘

مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لئے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کی نگہداشت پر مامور ہوں۔ مجھے نہیں معلوم،مجھے اس کی نگہداشت پر کس نے مامور کیا ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر وقت اس کے ساتھ رہنا اور اسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔

میلہ زوروں پر ہے۔

چاروں طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں جتنے لوگ میلے سے جاتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ آ جاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہر طرف تانگے، بیل گاڑیاں، بسیں، ٹرک، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایک دوسری سے آگے نکلنے کی ناکام کوشش کرتی، ہارن بجاتی اور دھواں اڑاتی نظر آتی ہیں۔ ہارن بجا بجا کر ڈرائیوروں کے اور مسلسل گھنٹیاں بجا بجا کر سائیکل سواروں کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے چہرے دھول سے اٹے ہوئے ہیں اور کپڑوں پر گرد جمی ہے۔لیکن میلے کے شور نے ان کے تھکے ہوئے نڈھال جسموں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ میلے کی فضا کو دھوئیں، گرد اور شور و غل کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بڑے بڑے لاؤڈ سپیکروں پر انسانی آوازیں گرجتی اور چنگھاڑتی ہیں۔ جھولوں کی چیخیں۔ ڈھولوں کی گھمکاریں، مداریوں کی بانسریوں کی کوکیں اور خوانچہ فروشوں کی صدائیں ایک دوسری میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ان سینکڑوں قسم کی آوازوں کے شور میں اسے

سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی ’بک ‘جیسی آواز سب سے اچھی لگتی ہے۔ وہ اسے کسی سریلے نغمے کی طرح سنتا اور چاٹتا ہے۔ میں نے کئی بار چلا چلا کر اسے آگے بڑھنے کے لئے کہا ہے مگر وہ سوڈا واٹر کی دکان کے سامنے پتھر ہو گیا ہے میرے لئے عجیب مشکل ہے۔ کاش میں اس سے علیحدہ ہو سکتا، اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتا۔ میں اس کی کمینی حرکتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ عجیب ندیدہ آدمی ہے۔ صبح وہ کتنی ہی دیر تک اس بھٹی کے قریب کھڑا جھلستا رہا جس پر پوریاں تلی جا رہی تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں وہ بار بار جیب میں ہاتھ ڈالتا پھر خالی ہاتھ کو یوں گھورتا جیسے اس کی ہتھیلی پر گرم گرم پوری رکھی ہو۔ عجیب واہیات انسان ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکڑوں بیٹھے کتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا، جتنا حلوا پوری کھاتے اور فالودہ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔

وہ میلہ دیکھنے آیا ہے۔

اور میلے میں دیکھنے کی سینکڑوں چیزیں ہیں۔ تھیٹر کے مسخرے، ناچتی گاتی عورتیں، سرکس کے جانوروں کے کرتب، موت کے کنوئیں میں چلتی موٹر سائیکل اور چلانے والے کی گود میں بیٹھی ہوئی لیڈی، اوپر نیچے جاتے جھولے۔ فلم کی سکرین پر دو گانے گاتے ہوئے عاشق و معشوق اور مداری کے توپ چلاتے طوطے۔لیکن اسے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں حالانکہ سرکس کے باہر فلمی ریکارڈوں کی دھنوں پر ناچتے مسخروں کو دیکھنے پر تو خرچ بھی کچھ نہیں آتا مگر اسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اسے پھلوں، مٹھائیوں، فالودوں، آئس کریموں، سوڈا واٹر کی بوتلوں اور سیخوں میں پروئے ہوئے مرغوں کو دیکھنا،گھورنا اور ان کی خوشبو سونگھنا اچھا لگتا ہے اور حالانکہ دونوں وقت پیر صاحب کے ڈیرے پر اسے بھنڈارے کی دال روٹی مل جاتی ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ رات وہ مجھے دیر تک ان مٹھائیوں، پھلوں اور چیزوں کے نام گنواتا رہا جو اس نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ یہ فہرست اتنی طویل تھی کہ میں اکتا گیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کے نام بتائے جن کے ذائقے سے وہ آشنا تھا لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لذیذ چیزوں کے ذکر سے حاصل ہونے والی لذت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

میلے میں اس کی جان پہچان کے اور لوگ بھی ہیں۔

الٰہی بخش نمبردار کا لڑکا عاشق ہے جو اپنے یار دوستوں کے ہمراہ اپنے یکے پر آیا ہے اور اس کے ڈیرے پر ہر وقت مجرا ہوتا رہتا ہے اور شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ طوائفیں سروں پر رکھے اور دانتوں سے پکڑے ہوئے نوٹ چن چن کر تھک جاتی ہیں اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ وہ عاشق کے ڈیرے پر چلا جائے لیکن میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں دن رات چلمیں بھرتا رہے۔ پھر سردار محمد تھانیدار ہے، جسے اعتباری آدمیوں کی ضرورت بھی ہے، لیکن میں نے اسے سردار محمدؔ کے پاس جانے سے بھی منع کر دیا ہے۔علیاؔ نائی اپنے حال میں

مست ہے۔ وہ میلے میں خالی ہاتھ نہیں آیا اپنے ساتھ رچھانی لیتا آیا ہے۔ اس کا جب جی چاہتا ہے حجامتیں بنانے لگتا ہے اور جب جی چاہتا ہے تھیٹر دیکھنے چلا جاتا ہے۔ تھیٹر دیکھتے ہوئے بھی وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ناخن تراشتا رہتا ہے۔ صرف مہروّ سانسی ایک آدمی ہے جو اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خوشی کے اظہار کے لئے جب بھی سامنے آتا ہے دانت نکالتا ہے یا پھر کالو ہے جو اسے دیکھتے ہی دم ہلانے لگتا ہے حالانکہ اس نے زندگی بھر اسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا تک نہیں ڈالا۔

اسے مہروّ سانسی اچھا لگتا ہے شائد اس لئے کہ مہروّ گندی جھوٹی چیزیں سہی،ہر طرح کے ذائقوں سے آشنا ہے۔ پچھلی بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ رات کو جب اچانک آندھی آ گئی تو وہ کالو کے ساتھ پناہ لینے کے لئے ایک تخت پوش کے نیچے گھس گیا۔تخت پوش کے نیچے قلاقند سے بھری کڑاہی رکھی تھی جسے اس نے اور کالو نے خالی کر دیا۔ اس دوران مہرو کو باہر نکل کر دو بار گلے میں انگلی ڈال کر قے کرنا پڑی تھی۔ اگر کالو کی دم اس کے پاؤں کے نیچے نہ آ جاتی تو ایک آدھ بار اور قے کر کے وہ گلاب جامنوں کا بھی صفایا کر دیتا۔ اسے مہرو اور کالو پر رشک آتا تھا اگر میں اس کے ہمراہ نہ ہوتا یا غفلت برتتا تو وہ یقیناً بھٹک جاتا۔۔ چلمیں بھرتا۔۔ دلالی کرتا یا پھر کسی تخت پوش کے نیچے گھس کر قلاقند یا گلاب جامنیں کھا رہا ہوتا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دکاندار یا پولیس کے حوالے کر دے۔ لیکن میں نے ہر لمحہ اسے ایسی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔

میلے کا آج تیسرا روز ہے۔ اور میں نہایت مشکل میں ہوں۔

وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔

مجھے اس کے تیور بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی ’بک‘ جیسی آواز سن کر اس کی تشفی نہیں ہوتی۔

وہ حلوہ پوری، قلاقند اور بالو شاہی کے ذکر سے مطمئن نہیں ہوتا۔

بھنے ہوئے گوشت اور روسٹ مرغ کی خوشبو سے اس کا جی نہیں بہلتا۔ اور وہ پھلوں کے نام گنوا کر لذت حاصل کرنے پر قناعت نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا ہے،لعن طعن کی ہے، لیکن وہ مصر ہے۔ وہ ہر قیمت پر ان سب چیزوں کو چکھ کر دیکھنا چاہتا ہے جن کے ذائقے سے وہ نا آشنا ہے۔گزشتہ رات ہم دونوں دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو مجھے زندہ نہ دیکھے گا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اگر اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تو گھٹ کر مر جائے گا۔

میں عجیب الجھن میں ہوں۔ شائد وہ وقت آ گیا ہے جب ہمیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم دونوں میں سے کسے زندہ رہنا چاہیے۔

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لیکن میں اسے بھی زندہ، خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی توجہ بٹانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے مداری کے کرتب، جھولوں کے مناظر اور مسخروں ہیجڑوں کے ناچ دکھانا چاہتا ہوں لیکن وہ قیمہ کریلے، بھنے ہوئے گوشت،روسٹ مرغ اور قلاقند کے ذائقوں کے لئے قتل و غارت پر اتر آیا ہے۔

وہ کہتا ہے ''جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو میں ان کے ذائقوں سے محروم کیوں ہوں۔''

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیسے سمجھاؤں اور بھٹکنے سے بچاؤں ؟

میلے کا آخری اور چوتھا روز ہے۔

رات مجھے ایک نہایت اچھوتا خیال سوجھا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اصل میں سب انسان ایک ہی انسان کا پرتو ہیں، یا اصل میں انسان ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ قلاقند کھا رہا ہے۔ کہیں ناخن تراش رہا ہے کہیں روسٹ مرغ اڑاتا ہے اور کہیں بھنڈارے کی دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے یا کھایا پیا جا رہا ہے اس کی لذت انسان کی مشترکہ لذت ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو حلوہ پوری کھاتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ خود حلوہ پوری کھا رہا ہے اور اس لذت میں برابر کا حصہ دار ہے۔

مجھے اس کی یہ عادت بے حد پسند آئی ہے کہ جب اس کے ذہن میں کوئی بات بٹھا دی جائے تو وہ اس سے سر مو ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی میری اس انوکھی تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

''بک'' بوتل کھلنے کی آواز آتی ہے۔

ایک پتلا دبلا آدمی بوتل منہ سے لگاتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

''واہ وا۔ کیا ٹھنڈی ٹھار اور مزے دار بوتل ہے۔'' پھر آستین سے منہ پونچھ کر کہتا ہے۔ ''مزا آ گیا۔''

سیخ کبابوں کی خوشبو لپکتی ہوئی آتی ہے اور اس کے قدم روک لیتی ہے۔

وہ منہ کھولے بغیر تکوں کو دانتوں سے کاٹتا ہے چباتا ہے۔ پھر ان کی لذت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''ذرا سخت ہیں مگر گوشت سخت ہی ہو تو مزا دیتا ہے۔''

میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔

اس کی نظریں بالو شاہی کے تھال پر ہیں۔ وہ دکان سے کچھ فاصلے پر کھڑے کھڑے بالو شاہی کھانا شروع کر دیتا ہے۔ کھاتے کھاتے اس کا منہ تھک جاتا ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے مگر بالو شاہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔میں کہتا ہوں '' اور کھاؤ۔''

''نہیں بس۔'' وہ ڈکار لیتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ پاپڑ دیکھ کر میں کہتا ہوں۔

''منہ سلونا کر گے؟''

''ہاں ۔۔''

پاپڑ اس کے دانتوں تلے کڑکڑاتے ہیں۔

''کیسے ہیں ؟''

''بہت اچھے ہیں بس ذرا مصالحہ تیز ہے۔''

'' اور کیا پسند کرو گے؟''

''میں نے آج تک سیب نہیں چکھا۔''

میں اسے پھلوں کی دکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔

''یہ سیب ہیں تم جتنے چاہو کھا سکتے ہو۔''

وہ ایک سیب نگاہوں سے اٹھاتا ہے دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے۔

''یہ تو ناشپاتی ہے۔''

''یہ ناشپاتی نہیں سیب ہے تم اسے سیب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ۔''

وہ پھر دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے ''یہ امرود ہے۔''

''یہ امرود نہیں سیب ہے۔''

وہ پھر کوشش کرتا ہے پھر کہتا ہے۔

''یہ آڑو ہے۔''۔۔

''یہ آڑو نہیں ہے۔''۔۔ مجھے غصہ آ جاتا ہے۔۔ ''تم الو کے پٹھے ہو۔''

وہ مجھے اداس نظروں سے دیکھتا ہے پھر روہانسا ہو کر کہتا ہے۔

’’مجھے کیا پتہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے میں نے کبھی کھایا ہی نہیں۔‘‘

’’اچھا چھوڑو‘‘۔۔ میں کہتا ہوں۔ ’’اب آگے چلتے ہیں۔‘‘

ہم باری باری ایک دوسرے کی انگلی پکڑے چلنے لگتے ہیں۔ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

’’کیا بات ہے بھائی؟‘‘۔۔ وہ پوچھتا ہے۔

’’حادثہ ہو گیا۔ آدمی ٹرک کے نیچے آ کر کچلا گیا۔‘‘

وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے۔۔ پھر کہتا ہے۔

’’ٹرک۔۔ میرے اوپر سے ٹرک گزر رہا ہے!‘‘

’’نہیں ‘‘۔۔ میں چلاتا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں،وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔۔!

***

راتب

اسے یاد نہیں کہ پہلی بار اس کے دل میں اس سوال نے کب پر پھڑ پھڑائے کہ وہ.... اصل میں وہ نہیں کوئی اور ہے!

شاید ماں باپ کی سرد مہرویوں نے آہستہ آہستہ اسے اس جان لیوا سوال کی بھٹی میں جھونکا یا شاید اپنے ہم عمروں کو اپنے اپنے والدین کے لاڈ پیار کی پینگھیں جھولتے اور محبتیں ہنڈاتے دیکھ کر اس کے اندر محرومی کا کوئی سوما پھوٹا.... لیکن اسے یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں پڑوس والی مائی حمیداں سے جو کہانی اس نے ایک بار سنی تھی شاید وہ اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے۔ اس کہانی میں ایک عورت اور بچے کا ذکر تھا۔ عورت صبح سویرے کھیتوں کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے نہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ایک نوزائیدہ، بے لباس بچے کو دیکھا جو گھاس پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور اسے چیونٹے کھا رہے تھے۔ اس نے چھو کر دیکھا وہ زندہ تھا مگر اس قدر نحیف کہ چیونٹوں کے کاٹنے کی تکلیف پر اس کے منہ سے رونے کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی نہ اس میں حرکت کرنے کی سکت تھی۔ وہ کچھ دیر اسے خوف، حیرت اور پریشانی سے دیکھتی رہی پھر اسے اٹھا کر گھر لے آئی، گھر میں اس نے کبوتر، مرغیاں اور خرگوش پال رکھے تھے وہ اسے بھی پالنے لگی۔

اس نے مائی حمیداں سے کئی بار دریافت کیا کہ پھر کیا ہوا مگر وہ کہتی کہ کہانی اتنی ہی تھی اور اگر اور تھی بھی تو اسے یاد نہیں تھی۔

جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کے حالات دیکھ کر اسے خود ہی خیال آیا کہ کہانی میں جس بچے کا ذکر تھا وہ بچہ وہ خود ہے اور وہ عورت اس کی ماں تھی۔ اگر ایسا تھا تو اس کی ماں، اس کی اصلی ماں نہیں تھی اور وہ، وہ نہیں تھا۔ پھر کون تھا؟ اس سوال کے آگے برسوں لمبی چپ اور تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ اسے اس سوال کا جواب کبھی نہ مل سکا تاہم اس کے اندر ایک تجسس موجود رہا اور وہ چپکے چپکے اپنے اور اپنے والدین کی اصلیت کے بارے میں ٹوہ لگاتا رہا۔

پھر جب اسے پتہ چلا کہ وہ تین چار برس کا تھا تو اس کے والدین کسی دوسری جگہ سے آ کر اس گاؤں میں آباد ہوئے تھے تو اسے بالکل یقین ہو گیا کہ وہ کہاں سے اور کن حالات میں ہجرت کر کے آئے تھے مگر وہ کسی کو ٹھیک طرح سے نہیں بتاتے تھے۔

پھر جب اس کا باپ باؤلے کتے کے کاٹنے کی وجہ سے باؤلا ہو گیا اور گاؤں والوں نے اسے اس کے گھر کے اندر ستون سے سے باندھ دیا اور وہ تماشائی لوگوں کو گالیاں دیتا اور رسیاں تڑوا کر ان پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے دل میں امید کا جگنو چمکا کہ شاید اب وہ اس کے اصلی ماں باپ کا نام اور پتہ بھی بتا دے مگر وہ اسے حرامی کہنے پر اکتفا کرتا۔

پھر جب اس کا باپ ستون سے ٹکریں مار مار کر اور رسیوں سے الجھ الجھ کر مر گیا تو اس کے ذہن میں اُمید کا ایک اور پھول کھلا کہ شاید گالیاں بکتی، کوسنے دیتی ماں کسی وقت غصے میں آ کر اس کا اصلی ماں باپ یا اگر وہ حرامی تھا تو اس کے اصلی باپ کا نام بتا دے گی مگر وہ کئی برسوں تک یونہی بکتی جھکتی رہی اور ایک روز بخار یا غصے میں پھنکتی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ تا ہم اب بھی وہ نا امید نہیں ہوا تھا اس کا خیال تھا کہ اڑو پڑوس اور گاؤں کے دوسرے لوگ جو شاید اس کے جھگڑالو ماں باپ کی وجہ سے اب تک خاموش تھے اب اُسے ضرور بتا دیں گے کہ وہ اُسے کہاں اور کیسے اُٹھا لائے اور اصل میں وہ کس گھر کا چراغ تھا۔مگر اسے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ ماں چالیسویں کے بعد بھی کسی نے اس قسم کی کوئی اطلاع فراہم نہ کی۔ بلکہ اس کے بے سہارا ہو جانے پر اظہار ہمدردی کرنے لگے۔ ہاں چودھری کا رویہ اور بہتر ہو گیا۔

وہ اور اس کی ماں حویلی میں کام کرتے تھے اس کا باپ ہمیشہ سے بیمار اور بیکار تھا اور زیادہ تر وقت چارپائی پر پڑا اُونگھتا رہتا تھا لوگوں سے کم ملتا تھا، لوگ بھی اس سے ملنے سے کتراتے تھے اُن کا خیلا تھا وہ نشہ کرتا ہے کیا پتہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔

چودھرائی کی خواہش تھی کہ وہ بھی گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتا رہے مگر چودھری نے اسے مویشی چرانے پر مامور کر دیا۔۔ اور اس کا سارا وقت چراگاہ میں گزر جاتا۔ ماں حویلی میں کام کر کے جگہ گھر پہنچ جاتی مگر وہ چراگاہ سے مویشی لانے اور حویلی میں کھانا کھانے کے بعد چراغ جلے گھر پہنچتا۔ اور ماں باپ کے باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں سے بے نیاز ہو کر رات بسر کر کے صبح سویرے ایک ساتھ ناشتہ کرنے اور کھانا کھانے کے لئے حویلی کا رخ کرتا۔ اپنے گھر میں اس کی حیثیت مسجد میں رات بسر کر کے اپنی رہ لینے والے مسافر کی تھی۔

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس نے اپنے گھر آنے اور رات بسر کرنے کا سلسلہ کم کر دیا ویسے بھی اتنا تھکا ماندہ ہوتا کہ کھانا کھانے کے بعد اس میں گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع اپنے گھر تک چل کر جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ کئی بار وہ اپنے گھر کے قریب آ کر ماں باپ کے باہم لڑنے کی آوازیں سُن کر پلٹ جاتا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ ان سے ہر وقت آپس میں لڑنے کی وجہ دریافت کرے مگر اسے ہمت نہ ہوئی۔ اس کا باپ مسلسل بیمار رہ کر کافی کمزور ہو چکا تھا مگر جب کبھی اس کی پٹائی کرنے پر آتا تو اس میں پتہ نہیں اتنا زور کہاں سے آ جاتا تھا اور ماں لڑائی

جھگڑے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ بعض اوقات سوتے میں بھی کسی نہ کسی کو گالیاں اور بد دعائیں دیتی رہتی۔

اُسے ماں باپ کر مرنے کا کچھ زیادہ افسوس نہیں تھا، وہ زندہ رہتے تو کیا ہو جاتا؟ ہاں ماں آخری دنوں میں اس کے بیاہ کا ذکر لے بیٹھتی تھی اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتی تو کوئی اپنے جیسی عورت اس کے پلے باندھ دیتی اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح اس سے لڑتا جھگڑتا اور کسی دن باؤلا ہر کر گھر کے ستون سے ٹکریں مارتے مارتے مر جاتا۔

اسے اپنے باپ پر ترس ضرور آتا تھا لیکن اس خیال سے اُسے اطمینان ہو جاتا کہ مر کر اس کی جان بہت سی پریشانیوں اور جھگڑوں سے چھوٹ گئی تھی۔

وہ روح اور جسم کر تعلق کے بارے میں باریک باتیں نہیں جانتا تھا اور اس سلسلے میں ا س کی معلومات وہی تھیں جو اس کی مرحومہ ماں کی تھیں یا پھر گاؤں کی مسجد کے امام سے جو باتیں وقتاً فوقتاً اس نے لاؤڈ سپیکر پر سنی تھیں۔ تاہم اس نے بہت سی باتیں از خود سوچ لی تھیں بلکہ طے کر لی تھیں مثلاً اسے معلوم تھا کہ بعض لوگ جو بظاہر برے اور حقیر نظر آتے تھے (جیسے وہ خود تھا) اندر سے بہت اچھے تھے اور بعض اچھے نظر آنے والے لوگ اندر سے مکروہ تھے اس کا صاف مطلب یہ تھا بعض اچھے جسموں میں بری اور بعض برے جسموں میں اچھی روحیں قید ہو گئی تھیں اسے شک تھا کہ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی گھپلا ہوا تھا کیا پتہ اس کی روح چودھری کے لڑکے کے ساتھ بدل گئی ہو جیسے ایک دفعہ مسجد میں اس کی جوتیاں رحموُ نائی کی جوتیوں سے تبدیل ہو گئی تھیں۔ وہ ایسی باتیں اکثر سوچتا اور جس قدر سوچتا اس کا شک اور پختہ ہونے لگتا ویسے بھی سرخ و سفید اور بھرے بھرے جسم والی چودھرانی اتنی اچھی اور خوبصورت تھی کہ اُسے دیکھ کر خواہ مخواہ ماں کہنے کو جی چاہنے لگتا تھا بعض اوقات اُسے لگتا جیسے اس نے پیدا ہونے سے پہلے بھی اسے دیکھا اور اس کے بطن سے جنم لینے کی خواہش کی ہو۔

حویلی میں دو وقت کا کھانا کھانے سے اس کے شبہ کو اور تقویت پہنچی۔ اس نے سُنا تھا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے چونکہ یہ حویلی اصل میں اس کا اپنا گھر تھیا س لئے خدا نے اسے یہاں ملازمت دلوا کر اس کے حصے کی چوگ فراہم کرنے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اور وہ جسے وہ اپنا بیٹا سمجھتے تھے اس کے حصے میں شہر کا دانہ پانی تھا۔

ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے اپنے گھر آنا جانا تقریباً ترک کر دیا تھا چند پرانے صندوقوں، برتنوں، میلے کچیلے بستروں کے سوا وہاں رکھا بھی کیا تھا جس کی حفاظت کرنے کی ضرورت ہو۔۔۔ اور پھر حویلی تو دراصل اس کا وہ گھر تھی، جہاں اُسے پیدا ہونا چاہئے تھا۔۔۔ اسے اس کے در و دیوار سے ویسی ہی محبت تھی جیسی اپن گھر سے ہوتی ہے اور اگرچہ چودھرانی نہیں جانتی تھی کہ وہ اصل میں اس کی ماں ہے لیکن وہ اُسے کسی نہ کسی بہانے زیادہ وقت اپنے پاس روک رکھتی تھی۔

کبھی چارپائیوں کی ادوائینیں کھینچنے، کبھی چودھری کے حقے کی چلم تازہ کرنے اور کبھی یونہی اِدھر کی چیزیں اُٹھا کر اُدھر رکھنے کے بہانے۔ خود کو مصروف رکھنے اور گھر میں زیادہ دیر رکنے کے لئے وہ خود بھی کئی کام نکال لیتا۔ چودھرانی جب کبھی اُسے بیٹا کہہ کر پکارتی تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا کہ کس طرح وہ غلط گھر میں پیدا ہونے کے باوجود اپنے اصلی والدین کے پاس اپنے اصلی گھر میں مزے سے رہتا ہے۔

کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ چودھرانی کو بتا دے کہ وہ اس کا اصلی بیٹا ہے اور وہ جو شہر میں پڑھتا دراصل ان غریب میاں بیوی کا بیٹا ہے جو شاید اس کی جدائی کی وجہ سے ناخوش رہتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے اور اسی اندرونی دُکھ کی وجہ سے گھل گھل کر مر گئے۔ مگر پھر اس خوف آتا اگر چودھرانی نے اس کی بات پر یقین نہ کیا تو وہ اسے بیٹے کا دشمن اور حاسد سمجھنے لگے گی۔ کیا پتہ گھر سے نکال دے۔

جہاں تک چودھری کا تعلق تھا وہ اس پر مہربان ضرور تھا شاید اس کے کام کاج کی وجہ سے۔۔۔ مگر اس کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی تھی اور اسے ہر بات میں میں میخ نکالنے اور جرح کرنے کی عادت تھی اور اس کے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں تھا یہ مسئلہ تو محسوس کرنے اور یقین کرنے کا تھا اور چودھری اَن دیکھی باتوں پر آسانی سے یقین کرنے کا قائل نہیں تھا۔

ایک روز اُسے نہایت دور کی سوجھی۔ کیا معلوم چودھری سے شادی کرنے سے پہلے چودھرانی اپنے میکے میں اس کی ماں بن گئی ہو؟ اور بد نامی کے خود سے اس نے خود یا اپنے آشنا کے ذریعے اُسے کہیں دور پھنکوا دیا ہو جہاں وہ اس عورت کے ہاتھ لگ گیا جس نے کبوتروں، مرغیوں اور خرگوشوں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی پرورش کی۔ اس نئی سوچ سے اس ادھوری کہانی کی بہت سی گمشدہ کڑیاں بھی خود بخود مل گئیں جو اس نے بچپن میں سُنی تھی۔ چودھرانی کو چند سال بعد جب معلوم ہوا ہو گا کہ وہ زندہ اور سلامت ہے تو اس کی سوئی ہوئی مامتا جاگ اُٹھی ہو گی اور اس نے کسی نہ کسی طرح ان غریب میاں بیوی کو اپنے پاس بلوا لیا ہو گا تاکہ اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھ سکے۔ اپنے اس مفروضے کو حقیقت سمجھ لینے کے بعد اس کی سمجھ میں آتا کہ اب وہ چودھرانی سے نفرت کرے یا محبت۔ اسکی نظروں کے سامنے رہ کر اسکی مامتا کو ٹھنڈک پہنچاتا رہے یا اُسے جدائی کا دکھ دے کر اپنی محرومیوں کا انتقام لے۔کبھی کبھی اُسے اپنے اَن دیکھے باپ کا خیال آتا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہاتا وہ اسے مل جائے تو وہ اس کے سینے سے لگ اے قتل کر دے گا۔

ایک بار اس نے یہ بھی سوچا کہ وہ چودھرانی کے قانونی بیٹے کو ٹھکانے لگا دے اور اس کے تڑپنے کا تماشہ دیکھے۔ ہاں۔ چودھرانی اگر ہمت سے کام لے اور اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے تو وہ اسے معاف کر سکتا ہے مگر اسے یقین تھا کہ وہ کچھ نہیں بتائے گی وہ اپنا ہنستا بستا گھر، ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی اور اپنے قانونی بیٹے کا

مستقبل کیسے دؤ پر لگا سکتی تھی۔ یہ معمہ اسے خود ہی حل کرنا ہو گا اور اس کے لئے اسے چودھرانی کے میکے گاؤں جانا اور وہاں کچھ عرصہ رہ کر گڑے مردے اُکھاڑنا ہوں گے۔

اس نے طے کر لیا کہ وہ اس بزدل اور گنہگار عورت کی چاکری چوڑ دے گا اور یہاں سے چلا جائے گا اور جب تک اُسے تمام حالات ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہو جاتے واپس نہیں آئے گا۔

پھر ایک صبح اس نے حویلی کی چاکری کا طوق گلے سے اُتار پھینکا۔ اس نے اپنے حصے کا کھانا حویلی کے کتوں میں تقسیم کر دیا اور بغیر کسی کو بتائے گاؤں سے نکل آیا۔

کوئی ایک کوس دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور حیران ہوا۔

حویلی کا ایک پلا اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اتنا چھوٹا اور کمزور سا پلا اس کے پیچھے اتنی دور تک چلا آتا تھا اسے عجیب مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ وہ تھکا تھکا سا چلا آ رہا تھا ایک ٹیلے پر بیٹھ کر وہ اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

پلے نے اپنی فاختائی دُم ہلاتے ہوئ ی اس کے پاؤں چاٹے تو اسے عجیب سی لذت کا احساس ہوا۔ اس نے بڑھ کر اُسے اُٹھا لیا اور اس کے جسم پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا پھر اسے نیچے رکھ کر ار اس کا منہ گاؤں کی طرف کر کے بولا

’’مجھے بہت دور جانا ہے تم میرا ساتھ نہ دے سکو گے واپس چلے جاؤ‘‘

پلے نے جواب میں اس کی پنڈلی سے اپنی تھوتھنی رگڑ دی پھر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا آتی بار وہ صدر دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے نہیں آتا تھا۔ اس چھوٹے سے پلے کو دھوپ اور سفر میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا اور وہ واپس جانے پر رضا مندنہیں تھا ویسے بھی اس کا سلامتی سے واپس پہنچ جانا نہایت مشکل تھا۔

بیٹھے بیٹھے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

آخر وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے پلا اپنی ماں کی محبت چھوڑ کر اس کے پیچھے چلا آیا تھا؟ یہی نا کہ وہ اپسے روٹی ڈالتا تھا۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے اس کے ذہن کے اندھیرے میں بجلی سی کوندی ہو۔

پلے کی ماں سے اسے اپنی ماں اور پھر باپ یاد آیا۔ جب وہ چھوٹا تھا ماں اور باپ دونوں اُسے اپنے پاس سلانے کے لئے اصرار کرتے۔ اگر کبھی وہ بیمار پڑ جاتا

تو ماں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور اس کا بیمار باپ اپنی بیماری کو بھول کر حکیم کی دکان کے چکر لگاتا۔ اُسے یاد آیا وہ حویلی سے رات گئے لوٹتا تھا تو اس کا باپ اس پر برس پڑتا تھا۔۔ شاید وہ اس کے انتظار کی گھڑیاں گن گن کر تھک گیا ہوتا تھا۔

اسے زندگی میں پہلی بار اپنے ماں باپ کی شفقتیں اور محبتیں بھی یاد آئیں۔ پلے نے جیسے اس کے اندر لگے کسی بٹن کو چھو لیا تھا کہ آپ ہی آپ اس کے اندر روشنی ہوتی چلی گئی اور اس نے ان بہت سی باتوں کی طرح جو اس نے بیس پچیس برسوں میں خود ہی سوچ ڈالی تھیں ایک بات اور سوچ، کہ حویلی اور اس کے راتب کی غلامی نے اس کے دل میں اپنوں کے بار میں شکوک پیدا کئے اور اس سے سارا اعتماد چھین لیا اور وہ اپنی جڑوں کو بھول کر راتب ڈالنے والوں کے سامنے دم ہلانے لگا تھا۔

***

رہائی

’’میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کیوں ؟‘‘

’’تا کہ تم سے نجات حاصل کر سکوں۔‘‘

’’تم مجھ سے نجات حاصل کرنا کیوں چاہتے ہو؟‘‘

’’میں تم سے اکتا گیا ہوں، تمہاری موجودگی میں میرا دم گھٹتا رہتا ہے۔‘‘

’’اس سے پہلے تو تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔‘‘

’’میں تم سے شروع سے ہی نفرت کرتا ہوں لیکن اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ اب میں تمہیں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔‘‘

’’تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے زندگی بہت قیمتی چیز ہے۔‘‘

’’میں ہر لمحہ مرنے کی اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ایک ہی بار مر جانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’یہ بزدلی ہے۔‘‘

’’میرے لیے اب بہادری اور بزدلی میں کوئی فرق نہیں رہا۔‘‘

’’خودکشی حرام ہے۔‘‘

’’ہاں حرام ہے لیکن تم نے بھی تو میرا جینا حرام کر رکھا ہے تم نے میرے لیے زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہنے دیا۔‘‘

’’میں تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔‘‘

’’مجھے خودکشی کے لئے بھی تمہاری اجازت کی ضرورت ہے یہی میری نفرت کا سبب ہے۔ کاش میں کوئی کام تو اپنی مرضی سے بھی کر سکتا۔‘‘

’’تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم میں سے کوئی بھی اتنا آزاد نہیں ہے۔ میں تمہیں آزاد نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ میں خود کسی دوسرے کی مرضی کا پابند ہوں اور وہ دوسرا کسی تیسرے کا۔‘‘

’’میں کچھ نہیں جاننا چاہتا سوائے اس کے کہ مجھے کم از کم خودکشی کی اجازت تو ملنی چاہیے۔‘‘

’’زندگی ایک عطیہ ہے میں چاہتا ہوں تم زندہ رہو۔ زندگی سے لطف اٹھاؤ۔‘‘

’’لطف اٹھاؤں ؟ تمہارے ہوتے ہوئے؟‘‘

’’ہاں ۔۔ زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے تمہیں مجھے برداشت کرنا ہو گا۔‘‘

’’میں ایسا نہیں کر سکتا۔‘‘

’’آخر کیوں ؟‘‘

’’تم۔۔ تم میرے گلے کا طوق۔۔ میرے پاؤں کی زنجیر ہو۔۔ تم نے میری آزادی کو سلب کر رکھا ہے۔ تم نے میری روح کو مصلحتوں کے پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔ گلے میں طوق ہو، پاؤں میں زنجیر ہو، روح پر ننگی تلوار کا پہرہ! تو کوئی کیسے خوش رہ سکتا اور زندگی کا لطف اٹھا سکتا ہے۔‘‘

’’یہ تمہارا اور میرا۔۔ ہم سب کا مقدر ہے تمہیں اس کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہو گا۔‘‘

’’میں مزید کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ میں سمجھوتوں اور مصلحتوں کے ان گنت دریا عبور کرتے کرتے عاجز آ چکا ہوں۔ اکتاہٹ اور بیزاری نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔‘‘

’’لیکن ذرا سوچو۔۔ اس کے باوجود ہونا۔۔ نہ ہونے سے کس قدر افضل ہے۔‘‘

’’مجھے اپنے ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ میں اذیت میں مبتلا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم پیر تسمہ پا کی طرح گردن پر سوار رہو گے تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔ خلا میں ہی رہتا۔ افسوس مجھے مٹی نے مایوس کیا۔‘‘

’’مٹی کسی کو مایوس نہیں کرتی۔‘‘

’’مٹی مایوسیوں، ناکامیوں اور اذیتوں کا احساس دلاتی ہے۔میں اس کی کشش کے دائرے سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’اس نے تمہیں گود لیا۔ اپنے پانیوں سے تمہاری آبیاری کی۔ اپنی ہواؤں کے جھولے میں جھلایا۔ اب تم اسے مایوسی کا طعنہ دیتے ہو، کیا یہ احسان فراموشی نہیں !‘‘

’’کاش اس نے میرے گلے میں تمہاری غلامی کا طوق نہ ڈالا ہوتا۔‘‘

’’میں تمہارے گلے کا طوق نہیں ہوں تمہاری ترقی اور بہتری کا وسیلہ ہوں۔‘‘

’’تم اس کو ترقی کہتے ہو؟‘‘

’’ہاں ۔۔ میری وجہ سے تمہیں فضیلت حاصل ہوئی۔ یاد کرو تم کیا تھے اور میں نے تمہیں کس مقام پر پہنچایا‘‘

’’تم نے مجھے بہت سی آسائشیں دیں۔ لیکن تم نے مجھ سے آزادی اور خود مختاری چھین لی‘‘

’’میں نے تم سے کچھ نہیں چھینا۔ جو کچھ تمہیں کبھی حاصل نہیں تھا فقط اس کا احساس دلایا۔‘‘

’’یہی تمہارا جرم ہے۔ میں بے لباس تھا لیکن عریاں نہیں تھا۔ تم نے مجھے لباس دیا اور احساس عریانی بھی۔ میں خالی ہاتھ تھا لیکن کسی محرومی کے احساس سے دوچار نہیں تھا۔ تم نے میرے اردگرد چیزوں کے انبار لگا دئیے لیکن میری روح کو بے اطمینانی کے پنجرے میں قید کر دیا۔ مایوسی اور احساس گناہ سے دوچار کر کے تم نے مجھے خودکشی پر مجبور کیا ہے۔‘‘

’’میں نے تمہیں جو کچھ دیا وہی تمہاری فضیلت ہے‘‘

’’مجھے فضیلت نہیں، خوشی درکار ہے‘‘

’’فضیلت بذات خود ایک بہت بڑی خوشی ہے تم اس کا احساس تو کرو۔‘‘

’’میں زندگی کے کھونٹے سے مزید بندھا رہنا نہیں چاہتا۔ میں واپس خلا ء میں جانا چاہتا ہوں ‘‘

’’تم ناشکرے ہو۔۔ خلا ء کی بے معنی وسعتوں میں بھٹکنا چاہتے ہو!‘‘

’’وہاں سکون ہے۔ وہاں بدی کا گزر نہیں، شر کی رسائی نہیں، محرومی، مایوسی اور بے بسی کا احساس نہیں، موت کا خوف نہیں، نا انصافی نہیں، علالت و عسرت نہیں اور قید مقام نہیں۔ خلا کی وسعتیں مجھے پکارتی ہیں ‘‘

’’خلا کبھی کسی کو نہیں پکارتا۔۔ وہ کشش سے محروم ہے۔ وہ خوشی اور غم، محبت اور نفرت، زندگی اور موت تمام ذائقوں سے خالی ہے اور یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم مٹی میں رہتے ہو مگر خلا کے گن گاتے ہو حالانکہ سچی ابدیت مٹی سے وابستگی میں

ہے۔ افسوس تم نے خلا کی بانجھ وسعتوں کے لیے سچی نعمتوں کے حقیقی ذائقوں کو اپنے اوپر حرام جانا۔ یہ کفران نعمت ہے۔ تمہیں اس کی سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے‘‘

’’یہ سزا میرے لیے ایک عظیم تحفہ ہو گی۔ اگر مجھے زمین بدر کر دیا جائے‘‘

’’مٹی آنے والوں کا خوشدلی سے استقبال کرتی ہے۔ ان کے ننگے بدنوں کو لباس مہیا کرتی ہے، لیکن کسی کو جانے کی اجازت نہیں دیتی۔‘‘

’’میں مٹی کو اس کا دیا ہوا لباس واپس کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سکڑ کر تنگ ہو گیا ہے۔ اس میں میرا دم گھٹتا ہے۔‘‘

’’یہ لباس تمہاری پہچان ہے۔ یہ لباس تم ہو۔ اس کے بغیر تم کچھ بھی نہیں ہو۔‘‘

’’میں اپنی شناخت کھونا چاہتا ہوں۔ میں بے نام ہونا چاہتا ہوں۔ میں مشرق مغرب شمال جنوب کی قید سے رہائی چاہتا ہوں۔ میں بے سمت خلاؤں میں بھٹکنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تمہارا نام حاضری کے رجسٹر میں درج ہو چکا ‘‘

’’میرا نام حاضری کے رجسٹر سے خارج کر دیا جائے‘‘

’’اس رجسٹر میں جو نام ایک بار لکھا گیا اسے مٹایا یا خارج نہیں کیا جا سکتا۔ واپسی کا خیال چھوڑ دو۔ واپسی کے سارے راستے بند ہیں۔‘‘

’’یہ ظلم ہے۔نا انصافی ہے۔‘‘

’’یہ ظلم اور نا انصافی نہیں۔ یہ زندگی کی اولین شرط ہے اور اگر یہ جرم ہے تو تم خود بھی اس کا ارتکاب کر چکے ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اگر تمہیں خلاء کی ویرانیاں اس قدر عزیز تھیں تو تم نے مٹی اور ہریالی کے لمس کی خواہش کیوں کی تھی اور زندگی کے سمندر میں اترتے ہی تم نے لائف بیلٹ پر قبضہ کرنے کے لیے قتل عام کیوں کیا تھا۔‘‘

’’میں اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں ‘‘

’’تلافی کے لیے ضروری ہے کہ تم زندگی کی حفاظت کرو‘‘

’’جس کا انجام ناپائیداری اور فنا کے سوا کچھ نہ ہو اس کی حفاظت کیسے اور کب تک کی جا سکتی ہے‘‘

’’جب تک اس کا اِذن ہو ‘‘

’’کچھ بھی ہو میں رہائی چاہتا ہوں میں مٹی کا لباس اتار کر ابدیت سے ہمکنار ہونا چاہتا ہوں ‘‘

’’کیا تمہیں بانجھ ابدیت کے کبھی نہ ختم ہونے والے جمود سے ہول نہیں آتا؟‘‘

’’وہ بلندی اور سرفرازی ہے، لا محدودیت ہے‘‘

’’زمین سے بلند کوئی مقام نہیں، زمین خلاؤں کا عرش ہے اس سے جدا ہو کر تم پھر بے معنی، بے وقعت اور بے نام ہو جاؤ گے‘‘

’’لیکن یہاں تم ہو۔ غلامی کے سلاسل کی صورت‘‘

’’ہاں میں ہوں اور مجھے حکم ہے کہ تمہاری حفاظت کروں۔ میں حکم عدولی نہیں کر سکتا‘‘

’’لیکن میں حکم عدولی کرنا چاہتا ہوں ‘‘

’’تم ایسا نہیں کر سکتے۔ فرار کے تمام راستے بند ہیں ‘‘

’’میں ایسا کروں گامیں اب مزید تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔ تم نے اس زمین کو مصائب اور آلام کا گھر بنا دیا ہے۔ تم نے یہاں طرح طرح کے تعصبات، نفرتوں اور نا انصافیوں کے بیج بوئے ہیں۔ زندگی کی ہزاروں صورتیں تھیں۔ لیکن تمہیں صرف اپنی صورت پسند آئی تم اپنے سوا کسی کو آزادی سے جینے کا حق نہیں دیتے۔ میں اب ایک پل بھی یہاں نہیں رکوں گا۔‘‘

’’ضد نہ کرو۔ اب بھی وقت ہے واپس جانے کا خیال چھوڑ دو۔‘‘

’’کیسے چھوڑ دوں ۔۔ کس کے لیے چھوڑ دوں ؟‘‘

’’بہتے دریاؤں، اڑتے بادلوں، نگر نگر گھومتی ہواؤں، چاندنی راتوں، طلوع ہوتی صبحوں، کھلتے پھولوں اور گھگھوہ گھوہ الاپتی فاختاؤں کے لئے‘‘

’’میرے لیے سب مناظر اور نغمے بے معنی ہیں۔ آدمی اندر سے خوش نہ ہو تو ساری خوبصورتیاں بدصورتیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں ‘‘

’’کیا تم دیکھ سکتے ہو؟‘‘

’’ہاں مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ لوگ، مشینیں اور اپنا جسم‘‘

’’پھر تم نے اس کا غم میں ڈوبا ہوا چہرہ بھی دیکھا ہو گا‘‘

’’ہاں، دیکھا ہے۔۔ یہ چہرہ مجھے ہمیشہ دھوکا دیتا رہا ہے‘‘

’’ اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں !۔۔ کیا تم نے ان آنسوؤں کو شمار کیا ہے؟‘‘

’’یہ آنکھیں بے وفا اور گمراہ کن ہیں میں انہیں دیکھنا نہیں چاہتا‘‘

''نہ دیکھو۔۔ مگر تم سن بھی تو سکتے ہو؟''

''ہاں مجھے سب کچھ سنائی دے رہا ہے۔ کاش میری آواز بھی سنائی دے سکتی اور میں کہتا وہ میرے جسم کو مت چھوئے۔''

''اگر تمہیں اس کی بے گناہی کا اب بھی یقین نہیں ہے تو پھر آؤ۔۔ ایک آواز سنو۔''

''اب۔۔ابو۔۔ جی''

''یہ آواز؟۔۔ یہ کیسی آواز ہے۔۔ کون مجھے پکارتا ہے؟''

''یہ مٹی سے تمہارے کبھی نہ ٹوٹنے والے تعلق کی آواز ہے''

''میں اس آواز سے رہائی چاہتا ہوں ''

''تم اس آواز سے رہائی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تمہاری اپنی آواز ہے''

''میں اس آواز کی پہنچ سے دور جانا چاہتا ہوں ''

''تم اس آواز سے دور نہیں جا سکتے۔ یہ آواز ہر جگہ تمہارا پیچھا کرے گی''

''مجھے اس آواز کی کشش سے بچاؤ۔۔ میں لمحہ لمحہ نیچے گرتا جا رہا ہوں ''

''تم نیچے نہیں گر رہے ہو۔۔ اپنے جسم میں واپس آ رہے ہو''

''پانی''

''پانی؟''

''پانی۔۔ پانی''

''مبارک ہو۔۔ ہوش آ رہا ہے''

''خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے''

***

سانپ اور خوشبو

بچپن کی بہت سی ایسی یادیں ہیں جو آنسوؤں کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ غلام علی کے دل پر گرتی رہتی ہیں اور اس کا دل صابن کی گاچی کی طرح کھرتا رہتا ہے۔

غلام علی پچیس۔تیس سال کا کڑیل جوان ہے لیکن ہر وقت ایک آٹھ دس سالہ ڈرپوک اور ندیدے سے لڑکے کی انگلی پکڑے رکھتا ہے۔ یہ ندیدہ اور ڈرپوک لڑکا اسے شہر کی گلیوں اور بازاروں میں لئے لئے پھرتا ہے۔ اس لڑکے نے بھوک اور پیاس کا ہو کا دیکھا ہے اور اب اسکا پیٹ نہیں بھرتا۔غلام علی کو معقول تنخواہ ملتی ہے لیکن وہ ساری تنخواہ اس ندیدے لڑکے کی خاطر تواضع پر صرف کر دیتا ہے۔

غلام علی کو ایک ایسی خوشبو کی تلاش ہے جس کا نام وہ نہیں جانتا۔

صرف گامی اس خوشبو کی پہچان سکتا ہے۔ گامی اس لڑکے کا نام ہے جس کی وہ انگلی پکڑے رکھتا ہے۔ گامی کے اندر ایک پانچ چھ برس کا بھول بھالا سہا ہوا بچہ ہے۔ اس بچے کا نام بھی گامی ہے۔

گامی ایک ماں تھی--- ہر آدمی کی ماں ضرور ہوتی ہے۔

گامی کی ماں کا نام ماں تھا--- ہر ماں کا یہی نام ہوتا ہے۔

ہر ماں کی طرح گامی کی ماں بھی کہانیاں سنایا کرتی تھی--- مگر بچہ ٹوٹرو کی کہانی گامی نے ماں سے اتنی بار سنی تھی کہ خود بچہ ٹوٹر بن گیا تھا۔ جس کی ماں دانہ دنکا چگنے کہیں دور نکل گئی تھی اور اسے گھونسلے میں اکیلے بیٹھے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

بچہ ٹوٹرو کی کہانی بڑی اچھی تھی مگر اس کہانی کو سننے کے لئے بڑے کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا تھا اگر سردیوں کی کوئی یخ بستہ رات ہوتی تو بچہ ٹوٹرو کی کہانی سننے کے لئے نرم، گرم بستر سے نکل کر مکان کی کھلی چھت پر جانا پڑتا تھا۔

گامی نے ماں سے کبھی کہانی سنانے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ ماں کا جب جی چاہتا اسے بستر سے اٹھا لیتی اس کا سر منہ چومتی اور سردیوں کی تاریک رات یا

گرمیوں کی شکر دو پہر میں چھت پر لے جاتی اس کا باپ گرمی ہو یا سردی چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹا رہتا صرف کبھی کبھار کھانسنے لگتا۔

پہلے پہل ماں اسے سوتے یا جاگتے میں اٹھا کر چھت پر لے جاتی تھی پھر وہ خود اٹھ کر ماں کے ساتھ چھت پر جانے لگا۔ وہ اسے اٹھانے، جگانے کے لئے ہاتھ لگاتی تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا اور آنکھیں ملے بغیر ایک کل کی طرح آگے آگے سیڑھیاں چڑھنے لگتا۔ مگر پھر ماں کے قدموں کی چاپ نہ پا کر ٹھٹک جاتا۔ خوف سے اس کا دل ہل جاتا منہ سے چیخ نکل جاتی--- اس کی ماں گھبرائی ہوئی آتی اور اسے واپس بستر میں لے جاتی۔

کبھی کبھی گرمیوں میں رات کو جب وہ چھت پر سو رہے ہوتے، وہ ماں کے اٹھنے کی آہٹ سن کر خود بخود اٹھ بیٹھتا اور آنکھیں ملے بغیر ماں کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اتر کر تھڑے پر آ کر بیٹھ جاتا، تھڑے پر ان کے بیٹھنے کی جگہ مخصوص ہو چکی تھی--- تھڑے کے چاروں طرف مچھر بھنبھناتے--- ٹڈیاں بولتیں---- چوہے دوڑتے اور ہمسائیوں کی کالی بلی منڈیروں پر گھومتی رہتی حبس سے دم گھٹتا اور پسینے سے جسم شرابور ہو جاتے۔ مگر جب تک اس کے باپ کو کھانسی نہ آتی وہ دونوں تھڑے پر بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھی وہ ماں کے زانوں پر سر رکھ کر تھڑے کی کچی زمین پر سو جاتا وہ اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی رہتی۔ لیکن باپ کے کھانسنے پر وہ یوں اچھل پڑتا جیسے کچی جماعت کا لڑکا چھٹی کی گھنٹی بجنے پر خوش ہو کر اچھلتا ہے۔

جب وہ دوبارہ چھت پر آتے اس کا باپ پہلو بدل کر چپ چاپ سو رہا ہوتا! چھت پر ہمسایوں کی کالی بلی جس کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی تھیں گھوم رہی ہوتی اور ایک ہلکی ہلکی خوشبو جو اسے بدبو کی طرح بری لگتی تھی چھت پر پھیلی ہوتی وہ اس خوشبو یا بدبو کو جس کا وہ نام نہیں جانتا تھا پہچانتا تھا یہ اجنبی سی مانوس خوشبو یا بدبو بچہ ٹوٹرو کی کہانی کے آغاز اور انجام کی پہچان کا کام دیتی تھی۔

گرمیوں کی دوپہریں بڑی ویران سنسان اور اداس ہوتی تھیں ہر طرف خاموشی ہوتی صرف آٹا پیسنے کی چکی کا گھگتھو بولتا جو ہر بات کا جواب ہاں ہاں یا نہیں نہیں میں دیتا سب بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے وہ اکیلا گلی میں گھگھو کی آواز کے ساتھ کھیلتا رہتا کبھی کبھی ماں اسے اندر بلا لیتی اور وہ اس کے ساتھ چمٹ کر سو جاتا لیکن پھر کبھی کبھی---- اچانک وہی اجنبی مانوس خوشبو اس کے نتھنوں میں گھس آتی تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا--- شائد اس کی خوشبو یا بدبو سے ماں کی نیند بھی خراب ہو جاتی تھی۔ وہ اٹھ کر سیڑھیاں چڑھنے لگتی--- گھر میں ایک ہی کمرہ تھا کوئی برآمدہ یا درخت بھی نہ تھا چھت پر لو چلتی تھی چھت کا کچا فرش توے کی طرح گرم ہوتا---- سورج سوا نیزے پر آ کر سایہ کرتی مگر دھوپ چارپائی کے بان کو جلا کر اور سوراخوں سے جھانک جھانک کر اس کے جسم مین سوئیاں چبھوتی رہتی ماں اسے دور جوہڑوں میں نہاتے ہوئے مویشی--- سڑکوں پر آتے جاتے گڈے اور راستوں پر ناچتے بگولے دکھاتی وہ ان بگولوں اور واور ولوں کو دیکھ کر سہم جاتا

اور جب کبھی یہ بگولے جن میں نظر نہ آنے والی بھتنیاں لڈی مارتی پھرتی تھیں قریب آ جاتے تو اس کا دل بیٹھنے لگتا اور وہ ماں سے چمٹ جاتا۔ لو کے بگولوں کے ساتھ گدھا مارتی بھتنیاں جب تالیاں بجاتی دور چلی جاتیں تو اس کا سانس ٹھکانے آ جاتا ماں اسے بہلانے کے لئے بچہ ٹوٹرو کی کہانی سنانے لگتی---

ایک تھی فاختہ--- اللہ میاں کی فاختہ--- ایک تھا اس کا ٹوٹرو

دونوں ون کے ایک پیڑ پر گھونسلے میں رہتے تھے--- دونوں ایک دوسرے سے جدا ہونا چاہتے لیکن فاختہ کو اپنے اور ٹوٹرو کے لئے دانہ دنکا چگنے باہرجانا پڑتا دونوں پیلو پکنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب پیلو پکیں گے وہ ٹوٹرو کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جایا کرے گی۔ دونوں مزے سے بیٹھ کر پیلو کھا لیا کریں گا--- لیکن ایک روز جب وہ چونچ میں ٹوٹرو کے لئے دانہ و نکالے کر لوٹی تو اس نے دیکھا کہ اس کے ٹوٹرو کو کسی ظالم شکاری نے مار گرایا تھا۔ اس کے بعد فاختہ جہاں بیٹھی ٹوٹرو کو یاد کر کے روتی اور جب بھی پیلو پکنے کی رت آتی وہ پیڑوں کی شاخوں پر بیٹھ کر بین کرتی---

بچہ ٹوٹرو--- پیلو پکیساں--- کھانہ سکیاں

مارو نجائیوں--- ہتھ نہ آیوں--- بچہ ٹوٹرو

کہانی سناتے سناتے ماں کی آواز ابھر جاتی لیکن پھر اچانک پتہ نہیں کیسے اسے یاد آ جاتا اور وہ اسے لے کر نیچے آ جاتی--- اس کا باپ کروٹ بدلے ٹھنڈے اور اندھیرے کمرے میں سو رہا ہوتا اور اجنبی مانوس خوشبو یا بدبو--- کمرے میں بکھری ہوتی---

گامی کو وہ بارش بھی یاد تھی جب وہ ماں کے ساتھ چھت پر بیٹھا بھیگ رہا تھا--- بجلی چمکتی اور بادل گرجتے تھے۔ ماں کہانی سنا چکی تھی اور اب اسے بہتے ہوئے پرنالے اور بھاگتے ہوئے بادل دکھا دکھا کر بہلا رہی تھی اور بار بار اس کا منہ چوم رہی تھی۔

اسے سردیوں کی کئی اندھیری راتیں بھی یاد تھیں---

سات ترنگڑ--- بارہ کھتیاں اور قطبی تارہ--- وہ کھیس کی بکل مار کر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیتی تھی۔ سردی سے اس کے دانت بجنے لگتے تو وہ اسے سینے سے لگا کر تھپکتی رہتی۔ پھر اسے کچھ دکھائی تو نہ دیتا مگر وہ سنگھ لیتا خوشبو کی لہر کمرے سے نکل کر باہر کے دروازے تک پھیل جاتی۔ اسی لمحے اس کے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی۔ اس کی ماں باہر کا دروازہ بند کرنے جاتی تو وہ بھاگ کر اپنے بستر میں آ جاتا اور جب تک وہ لوٹتی وہ اس کے لئے بستر گرم کر چکا ہوتا۔

وہ سب راتیں اور باتیں بھول سکتا ہے لیکن بھادوں کی ایک گرم اور تاریک رات کا خیال آتے ہی اسے جھر جھری آ جاتی ہے۔ وہ ابھی ابھی تڑے پر آ کر بیٹھے

تھے کہ تھڑے کے نزدیک گز بھر لمبا سانپ رینگتا دکھائی دیا۔ خوف سے اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ اس کی ماں کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی۔ وہ دونوں بھاگ کر سیڑھیاں چڑھنے لگے مگر پھر پتہ نہیں کیوں اس کی ماں نے اسے سیڑھیوں میں روک لیا۔

''ابھی ہم اوپر نہیں جا سکتے''

''مگر نیچے سانپ ہے ماں ''

''سانپ کہاں نہیں ہے''

''سانپ سیڑھیاں چڑھ سکتا ہے؟''

''سانپ صرف سیڑھیاں اتر سکتا ہے''

وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا۔۔۔ اچانک اسے خیال آیا کہیں چھت پر بھی سانپ نہ ہو لیکن پھر اس خیال سے کہ چھت پر ہمسایوں کی چمکتی آنکھوں والی بلی ہے وہ مطمئن ہو گیا لیکن نیچے صحن میں جہاں سانپ تھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دکھا رہا۔ اس کی ماں چھت کی طرف یوں پریشان ہو کر دیکھ رہی تھی جیسے چھت پر بھی سانپ رینگ رہا ہو۔ سانپ اس رات سیڑھیاں چڑھ کر چھت پرنہ آیا۔ لیکن اس کے بعد اکثر سوتے میں اس کے سینے پر چڑھ آتا اس کی چھاتی پر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا اور اپنی دو شاخی زبان سے اس کا بھیجا چاٹنے لگتا۔

اس کے بعد جب بھی وہ خوشبو یا بدبو سونگھتا۔ سانپ اس کی چھاتی پر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا اور اس کا بھیجا چاٹنے لگتا، پھر جب سانپ اس کا بھیجا چاٹ کر چلا جاتا تو اس کی ماں کہتی اسے دورہ پڑا تھا۔

پھر وہ قریب کے قصبے میں پڑھنے جانے لگا۔

ماسٹر جی نے کہا تھا سکول آتے اور جاتے ہی ماں باپ کو سلام کیا کرو وہ سکول سے سیدھا گھر آ کر ماں کو سلام کرتا ماں کہیں گئی ہوتی تو وہ اسے سلام کرنے کیلئے مارا مارا پھرتا۔ ماں کہتی باپ کو بھی سلام کیا کرو ماسٹر جی بھی یہی کہتے تھے۔ وہ باپ کو سلام کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اس سے بی حد خوف آتا تھا۔ اس کا باپ سورج کی طرح بڑا خوفناک اور بلند تھا۔

اس کی ماں زمین کی طرح مہربان تھی۔

وہ زمین پر بھاگ سکتا تھا۔ چھپ سکتا تھا، مٹی کے کھولنے بنا سکتا تھا لیکن سورج کی طرف دیکھے سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔

گامی نے شیر نہیں دیکھا تھا مگر اس کی دھاڑ سنی تھی۔

اس نیند کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا مگر اس کی مٹھاس کو پہچانتا تھا مگر جس طرح ہمسائیوں کی کالی بلی اندھیرے میں بھی چوہا پکڑ لیتی تھی اسی طرح وہ بھی آنکھیں بند کر کے اس خوشبو یا بدبو کو پہچان سکتا تھا۔

اس کی ماں اکثر اس کے ہاتھ عطر کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں منگاتی رہتی تھی کبھی چار شیشی کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیتی تھی۔

پھر ایک بار ماں نے اسے ایک خالی شیشی دے کر ہدایت کی تھی کہ وہ دکاندار سے بالکل ایسی ہی شیشی خرید لائے۔ یہ خالی شیشی اس کی ماں نے روئی میں لپیٹ کر اس کے بستے میں چھپا دی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھے دکاندار خود کھول کر دیکھ لے گا لیکن اس نے ماں کے حکم کی خلاف ورزی کی اور سکول جاتے ہوئے خالی شیشی کو بستے سے نکالا اور روئی ہٹا کر خالی شیشی کو سونگھ لیا اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ وہ کب اور کیسے گھر پہنچا اور وہ خالی شیشی کہاں گئی۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ اسے دورہ پڑا تھا اور وہ سڑک کے کنارے ایک کھڈ میں بے ہوش پڑا تھا کہ کسی راہ گیر نے اٹھا کر اسے گھر پہنچایا۔

گامی وہ خالی شیشی کھو بیٹھا تھا۔ اگر وہ اسے نہ کھو دیتا تو شائد ماں خون تھوکنا شروع نہ کرتی۔ اسے خالی شیشی اور اسکی خوشبو سے بہت خوف آتا تھا لیکن ماں کے کملائے اور مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر وہ ہر روز سکول سے آتے جاتے شیشی تلاش کرنے کے لئے رک جاتا ماں خالی شیشی کے غم میں خون تھوکتی رہی۔ وہ بھی خوشبو کا نام نہ جانتی تھی سونگھ کر پہچان سکتی تھی۔

وہ کہیں آ جا نہیں سکتی تھی۔ بستر پر پڑی کھانستی اور خون تھوکتی رہتی تھی۔ ہمسائیوں کی کالی بلی سارا دودھ پی جاتی تھی۔ مگر وہ دودھ کا برتن نہیں ڈھانپتی تھی یا ڈھانپ نہیں سکتی تھی۔ اسے پیار بھی نہیں کرتی تھی دور رہنے کو کہتی تھی۔ ایک چھوٹی سی خالی شیشی گم کرنے پر اتنی سخت سزا دے رہی تھی۔ گھر کا کام کاج پڑوسنیں کر کے دے جاتی تھیں۔ ماں صرف لیٹی رہتی تھی۔ کبھی کبھی رونے لگتی تھی۔

پھر گھر میں اکثر مہمان عورتیں آنے لگیں، پھوپھیاں، چچیاں اور خالائیں ایک جاتی---- دوسری آ جاتی۔

پھر ایک روز مدرسے میں گاؤں کا آدمی آیا اور بولا۔

''گامی گھر چل---- تیری ماں تجھے بلاتی ہے''

ماسٹر نے فوراً چھٹی دے دی۔ وہ آدمی کے ساتھ گاؤں آ رہا تھا۔ اس نے راستے میں سوچا کیوں نہ ایک بار پھر تلاش کر کے دیکھ لے کیا پتہ خالی شیشی مل جائے۔ لیکن آدمی نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا کیا پتہ خالی شیشی مل ہی جاتی۔

لوگوں کے درمیان اس کی ماں چارپائی پر چپ چاپ لیٹی تھی۔ آج اسے کھانسی کا دورہ نہیں پڑتا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نہیں تھے۔ وہ ہجوم کو چیرتا ہوا سیدھا اس کے پاس پہنچا اور سلام کیا ابھی ماں نے سلام کا جواب دینے کے لئے آنکھیں نہیں کھولی تھیں کہ لوگوں کے ہجوم میں اسے جانی پہچانی اجنبی خوشبو آئی اور اس کے منہ سے کف بہنے لگا۔

غلام علی کو گھر سے بھاگے پندرہ بیس برس ہو گئے ہیں لیکن اب بھی اسے خالی شیشی یا اسکی خوشبو کا نام جاننے کی شدید خواہش ہے۔ اسی لئے وہ ہر وقت گامی کی انگلی پکڑے رکھتا ہے۔ کئی بار راہ گیروں نے اسے ایمبولنس میں ہسپتال پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ خوشبو سے الرجک ہے۔ اسے ہر قسم کی خوشبو سے دور رہنا چاہئے۔ لیکن غلام علی نہیں مانتا وہ کہتا ہے کہ خوشبوؤں کی اتنی قسمیں ہیں کہ انہیں گنا بھی نہیں جا سکتا۔ ایسی ابھی خوشبوئیں ہیں جو اس کا ذہن سونگھتا رہتا ہے۔ دل محسوس کرتا رہتا ہے یہ سب یادوں کی خوشبوئیں ہیں جو آنسوؤں کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ غلام علی کے دل پر گرتی رہتی ہیں اور اس کا دل صابن کی گاچی کی طرح کھرتا رہتا ہے۔

***

سورج کی تلاش

اور وہ تاریک سرنگ میں محصور ہو گئے۔

وہ اس وادی سے جہاں کبھی کبھار سورج نکلتا اور چاند چمکتا تھا ہجرت کر کے روشن وادی کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں سال کے بارہ مہینے سورج نکلتا اور چاند چمکتا تھا۔

بوڑھے رہنما نے جو اس وادی کا راستہ جانتا تھا انہیں بتایا تھا کہ روشن وادی تک جانے کے لئے ایک طویل خوفناک اور تاریک سرنگ سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کے حوصلے اس قدر بلند تھے اور وہ روشنی کے لئے اس قدر بے تاب تھے کہ بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے تھے۔ تاریک سرنگ میں اس قدر گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن وہ بڑے نظم و ضبط سے ایک دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے اور اپنا زاد راہ اٹھائے رواں دواں رہے۔

راستہ دشوار گزار تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی تھیں۔ سب سے زیادہ ٹھوکریں سب سے اگلے آدمی کے حصے میں آئی تھیں۔ وہ بوڑھا تھا ان ٹھوکروں اور سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کر لئے ان سے جدا ہو گیا۔

جب چھاتی پیٹنے کے لئے انہوں نے ایک دوسرے کے کندھوں سے ہاتھ اٹھائے ان میں سے کچھ لوگ ایک نئی لذت سے آشنا ہوئے۔ دوبارہ ایک دوسرے کا کندھا تلاش کرتے ہوئے ان کے ہاتھ ایک دوسرے کے زاد راہ اور عورتوں کے بدنوں سے چھوئے تو انہوں نے ایک دوسرے کا کندھا تلاس کرنا چھوڑ دیا۔ اور تتر بتر ہو گئے۔

نئے سردار نے جب روشن وادی کے لئے سفر جاری رکھنے پر اصرار کیا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور ایک دوسرے کی جیبوں اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ہنسنے لگے۔

مگر وہ۔۔۔ جن کا زاد سفر چوری ہو گیا تھا اور جن کی عورتوں کے جسم لہو لہان ہو گئے تھے۔ موہوم منزل کا خیال چھوڑ کر واپس اس وادی میں جانے کی باتیں سوچنے لگے جہاں کبھی کبھار سورج نکلتا تھا۔

لیکن وہ جنہوں نے پانی کے مشکیزے اور خوراک کے بڑے بڑے تھیلے چھین کر ڈھیر لگا لئے تھے اور عورتوں کے جسم ٹٹولنے سے آشنا ہو چکے تھے سرنگ کی پتھریلی دیواروں سے لگ کر بیٹھ گئے جب بھوکے لوگوں نے اپنی لہولہان عورتوں کے ساتھ واپس لوٹنے پر اصرار کیا تو ان میں سے کچھ اٹھے اور سرنگ کا

پچھلا راستہ پتھروں سے بند کر آئے۔ پھر وہ ان بھوکے لوگوں کو جو اپنی چیزیں اور عورتیں واپس مانگتے تھے ہانک کر سرنگ کے بہت اندر تک لے گئے۔

سرنگ میں دیر تک محصور رہتے رہتے جب وہ تاریکی سے مانوس ہو گئے اور دوسروں کے پاس اپنی چیزیں دیکھ کر چیخنے لگے تو انہیں پتھر مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے لگے---!

اور سرنگ میں بدبو پھیلنے لگی---

پھر وہ تین گروہوں میں بٹ گئے۔

پہلا گروہ--- جو پتھریلی دیواروں سے لگا بیٹھا تھا اس وقت تک تاریک سرنگ سے باہر نہ جانا چاہتا تھا۔ جب تک خوراک کا آخری دانہ--- پانی کا آخری قطرہ اور ایک بھی جوان عورت زندہ تھی۔

دوسرا گروہ--- پتھریلی دیواروں کا حصار توڑ کر سرنگ پار کرنا اور روشن وادی میں جلد از پہنچنا چاہتا تھا۔

اور تیسرا گروہ--- پیچھے ہٹ کر سرنگ کے منہ سے پتھر ہٹانا اور واپس اس وادی میں جانا چاہتا تھا جہاں کبھی کبھار سورج نکلتا تھا۔

تینوں گروہ آپس میں دست و گریباں تھے کہ قریب کا آتش فشاں پھٹ پڑا اور بہت سے لوگ سرنگ کے اندر پتھروں اور چٹانوں کے نیچے دب کر مر گئے۔ اس افرا تفری میں مایوس گروہ کے آدمی اس وادی میں بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں کبھی کبھار سورج نکلتا تھا۔

پتھریلی دیواروں سے لگ کر بیٹھے ہوئے گروہ کی ایک بڑی تعداد چٹانوں کے نیچے دب گئی۔

اور وہ لوگ--- جو روشن وادی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ اپنے کٹے ہوئے اعضاء چھلنی جسموں اور زخمی روحوں کے ساتھ روشن وادی کی طرف رینگنے لگے۔ ان میں سے جو بھی تاریک سرنگ سے نکل کر روشن وادی میں پہنچا اس کی آنکھیں روشنی سے چندھیا گئیں اور وہ بصارت سے محروم ہو گیا۔

وہ سب روشن وادی میں پہنچ گئے۔ لیکن بصارت سے محروم ہو کر ان کے لئے روشن وادی اور تاریک سرنگ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ اپنے لٹے ہوئے سامان اپنی عورتوں اور واپس چلے جانے والے لوگوں کو یاد کر کے رونے اور وادی میں بھٹکنے لگے۔ لیکن وہ پر امید تھے کہ اب ان کے ہاں جو بچے پیدا ہوں گے شائد وہ بصارت سے محروم نہ ہوں !

***

تیرھواں کھمبا

گارڈ نے وسل دے دیا تھا اور سبز جھنڈی لہرا دی تھی،جب ایک نوبیاہتا جوڑا اس کے سامنے کی سیٹوں پر آ کر بیٹھ گیا اسے ایسا لگا جیسے وہ آرام دہ سیٹ پر نہیں بیٹھا تپی ہوئی ریل کی پٹڑی پر اوندھے منہ پڑا ہے۔

لڑکی اسے دیکھ کر یوں ہکا بکا رہ گئی جیسے وہ راولپنڈی جانے والی ریل کار کی بجائے ملتان جانے والی ریل کار میں سوار ہو گئی ہو۔

اس کے شوہر نے رومال سے اس کے لئے سیٹ صاف کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

’’بیٹھو انجی۔‘‘

’’انجی -- انجی -- انجی ‘‘

اس پر چاروں طرف سے پتھر برسنے لگے۔

اس کا سارا بدن لہولہان ہو گیا اسے ایسے لگا جیسے تیز رفتار ریل کار کا انجن اس کے اوپر سے گزر گیا ہو اور اس کے جسم کی بوٹیاں ہوا میں اُڑ رہی ہوں۔ وہ اپنی سیٹ پر کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھا تھا لیکن ایک تیسری آنکھ اس کی کنپٹی پر اُگ آئی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی موجودگی سے وہ پریشان ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے اور منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر کہیں کوئی سیٹ خالی نظر نہ آئی۔ اس قدر طویل سفر کھڑے ہو کر طے کرنا مشکل کام تھا وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا پھر اس نے تہہ کیا ہوا اخبار،جس کا ایک ایک لفظ وہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا،نکالا اور اپنے جسم کو اخبار کے اوراق کے پیچھے چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

ریل کار کے آہنی پہئے حرکت میں آئے۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، پلٹ کر اپنے شوہر سے باتیں کرنے لگی۔ اور وہ۔۔ وہ بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا مگر اس کے اندر کوئی طاقت ور انجن جلدی جلدی کانٹے بدل رہا تھا۔ اخبار چھوڑ کر اس نے کھڑکی کے باہر کے منظر میں پناہ لی۔۔ دور دور تک ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا

تھا۔ ریل کے خالی،فالتو اور بے کار ڈبے کونوں میں چپ چاپ کھڑے تھے اور کانٹے بدلتی فاصلے طے کرتی ہوئی ریل کار کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ریل کی بے شمار پٹڑیاں دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اگر وہ ریلوے انجن ہوتا تو بوکھلا جاتا اور یقیناً کسی غلط پٹڑی کا انتخاب کر کے کسی دوسرے انجن سے ٹکرا جاتا۔ ٹکرانے کے خیال سے اسے لذت ملی اور اس کا جی چاہنے لگا کہ کاش وہ واقعی کوئی طاقتور انجن ہوتا جو کسی غلط پٹڑی پر دندناتا، شور مچاتا، چنگھاڑتا اور خس و خاشاک کو اپنے ساتھ اڑاتا کسی دوسرے انجن سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔ انجن کے نیچے آ کر کچلے جانے اور انجن بن کر کسی دوسرے انجن سے ٹکڑا کر پاش پاش ہو جانے میں کتنا فرق تھا۔

ریل کار اب راوی عبور کر رہی تھی۔

بوٹنگ کرتے ہوئے لوگ نظر آئے تو اس نے تڑپ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی وہ اپنے شوہر سے سرگوشیوں میں مصروف تھی۔

راوی کسی خوبصورت لمحے کی طرح گزر گیا۔۔ مگر اس کے دل میں دیر تک چپو چلتے رہے۔

اور ابھی وہ ایک سرد آہ بھی نہیں کھینچ سکا تھا کہ کھجوروں میں گھری ہوئی مقبروں کی عمارتیں ایک حسین سپنے کی طرح دکھائی دینے لگیں۔ جہانگیر اور نور جہاں کے مقبرے قریب قریب تھے، مگر ان میں ریل کی پٹڑیاں حائل ہو گئی تھیں۔ وہ زنجیر کھینچے بغیر تیز رفتار ریل کار سے اتر گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پانچ برسوں کا طویل سفر طے کرنے لگا۔

پانچ سال پہلے ایک شام مری میں اسے اس کا تار ملا تھا کہ فوراً لاہور پہنچو۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ سخت پریشانی کے عالم میں وہ اسی وقت لاہور کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ جب وہ اگلی صبح خیبر میل سے اتر کر بغیر منہ ہاتھ دھوئے بغیر ناشتہ کئے اور بغیر اپنے لباس سے گرد جھاڑے گرلز ہوسٹل پہنچا تو وہ اسے گیٹ کے قریب اپنی منتظر ملی۔ نوخیز کلی کی طرح ابھی ابھی چٹکی ہوئی۔ نئی وضع کے خوش رنگ لباس میں جگمگاتی اور چھلکتی گنگناتی۔ وہ پریشان تھا اس نے اسے تار دے کر کیوں بلایا تھا۔ ایسی کیا بات تھی۔ خدا خیر کرے وہ راستہ بھر سوچتا اور دعائیں مانگتا آیا تھا۔ مگر جب اسے پتہ چلا کہ آج چھٹی تھی اور وہ اس کے ساتھ آؤٹنگ کے لئے جانا چاہتی تھی تو اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ وہ بہت خوش ہوا مری سے لاہو ر تک کا فاصلہ سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا۔ راستے کی ساری گرد زر گل تھی اور بس اور ٹرین کا اکتا دینے والا طویل سفر پینگ کا ایک ہلارا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنا شکن آلود لباس اور گرد سے اٹے ہوئے بال اسے اچھے لگ رہے تھے، جیسے اس نے ہیرو کا رول فلم بند کرانے کے لئے میک اپ کر رکھا ہو۔۔ اور سچ مچ وہ نگاہوں کے کیمرے سے اس کی تصویریں اتار رہی تھی۔ پھر جب وہ واپس مری چلا جائے گا تو تنہائی کے بند کمرے میں وہ اس فلم کو ڈب کرے گی

اور سارے نیگیٹوز یادوں کی کسی ایسی الماری میں چھپا دے گی کہ وہ لاکھ سر پٹختا رہے کبھی اس کے ہاتھ نہ آئیں گے۔

وہ حیران تھا وہ ایکا ایکی اس پر اس قدر مہربان کیسے ہو گئی تھی وہ تو ہمیشہ ہر تصویر اس سے چھپا کر رکھتی تھی پھر آج؟۔۔ شائد وہ اب تک اسے آزما رہی تھی۔ شائد آج وہ اس کانٹے کا بھی ذکر کر دے جو اسے اندر ہی اندر لہولہان کرتا رہتا مگر وہ بظاہر ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ کوئی انجانا سا اندیشہ اسے خوشی کے لمحوں میں بھی اداس رکھتا تھا مگر وہ کچھ نہ بتاتی تھی، پوچھنے پر جھوٹ ہنسی ہنسنے لگتی تھی۔

ہوٹل میں چائے کی میز سے اٹھ کر وہ باتھ روم چلا گیا ہاتھ منہ دھویا بال درست کئے اور پھر اس کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا وہ خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔

مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔

میرا اندازہ تھا تم خیبر میل سے پہنچو گے۔

میں جانتی تھی تم ناشتہ میرے ساتھ مل کر کرو گے۔

میں جانتی تھی تم گاڑی سے اتر کر سیدھے میرے پاس آؤ گے۔

میں جانتی تھی۔۔ مجھے معلوم تھا۔۔ مجھے یقین تھا۔

میں جانتی تھی۔۔ میں جانتی تھی۔۔ میں جانتی تھی۔

’’تم نہیں جانتی ہو انجی۔۔ میں نے ولایت میں اتنا عرصہ کیسے گزارا۔‘‘ اس کے شوہر نے کہا۔

’’میں جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔‘‘ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

ریل کار بھاگتی جا رہی تھی، مڑ کر نہیں دیکھتی تھی۔ مڑ کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس کا جی چاہا اپنے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹ کر دیکھے کہ کہیں اس کا جسم سن تو نہیں ہو گیا۔ اس نے دانتوں سے اپنے ہاتھ کاٹنے کے لئے ہاتھ کو تلاش کیا مگر اس کے دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے پھر اس نے دیکھا اس کی دونوں ٹانگیں بھی نہیں تھیں۔ اس نے گھبرا کر اپنے جسم کو تلاش کی مگر وہ سیٹ جو اس نے اپنے لئے ریزرو کروائی تھی اب خالی پڑی تھی۔ اسی لمحے اس کے کہیں قریب ہی کوئی کلی چٹکی۔۔ جانی پہچانی مہک کا ہلکا سا جھونکا آیا اور وہ یہ جان کر مطمئن ہو گیا کہ وہ جسم کے بغیر بھی سونگھ سکتا ہے۔

پھر سونے کی چوڑیوں کی سرد سرد سی کھنک سنائی دی اس کا مطلب ہے وہ سن بھی سکتا ہے ہاں وہ سونگھ سکتا ہے سن سکتا ہے، سوچ سکتا ہے، رو سکتا ہے اور گا سکتا ہے!

وہ گانے لگا۔

''ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں، مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے''

وہ گاتا رہا۔ درخت،گاؤں، کچے پکے راستے، فصلیں، تالاب اور ریلوے اسٹیشن ایک ایک کر کے گزرتے رہے۔ہیر وارث شاہ سے اسے بہت سے اشعار یاد تھے۔ ایک بند ختم ہوا تو اس نے دوسرا شروع کر دیا:

''وارثؔ، رن،فقیر، تلوار،گھوڑا چارے تھوک ایہہ کسے دے یار ناہیں۔''

اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز اور درد تھا۔ مگر پورے ڈبے میں کسی نے اس کے گانے کی طرف توجہ نہیں دی شائد سب لوگ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھے تھے۔ وہ دونوں برابر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس کے گانے سے ذرا ڈسٹرب نہیں ہوئے۔وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا دل بیٹھ گیا اور کان کھڑے ہو گئے۔

کہیں مڈل ایسٹ اور ویت نام،کہیں روس اور امریکہ اور کہیں سوشلزم پر بحث ہو رہی تھی۔کہیں ہنی مون کا اور کہیں مری کے مناظر کا ذکر ہو رہا تھا۔اسے ڈائننگ کار کے بیرے پر بڑا ترس آیا اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا اس کا جی چاہا بیرے کو اپنے پاس بٹھا کر ہیر وارث شاہ کے اشعار سنائے۔ اسی وقت مری، سوات اور ہنی مون کے الفاظ کا شور اس قدر پھیل گیا کہ مڈل ایسٹ، ویت نام، روس، امریکہ، سوشلزم اور ڈائننگ کار کے بیرے کی آواز سب کچھ دب کر رہ گیا۔ اس نے اس شور سے بچنے کے لئے کانوں میں گاڑی کے پہیوں کا شور بھر لیا اور ٹیلیفون لائن کے کھمبے گننے لگا۔ ابھی وہ بارھویں کھمبے تک گن سکا تھا کہ دو ایک کھمبوں کا گھپلا ہو گیا۔ نہ جانے یہ تیرھواں کھمبا تھا یا چودھواں۔ وہ اسی الجھن میں تھا کہ دو ایک کھمبے اور گزر گئے۔ اب جو کھمبا سامنے تھا خدا جانے یہ سولھواں تھا یا سترھواں۔ اگر چودھواں دراصل تیرھواں تھا تو یہ پندرھواں یا پھر سولہواں کھمبا ہو گا۔ مگر پندرھواں تو دراصل چودھواں تھا اور چودھواں، چودھواں کہاں تھا وہ تو اصل میں تیرھواں تھا،اس لحاظ سے۔۔؟

''میری صرف پندرہ چھٹیاں رہ گئی ہیں انجی۔''

تو اس لحاظ سے بیسواں دراصل پندرھواں،نہیں انیسواں ہوا اور سولہواں تو اس نے بالکل غلط گنا تھا۔ وہ اصل میں پندرھواں ہی تھا۔ دراصل کھمبے پندرہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ ہر پندرہ کھمبوں کے بعد پھر پہلا کھمبا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ کل کھمبوں کو گن کر پندرہ پر تقسیم بھی تو کر سکتا ہے۔ اسے یاد آیا،اس نے بچپن میں

بہت سی چیزیں گنی تھیں۔ ستاروں کی تعداد تو اب اسے یاد نہیں آ رہی تھی لیکن ایک میل میں شائد سترہ کھمبے تھے۔ اس نے سترہ کھمبوں سے ایک سو پچھتر میلوں کو ضرب دی۔دس میل لمبی اس ضرب میں بہت سی چیزیں شامل ہو گئیں۔

درخت، فصلیں، پیدل جاتے ہوئے دیہاتی آدمی، کھیتوں میں چرتے ہوئے مویشی، بستی کو لوٹتے ہوئے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور ریلوے لائن کے متوازی جاتی ہوئی شاہراہ اعظم کی بسیں، ٹرک، کاریں، بیل گاڑیاں اور شیشم کے درخت،اس حساب سے نہ جانے کتنی بھیڑیں، کتنے ٹرک، کتنے درخت اور کتنے کھمبے حاصل ضرب تھا اور نہ جانے اس حاصل ضرب کو پندرہ میلوں پر تقسیم کرنا تھا یا پندرہ بکریوں پر۔ مگر وہ تو کھمبے گن رہا تھا بارہ کھمبے اس نے ٹھیک طرح سے گن لئے تھے۔ تیرھویں کھمبے کا گھپلا ہو گیا تھا۔ اسے شمار میں نہ آ سکنے والا کھمبا یاد آیا۔بے چارہ تیرہواں کھمبا۔ بارہ برس پیچھے تو کوڑی کے بھی دن پھر جاتے ہیں۔ لیکن اس بیچارے کھمبے کے دن کبھی نہ پھرے۔اسے پتہ ہی نہ چلا، وہ پھر گانے لگا ہے۔رت پھری پر دن ہمارے، پھرے نہ، پھرے نہ، پھرے نہ۔

پھر اسے تین اور تیرہ کی کہاوتیں اور طعنے یاد آئے۔

'' تین بلائے تیرہ آئے دے دال میں پانی''

''نہ تین میں نہ تیرہ میں۔''

''نو نقد نہ تیرہ ادھار۔''

''چناب آ گیا انجی!'' اس کے شوہر نے کہا۔ '' اور چائے بھی، چکن سلائس اور شامی کباب۔''

''اونہہ یہ کیسی باس ہے میں نہیں کھاتی۔''

''بھئی مچھلی کے کباب ہیں آج گوشت کا ناغہ ہے نا۔''

''بڑی خراب سی بو ہے شائد باسی مچھلی کے ہیں۔''

اس کی ران میں درد ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا چیری ہوئی ران سے ساری پٹیاں اتار کر اسے دکھائے اور کہے:

''طوفان کی وجہ سے مجھے آج کوئی مچھلی نہ ملی اور میں نے اپنی ران چیر کر تمہارے لئے کباب تلے مگر تمہیں بو آتی ہے تم اسے باسی کہتی ہو۔''

مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

وہ چکن سلائس کھاتی اور چائے پیتی رہی۔ اس کے شوہر نے کہا۔

''ہاں انجی۔ ستار مجھے بھی بہت پسند ہے۔میرا ایک دوست خوب بجاتا ہے کبھی سنیں گے۔''

اس نے ریل کار میں بیٹھے بیٹھے ٹیلیفون لائن کے کھمبے اکھاڑے۔ پھر ان کو آگے پیچھے کر کے اس طرح گاڑا کہ ڈھیلے ڈھالے تار تن گئے۔ پھر وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ستار بجانے لگا۔ ستار بجاتے بجاتے اس کی انگلیاں لہو لہان ہو گئیں۔ گجرات سے جہلم تک ٹیلی فون لائن کے سارے تار سرخ ہو گئے۔ مگر اسے کسی نے داد نہیں دی۔ جہلم ریلوے اسٹیشن پر ریل کار رکی تو اس کا شوہر کسی کام سے نیچے اتر گیا۔ اس کا جی چاہا وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف اتر جائے اور اسے واپس لے جا کر وہ سارے تار دکھائے جو سرخ ہو گئے تھے۔ پھر وہ دونوں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بکھرے ہوئے وارث شاہ کے مصرعے چنیں اور گنتی میں نہ آ سکنے والے تنہا اداس اور ویران کھمبے سے جا کر لپٹ جائیں اور اتنا روئیں کہ اس کھمبے کے چاروں طرف اور کچھ نہیں تو گھاس ہی اگنے لگے۔ پھر اس نے چاہا کہ وہ کوئی تڑپا دینے اور دل جلا دینے والا مکالمہ بولے جیسے فلموں کے ولن بولتے ہیں مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ بے چینی سے برابر اس دروازے کی طرف دیکھے جا رہی تھی جس سے اس کا شوہر پلیٹ فارم پر اترا تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتا۔

اس کا شوہر آیا تو وہ الجھ پڑی۔ ''اتنی دیر لگا دی آپ نے؟''

''اوہ انجی۔۔ تم تو بچوں کی طرح پریشان ہو جاتی ہو؟''

شام گہری ہو گئی تھی۔

وہ کھڑکی کے شیشے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے پس منظر میں ٹنڈ منڈ درخت، اداس کھمبے اور خشک پہاڑیاں تھیں۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور جس قدر اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا کھڑکی کے شیشے میں اس کی تصویر اور واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مگر وہ اندھیرے سے سہمی جا رہی تھی جیسے اس کے آس پاس انسان نہیں بدصورت چڑیلیں شور مچا رہی ہوں۔ وقت ایک سیاہ عفریت کی طرح اس کے چہرے کے پس منظر میں ساتھ ساتھ بھاگا جا رہا تھا۔ وہ خود بھی خوف زدہ سا ہو گیا۔وہ کھڑکی کے شیشے میں یہ تصویر دیکھنا نہیں چاہتا تھا،وہ یہ تصویر دیکھنے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس نے سیٹ چھوڑ دی اور دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرف دونوں کی پیٹھ تھی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ سامنے کی سیٹ خالی ہوتے ہی اس نے اپنے مہندی سے رچے ہوئے پاؤں اس سیٹ پر رکھ لئے ہونگے اور اطمینان کا گہرا سانس لے کر باتوں میں لگ گئی ہو گی۔ اپنے وجود کی بے معنویت پر وہ کڑھنے لگا۔۔۔۔۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ ریل کار سے کود کر سب لوگوں کو چونکا دے۔ مگر اسی لمحے ہوا کا ایک سرد جھونکا ادھ کھلے پٹ سے سسکتا ہوا اندر آیا اور اس سے لپٹ کر بولا۔

''باہر بڑا اندھیرا ہے۔''

اس نے دروازہ بند کرنا چاہا تو سرد ہوا کے کتنے ہی جھونکے دروازے پر دستکیں دینے لگے۔ اس نے دروازہ پھر کھول دیا۔ ہوا کے جھونکے سسکتے ہوئے آتے اور اس سے لپٹ لپٹ جاتے۔تاریکی سے خوفزدہ ہو کر آنے والے ان جھونکوں کو اپنے جلتے ہوئے روشن بدن میں پناہ دے کر اسے بڑی راحت مل رہی تھی۔ اس نے اپنے بدن سے سگریٹ سلگایا۔چنگاریاں اڑیں اور اپنے ہی سگریٹ کا دھواں اس کی آنکھوں میں گھس گیا۔ سرد ہوا کے جھونکوں کا سوت اس کے جسم سے لپٹتا جا رہا تھا اور ریل کار بے آب و گیاہ پہاڑیوں میں بھاگتی جا رہی تھی۔ ہر طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ کبھی کبھار کسی پہاڑی گاؤں میں کوئی دیا ٹمٹماتا نظر آ جاتا تھا۔ ریل کار پوری تیزی سے اندھیرے کے عفریت کو کچلتی اور سیٹیاں بجاتی بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈبے میں شور اب بہت کم تھا۔ ہر شخص ہر بات سے اکتا کر اونگھ رہا تھا یا پھر تھکے تھکے لہجے میں ہمراہیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اچانک ریل کار ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی لوگ ایک دوسرے پر گر پڑے۔

’’کیا ہوا؟‘‘

’’سگنل نہیں ملا ہو گا؟‘‘

’’کوئی نیچے تو نہیں آ گیا؟؟؟‘‘

کسی کے نیچے آنے کی بات سن کر وہ لرز گئی۔اس کا رنگ فق ہو گیا اور منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

’’ہائے میں مر گئی۔۔ اس نے خودکشی کر لی۔‘‘

’’کس نے خودکشی کر لی اور تمہیں کیا ہوا ہے انجی۔‘‘

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دروازے کی طرف اشارہ کر کے اور سسک کر رہ گئی۔ اس کے شوہر نے پلٹ کر دیکھا وہ دروازے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

***

تماشا

اندھیرے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔

کنارے پر جگہ جگہ ادھ کھائی اور مری ہوئی مچھلیاں بکھری پڑی ہیں۔ چھوٹا کہتا ہے۔

''یہ لدھروں کی کارستانی لگتی ہے ابا۔''

''ہاں پتر۔'' بڑا کہتا ہے۔ ''یہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ضرورت سے زیادہ مچھلیاں مار مار کر جمع کرتے رہتے ہیں مگر کھاتے وقت آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور شکار کو خراب اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے ہیں۔''

''یہ اتنی ساری مچھلیاں !'' چھوٹا کہتا ہے۔ ایک رات میں اتنی مچھلیاں مارتے ہیں ۔۔ تو دریا مچھلیوں سے خالی نہ ہو جائے گا؟''

''اگر لدھروں کی تعداد بڑھتی رہی تو ایسا ہو سکتا ہے۔''

وہ سامان رکھ کر کنارے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پار دیکھتے ہیں۔بستی۔۔ جہاں انہیں پہنچنا ہے اس کی مسجد کے مینار صاف نظر آتے ہیں مگر اس تک پہنچنے کے لئے پل ہے نہ کشتی۔۔ وہ پریشان ہو کر دریا کی طرف دیکھتے ہیں دریا ہر جگہ سے ایک جیسا گہرا اور چوڑا ہے۔ بڑا کچھ دیر تامل کرتا ہے پھر کہتا ہے

''اللہ کا نام لے کر ٹھل پڑتے ہیں پتر۔''

''جیسے تمہاری مرضی ابا۔''

''اگر ڈوب گئے تو''

''تو آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔''

''تو کافی ہوشیار ہو گیا ہے جمورے'' بڑا ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

''تمہارا چیلا جو ہوا ابا۔''

''ضرور ٹھل پڑتے پتر۔'' بڑا کچھ دیر سوچنے کے بعد کہتا ہے۔ ''مگر مجھے رات والا خواب یاد آ رہا ہے۔''

''کیسا خواب ۔۔ابا؟''

''بہت ڈراؤنا خواب تھا پتر۔''

''کیا دیکھا تھا ابا؟''

''میں نے دیکھا جمورے کہ بہت بڑا مجمع ہے۔ میں تماشائیوں کے درمیان کوڈیوں والے کو گلے میں ڈالے کھڑا ہوں۔ بچے تالیاں بجاتے اور بڑے زمین پر بچھی چادر پر سکے پھینک رہے ہیں کہ اچانک کوڈیوں والا جسے میں نے تمہاری طرح لاڈ پیار سے پالا ہے، میری گردن میں دانت گاڑ دیتا اور اپنا زہر انڈیل دیتا ہے۔''

''پھر کیا ہوا ابا؟''

''پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے لوگوں کے چہرے دھندلا جاتے اور آوازیں ڈوب جاتی ہیں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں موت ایسی نیند کے اندھے کنوئیں میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈوبتے ڈوبتے رہی سہی طاقت جمع کر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں آواز کا تیر پھینکتا اور تمہیں پکارتا ہوں۔''

''پھر؟''

''پھر میں اپنی ہی چیخ کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھاکیا دیکھتا ہوں کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ چاند ڈوب چکا ہے۔ کتے رو رہے ہیں اور اوس سے بوجھل ہوا اداس اداس پھر رہی ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر میں نے دیکھا کہ تم ٹھنڈ کی وجہ سے سمٹے ہوئے ہو۔ میں نے تمہارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمہارے گلے پر چھری چلانے اور تمہیں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ڈالا کرتا ہوں۔ مگر رات کے اس اداس پہر میں مجھے اپنا چادر ڈالنے کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اڑ گئی۔''

''بس!۔'' چھوٹا کہتا ہے۔ ''اس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہمیں دریا میں نہیں اترنا چاہیے۔''

''ہاں پتر۔ آج کا دن ہمارے لیے اچھا نہیں ہے۔''

وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا اور سستانے لگتا ہے۔ چھوٹا ابھی تک تازہ دم ہے۔ دوڑ دوڑ کر ٹیلوں پر چڑھتا اترتا ہے اور اچانک پکارتا ہے۔

''ابا پل۔۔ مجھے پل دکھائی دے رہا ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔''

''پل کا نام سن کر بڑے کے بوڑھے جسم میں زندگی کی تازہ لہر دوڑ جاتی ہے وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا ٹیلے پر آتا ہے اور اس طرف کو دیکھتا ہے جدھر پانی بہتا ہے۔ پھر خوش ہو کر کہتا ہے۔ ''ہاں پل زیادہ دور نہیں ۔۔ مگر راستہ دشوار گزار ہے۔''

''کوئی بات نہیں ابا۔''

دونوں اپنا اپنا سامان اٹھا لیتے اور دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ راستہ مشکل ہے۔ بہت سے نشیب و فراز۔ ٹیلے اور کھائیاں۔ ندی نالے۔ گھنا جنگل۔ خاردار جھاڑیاں اور پاؤں لہولہان کر دینے والی دوب۔۔ مگر وہ چلتے رہتے ہیں۔ چلتے رہتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرے کنارے پر بستی کی مسجد کے اونچے مینار بھی چلتے رہتے ہیں۔ چلتے چلتے وہ تھک جاتے ہیں۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی ہے مگر پل اب بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے جتنا اس وقت نظر آتا تھا جب وہ چلے تھے۔ بڑا کہتا ہے۔

''عجیب بات ہے جمورے۔۔ پل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے۔''

'' اور بستی بھی ابا'' چھوٹا کہتا ہے۔ ''مینار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔''

''عجیب بات ہے جمورے''

''بہت ہی عجیب ابا۔''

''یہ کوئی اسرار ہے پتر''

''میرا خیال ہے ابا'' چھوٹا کہتا ہے۔ ''ہم ہر روز لوگوں سے مخول کرتے ہیں آج ہمارے ساتھ مخول ہو رہا ہے۔''

''اللہ خیر کرے''

چلتے چلتے دوپہر ڈھلنے لگتی ہے۔ وہ چل چل کر نڈھال ہو جاتے ہیں۔ دریا کا گدلا پانی پی پی کر ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں خاردار جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر لباس تار تار ہو جاتا اور پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں۔ مگر پل اور بستی کے مینار اب بھی اتنے ہی فاصلے پر نظر آتے ہیں۔

''رک جا پتر۔'' بڑا کہتا ہے۔ ''اس پار والی بستی تک پہنچنا شاید ہمارے مقدر میں نہیں ہے ہم اس آگے ہی آگے چلتے ہوئے پل تک کبھی نہ پہنچ پائیں گے۔''

''پھر کیا کریں ابا؟''

''واپس چلتے ہیں پتر؟''

''نہیں ابا۔ واپس جا کر کیا کریں گے۔ ہماری منزل تو اس پار کی بستی ہے اور پھر ابا۔۔ واپس پلٹ جانا مردوں کا کام نہیں ہے۔''

''ہاں پتر۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔۔ ہماری تو زنانیاں بھی دریا کی بپھری ہوئی لہروں سے نہیں ڈرتیں ۔۔ کچے گھڑوں پر ٹھل پڑتی ہیں۔''

''واہ ابا۔۔ کیا بات کہی ہے۔۔ چلو ٹھل پڑتے ہیں۔''

''نہیں پتر۔۔ تم تھک جاؤ گے۔۔ اور پھر ہمارے پاس سامان ہے۔''

''تم میری فکر نہ کرو ابا۔۔ اور سامان کا کیا ہے وہاں جا کر نیا بنا لیں گے۔''

بڑا کوئی جواب نہیں دیتا۔ سامان نیچے رکھ کر دریا کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ پھر گانے لگتا ہے۔ ''نیں وی ڈوہنگھی تلہ شینھاں تاں پتن ملے۔''

(ندی گہری اور کشتی پرانی ہے اور گھاٹ پر شیروں کا پہرا ہے)

چھوٹا لقمہ دیتا ہے۔ ''میں وی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے''

(مجھے بھی محبوب کی بستی پہنچنا ہے،کون ساتھ چلے گا)

اچانک کتوں کے بھونکنے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

''یہ آوازیں ؟'' چھوٹا کہتا ہے۔ ''اس جنگل بیابان میں ؟''

''میرا خیال ہے یہاں قریب ہی کوئی آبادی ہے کوئی دوسری بستی۔''

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔''

''پتر کیوں نہ آج کی رات یہیں اس بستی میں گزار لیں۔ صبح سویرے تازہ دم ہو کر چلیں گے۔''

''جیسے تمہاری مرضی ابا۔''

بڑا کچھ دیر سوچتا رہتا ہے پھر آوازوں کے تعاقب میں چلنے لگتا ہے چھوٹا پلٹ پلٹ کر دریا کے اس پار والی بستی کی طرف دیکھتا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ دریا کا کنارا لحظہ لحظہ دور ہوتا جاتا ہے اور وہ چھوٹی سی ایک بستی کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

اچانک بڑا ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بیری کے درخت کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ ''یہ کیا تماشا ہے جموریا۔''

جمورا بیری کی طرف دیکھتا ہے۔ زمین سے مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر مارتا ہے پھر زمین سے بیر اٹھا کر چکھتا اور تھوک دیتا ہے۔

''تمہارا شک ٹھیک ہے ابا۔۔ دھرکونے (نبولیاں)ہی ہیں کڑوے زہر''

''ر ب خیر کرے۔ بیری کے ساتھ دھرکونے۔'' بڑا کہتا ہے۔ ''کوئی اسرار ہے پتر۔''

چھوٹا کوئی جواب نہیں دیتا۔ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا ہے۔بڑا پوچھتا ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو پتر ابابیلیں ہیں ''

''ہاں ابا۔۔ پورا لشکر ہے۔''

''دانہ دنکا ڈھونڈھ رہی ہوں گی پتر۔''

''کیا پتہ کچھ اور ڈھونڈھ رہی ہوں ابا۔''

'' اور کیا پتر؟''

''ہاتھیوں کو ابا۔''

''نہیں پتر۔۔ یہ وہ ابابیلیں نہیں ہیں۔ یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چہچہانے اور چوگ بدلنے والی ابابیلیں ہیں۔''

''یہاں سے نکل چلیں ابا۔۔ یہ ٹھیک جگہ نہیں ہے۔''

''رب خیر کرے گا پتر۔'' بڑا کہتا ہے۔ ''کچھ دھندا کر لیں۔ رات بسر کر کے صبح سویرے نکل چلیں گے۔''

''جیسے تمہاری مرضی ابا۔''

بستی میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کھلی جگہ پر سامان رکھ کر آس پاس کا جائزہ لیتے ہیں۔ پھر چھوٹا زمین پر چادر بچھا کر اس کے ایک کونے پر بیٹھ جاتا ہے اور بڑا بانسری اور ڈگڈگی نکال کر بجانے لگتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں بڑا چھوٹے کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔

اب رات بسر کرنے کا اچھا بندوبست ہو جائے گا۔

بڑا بانسری اور ڈگڈگی بجاتا رہتا ہے جب تھک جاتا ہے تو کہتا ہے۔

’’پتر جموریا۔۔ یہ بستی بھی عجیب ہے۔ ڈگڈگی بجاتے بجاتے میرا بازو شل ہو گیا ہے اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے میرا اندر سکھناں (خالی)ہو گیا ہے مگر ابھی تک کسی بالغ مرد یا عورت نے جس کے کھیسے میں پیسے ہوں ادھر کا رخ نہیں کیا۔‘‘

’’کیا پتہ ابا۔‘‘ چھوٹا کہتا ہے۔ ’’یہاں کے لوگ بہرے ہوں یا انہوں نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہو۔‘‘

’’وہ کیوں پتر۔‘‘

’’وہ اس لیے ابا۔۔ کہ جب بندہ کبھی بھی خیر کی خبر نہ سنے تو آہستہ آہستہ اس کا دل اکا سننے ہی سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔‘‘

’’واہ جمورے تو نے سبق خوب پکایا ہوا ہے اچھا یہ بتا تجھے کیسے پتہ چلا کہ ان لوگوں نے کبھی خیر کی خبر نہیں سنی‘‘

’’میں نے ان نیانوں (کم سنوں) کی صورتوں سے اندازہ لگایا ہے ابا۔‘‘

’’تو بہت ہوشیار ہو گیا ہے جمورے۔‘‘

’’تمہارا چیلا جو ہوا ابا۔‘‘

’’واقعی پتر۔۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارے یتیم ہیں۔‘‘

’’مجھے تو ایسا لگتا ہے ابا جیسے انہوں نے اپنے باپوں کو شہر بدر کر دیا ہوا ہے۔‘‘

’’شاید ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔‘‘

’’ہاں ابا۔‘‘

’’دیکھ نا پتر۔۔ ساری بستی میں کوئی ایک بھی بالغ مرد عورت نہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب بھی ہماری طرح دوسری بستیوں میں تماشا دکھانے گئے ہوں گے۔‘‘

’’پھر تو ان کی واپسی کا انتظار ضرور کرنا چاہیے ابا۔‘‘

’’کیوں پتر۔‘‘

’’یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ بڑے مداری ہیں یا تم؟‘‘

’’نہیں جموریا مجھے ان بچوں سے خوف آنے لگا ہے۔ عجیب سے بچے ہیں۔‘‘

’’تو پھر یہاں سے چلتے ہیں ابا۔‘‘

''ہاں پتر۔۔ چلے جانا ہی اچھا ہے مگر تو ذرا ان چھوٹوں سے یہ تو پوچھ ان کے بڑے کہاں ہیں ؟''

''ہم خود بڑے ہیں۔'' مجمع میں سے ایک بچے کی آواز آتی ہے۔ ''کیا ہم تمہیں چھوٹے نظر آتے ہیں ؟''

بڑا اور چھوٹا چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور ابھی اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ چھوٹی عمر کا ایک اور بچہ نہایت پختہ لہجے میں کہتا ہے۔

''منشی ٹھیک کہتا ہے۔۔ تم لوگ جلدی جلدی کھیل دکھاؤ اور اپنی راہ لو۔۔ ہم ایسے لوگوں کو جو خود کو ہم سے بڑا سمجھتے ہیں بستی میں زیادہ دیر رکنے کی اجازت نہیں دیتے۔''

''تو کیا اس بستی میں پورے قد کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔''

''ہم رہنے ہی نہیں دیتے۔۔'' ایک بچہ ہنس کر کہتا ہے۔ ''ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔''

''تو یہ بستی؟'' بڑا ہکلا جاتا ہے۔

''ہاں یہ بستی۔۔ یہ ہماری بستی ہے اور میں یہاں کا سردار ہوں۔ لیکن تم وقت ضائع نہ کرو۔اگر تم نے کوئی اچھا کرتب دکھایا تو ہم تمہیں ضرور انعام دیں گے۔۔ چلو تماشا دکھاؤ۔''

''ابھی تو ہم خود دیکھ رہے ہیں۔'' چھوٹا کہتا ہے۔

''تمیز سے بات کرو لڑکے۔'' سردار غصے سے کہتا ہے۔ ''ورنہ!''

''ارے۔'' چھوٹا ہنستا ہے۔ ''تم تو واقعی سردار کے بیٹے لگتے ہو۔''

''سردار کا بیٹا نہیں ۔۔ میں خود سردار ہوں۔''

''ہاں ہاں ۔۔ یہ سردار ہے۔'' بہت سی آوازیں آتی ہیں۔ چھوٹا ہنستا چلا جاتا ہے پھر بڑے کے قریب آ کر کہتا ہے۔

''میرا خیال ہے ہم بونوں کی بستی میں آ گئے ہیں۔''

''مداری۔۔ یہ کیا بکواس ہے۔'' سردار چلا کر کہتا ہے۔ ''یہ ہمیں بونے کہتا ہے اس بدتمیز بچے کو چپ کراؤ ورنہ بستی سے نکل جاؤ۔''

بڑا ششدر کھڑا چاروں طرف دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ سے کہتا ہے۔

''جمورے چپ ہو جا۔۔ یہ کوئی اسرار ہے۔''

’’کیا اسرار ہے ابا۔۔ یہ بچے۔‘‘

’’یہ بچے نہیں ہیں پتر۔‘‘ بڑا اس کی بات کاٹ کر کہتا ہے۔

’’پھر کیا ہیں ابا؟‘‘

’’غور سے دیکھ جمورے۔۔ ان کے بال سفید ہیں اور ان کے چہروں پر جھریاں ہیں ان کی عمریں زیادہ ہو گئی ہیں مگر ان کے ذہن نابالغ رہ گئے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔‘‘

’’عجیب بات ہے۔‘‘

’’بہت ہی عجیب پتر۔۔ رب خیر کرے۔‘‘

اچانک چند بچے بہت سی چارپائیاں اور مونڈھے اٹھائے آتے ہیں اور سردار بچے سمیت بہت سے دوسرے تماشائی بچے ان چارپائیوں اور مونڈھوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردار تحکمانہ لہجے میں کہتا ہے۔

’’کھیل شروع کیا جائے۔‘‘

بڑا پریشان ہو کر تماشائیوں پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ پھر تھیلے میں سے چیزیں نکالنے لگ جاتا ہے۔

سب سے پہلے وہ تین گولے نکال کر زمین پر رکھتا ہے پھر انہیں تین پیالوں سے ڈھانپ دیتا ہے۔کچھ پڑھ کر پھونک مارتا اور باری باری سارے پیالے اٹھا کر دکھاتا ہے۔ گولے غائب ہو چکے ہیں۔

وہ تماشائیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا ہے مگر وہ تالیاں نہیں بجاتے، داد نہیں دیتے، چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وہ پیالوں کو اوندھا کر کے باری باری اوپر اٹھاتا ہے اب ہر پیالے کے نیچے ایک ایک گولہ دکھائی دیتا ہے وہ دوبارہ سردار اور دوسرے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے مگر وہ اب بھی خاموش رہتے ہیں۔

پھر وہ جیب سے ایک روپے کا سکہ نکالتا ہے ایک کے دو اور دو کے چار بناتا ہے اور کہتا ہے

’’مہربان۔۔ قدردان۔۔ میں جادوگر نہیں ہوں۔ یہ محض ہاتھ کی صفائی ہے جادوگر ہوتا تو یہاں نہ ہوتا گھر میں بیٹھا سکے بنا رہا ہوتا۔‘‘

’’ہمیں معلوم ہے تم کھیل دکھاؤ۔‘‘ سردار اسے ٹوکتا ہے۔

’’تو پھر تم خود ہی میدان میں آ جاؤ۔‘‘ جمورا طنز کرتا ہے۔

''مداری۔۔ یہ لڑکا۔'' سردار غضبناک ہو جاتا ہے۔

''میں معافی چاہتا ہوں سردار۔'' بڑا کہتا ہے اور اشارے سے جمورے کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے اور باری باری بہت سے کھیل دکھاتا ہے۔ خالی گلاس پانی سے بھر جاتا ہے اور بھرا ہوا گلاس اوندھا کرنے سے پانی نہیں گرتا۔

مٹھی میں بند کر کے نکالنے سے رومال کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ جلتا ہوا سگریٹ نگل کر کانوں کی طرف سے دھواں نکالتا ہے۔ کوڈیوں والے سے ڈسواتا اور اسے گردن میں ڈال لیتا ہے۔ منہ کے راستے پیٹ میں خنجر اتار کر نکال لیتا ہے۔

مگر سردار سمیت کوئی تماشائی تالی نہیں بجاتا داد نہیں دیتا۔وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ پھر اعلان کرتا ہے۔

''اب آخر میں میں جمورے کے گلے پر چھری چلاؤں گا اور اسے ذبح کر کے دوبارہ زندہ کر دکھاؤں گا۔''

سردار سمیت سارے تماشائی زور زور سے تالیاں پیٹتے ہیں۔ وہ بے حد حیران ہوتا ہے۔ عام طور پر تماشے کے آخر میں جب وہ اس کھیل کا اعلان کیا کرتا ہے تو بہت سے تماشائی اس کھیل کو ناپسند کرتے اور اسے منع کر دیتے ہیں مگر پتا نہیں یہ کیسے سفاک تماشائی ہیں کہ چھری چلانے کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے ہیں۔

وہ جمورے کو زمین پر لٹاتا ہے اس کے اوپر اسی طرح چادر ڈالتا ہے۔ جیسے ہمیشہ ڈالا کرتا ہے۔ پھر تھیلے میں سے چھری نکال کر اس کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے۔

''صاحبان۔۔ قدر دان۔۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری نہیں چلا سکتا۔۔ نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہو سکتا ہے۔۔ یہ سب کچھ ایک کھیل ہے۔۔ نظر کا دھوکہ۔۔ اس پاپی پیٹ کی خاطر۔''

''ہمیں معلوم ہے''

''ہم جانتے ہیں ''

''باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔'' سردار کہتا ہے۔

''چھری چلاؤ''۔۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

''چھری چلاؤ۔۔ چھری چلاؤ۔'' تماشائی شور مچاتے ہیں۔

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور جمورے کے قریب آ کر چھری چلاتا ہے۔

تماشائی زور زور سے تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں، سکے پھینکتے اور بکرے بلاتے ہیں اور جمورے کے دوبارہ زندہ ہونے کا کھیل دیکھے بغیر کھسکنے لگتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا پڑ خالی ہو جاتا ہے۔

وہ جمورے کو آواز دیتا ہے۔ ''اٹھ پتر۔۔ پیسے جمع کر۔''

مگر جمورا کوئی جواب نہیں دیتا۔

وہ گھبرا کر چادر ہٹاتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ جمورا خون میں لت پت ہے اور اس کی گردن سچ مچ کٹی پڑی ہے۔اس کی چیخیں ساری بستی میں گونجنے لگتی ہیں۔

***

تیاری

شنید ہے کہ جن دنوں عدنان سمیع گوندا کے ساتھ مل کر گلی گلی ناچتا اور گاتا پھرتا تھا۔''کوئی چھپر پھاڑ مولا۔اپنی جیبیں جھاڑ مولا۔مجھ کو بھی تو لفٹ کر ا دے ''تو خدا عدنان سمیع کی اداؤں اور بے تکلفی سے بہت خوش ہو ا تھا اور اسے نوازنا اور چھپر پھاڑ کر دینا چاہتا تھا مگر بعض مشیر فرشتوں نے بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہو کر عرض گزاری کہ یا الٰہی عدنان سمیع ایک ناشکر ا شخص ہے۔ تو نے اسے اتنا کچھ دیا تھا مگر اس نے سب تلپٹ کر دیا۔ اچھی صحت اور صورت۔بیوی، کامنی سی مورت،بیٹا،شہرت اور پیسہ۔ اور سب سے بڑھ کر اچھی آواز اور سُر کا گیان۔مگر وہ تو اپنے بدن کی حفاظت بھی نہ کر سکا۔پھر ستم یہ کہ مملکتِ خدا داد کی مضبوط آمریت کے فیوض و برکات ترک کر کے اس نے کافروں کی نا پائیدار جمہوریت میں پناہ لی جس میں ہر چار پانچ سال بعد سیاسی لیڈر الیکشن کی آڑ لے کر اقتدار اپنے جیسے دوسرے سویلین لیڈروں کو منتقل کر دیتے ہیں اور ملک کے سب سے مضبوط،منظم اور اہم ادارے کی باری ہی نہیں آنے دیتے۔

یہ بھی شنید ہے کہ بعض بنیاد پرست فرشتوں نے عدنان سمیع کے گوندا،رانی مکرجی اور امیتابھ بچن جیسے کافر فنکاروں سے میل جول اور دوستی کو ناپسند کیا اور خدشہ ظاہر کیا کہ اگر عدنان سمیع کو نواز ا گیا تو اس کے کافر ساتھیوں کو بھی جن کے پاس پہلے ہی بہت کچھ ہے، مزید کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا۔ورنہ بھگوان سے سفارتی تعلقات کشیدہ ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے بہتر ہو گا کہ کسی ایسے شخص کو نواز ا جائے جس کو دیکھ کر خدا کی شان نظر آنے لگے۔چنانچہ قرعۂ فال استاد نفاست علی خاں کے نام نکلا جو پاک وطن کے ایک دور افتادہ پلید سے گاؤں میں نہایت ہی صابر و شاکر قسم کے،مال و دولت کی حرص و ہوس سے بے نیاز ایک کلاسیکل گویے تھے اور اتنے درویش صفت اور خوددار کہ گاؤں کا نمبردار چوپال میں ان کی حاضری کو ترستا تھا مگر کسی دھونس یا لالچ سے انہیں چوکی بھرنے پر مجبور نہ کر سکا تھا اور خدا اپنے بندے سے خوش ہوا اور اسے بن مانگے چھپر پھاڑ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ اسی دور میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں خدا نہیں دینا چاہتا تھا مگر وہ امریکہ سے مانگ لیتے تھے۔ یا اسی کا دیا ہوا اسلحہ بیچ باچ کر کام چلا لیتے تھے۔

نفاست علی خاں کے کوائف کی مزید چھان پھٹک کی گئی تو پتہ چلا اس کو اچھی آواز اور گانے کا فن تو بخشا گیا تھا مگر مناسب ماحول عطا نہیں کیا گیا تھا۔لوگ تو سادہ اور اچھے تھے مگر ایک گندے اور بدبو دار تالاب نے سارے گاؤں کو اپنی

لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ تالاب کی بدبو آہستہ آہستہ گاؤں والوں کے دماغوں میں بھی سرایت کر گئی تھی اور انہیں ایک دوسرے سے اور پیٹ اور کھیت دونوں طرح کی اجناس کے سوا ہر چیز سے بدبو آتی تھی۔ گانا بجانا سنتے ضرور تھے مجرے بھی کرواتے تھے مگر اس پیشے کو نہایت ہی گھٹیا سمجھتے تھے۔استاد نفاست کے پیشے کو بھی کبھی عزت کی نظر سے نہ دیکھا گیا مگر اس نے راہِ فرار اختیار کی نہ اپنے والدین کو جدائی کے صدمے سے دوچار کیا اور قریبی قصبے کے ایک نامور گویے کی شاگردی کرنے اور کلاسیکی موسیقی پر عبور حاصل کرنے کے بعد واپس اپنے گھر لوٹ آیا اور برس ہا برس روکھی سوکھی کھا کر ریاض اور ریاضت کرتا رہا۔اس دوران میں اسے بہت سی تکالیف اور عسرت کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کیا اور اگرچہ اس کے فن کی پورے علاقے میں کچھ قدر و قیمت نہ تھی لیکن وہ اکیلا ہی گندے جوہڑ کے کنارے اپنے جھونپڑی نما آبائی گھر میں بیٹھا بدلتے موسموں اور اوقات کے حوالے سے میٹھے میٹھے راگ الاپتا رہتا۔

نفاست علی خاں کے نغمے وہ خود سنتا تھا یا اس کا خدا۔البتہ شروع میں سامنے والی حویلی کی تالاب کی طرف کھلنے والی کھڑکی رات کو،چاہے وہ کتنی ہی برفانی ہوتی، کھلی رہتی اور دو نظر نہ آنے والی آنکھیں اس کی جھونپڑی پر لگی رہتیں۔ اور رات رات بھر نفاست علی کے گیت پانی پر تیرتے ہوئے حویلی کی دیواروں سے ٹکراتے رہتے۔کبھی کبھی وہ خود کسی راگ،الاپ یا گیت کے بولوں میں ڈھل کر اور لہروں میں تبدیل ہو کر پانی پر تیرتا ہوا کھڑکی کے پاس جا رکتا۔

*اب تو آؤ سجنا

*کوئل کوک رلائے

’’مجھے پوری سمجھ تو نہیں آتی پر میں یہ گیت سن کر کبھی خوشی سے جھومنے اور کبھی رونے لگتی ہوں ‘‘

حویلی کی لڑکی نے اپنی سکھیوں سہیلیوں کو بتایا اور وہ بھی کھڑکی کے پاس جمع ہو کر سمجھ میں نہ آنے والے گیت سننے،سر دھننے اور اپنے اپنے دکھوں کو یاد کر کے رونے لگتیں۔ پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے مگر کہتے ہیں ایک بار منہ اندھیرے وہاں سے وہی شتر سوار گزرا جس نے اِم کلثوم کو جب وہ ایک معصوم بچی تھی تلاوت کرتے سنا تھا اور ٹھٹک گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی دوسرا شتر سوار ہو مگر وہ جو کوئی بھی تھا بہت با ذوق شخص تھا کہ استاد نفاست علی خان کو برہا کا کوئی راگ گاتے سن کر اپنے بال نوچ ڈالے۔ اور گاؤں گاؤں منادی پھر گئی کہ استاد نفاست علی خاں کے گانے میں جادو ہے۔دور دور سے لوگ آنے اور سمجھ میں نہ آنے والا گانا سننے لگے اور ہر کسی کو یقین ہو گیا کہ جادو برحق ہے۔

درویشی اور قناعت پسندی کے باوجود ہر زندہ شخص کی طرح استاد نفاست علی بھی خواب دیکھتا تھا کبھی سوتے میں اور کبھی جاگتے میں۔ ایک بار اس نے دیکھا اس کا جھونپڑا ایک شاندار محل میں اور جوہڑ ایک خوبصورت جھیل میں تبدیل

ہو گئے ہیں۔اس جھیل کے پاس ایک باغ ہے جس میں درختوں پر اور جھاڑیوں میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت سپکیرز لگے ہوئے ہیں اور اس کے گیتوں کی تانیں ہر طرف سنائی دیتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کیاریوں میں موسیقی بوئی گئی اور گیت کاشت کئے گئے ہوں۔آدمی خواب بھی نہ دیکھے تو زندہ کیسے رہے۔لیکن خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔

خدا جب کسی کو دینا چاہتا ہے تو سچ مچ اس کے گھر کی چھت پھاڑ کراس میں ہیرے جواہرات،ڈالرز اور پاؤنڈز نہیں گراتا۔ نہ ہی ریال،دینار اور ین کا ہن برساتا ہے۔ حیلے رزق بہانے موت کے مصداق صرف اس کے وسیلے اور اسباب پیدا کر دیتا ہے بلکہ جب منظوری ہو جاتی ہے تو اسباب خودبخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ان دنوں ملک کے نوجوان پاپ سنگرزکا ایک گروپ یورپ کے دورے پرتھا اور ہر ملک اور بڑے شہر میں ان کے کامیاب شوز ہو رہے تھے۔دوری میں عجیب اَسرار ہوتا ہے بچپن کی چیزیں اور جگہیں ہر انسان کو عزیز ہوتی ہیں۔دور جا کر آدمی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی یاد کرتا ہے جن کو اپنے وطن میں اس نے کبھی اہمیت نہ دی تھی۔بیرون ملک پاکستانیوں کے لئے ان نوجوان فنکاروں کے پاس بہت سے اچھے اچھے عوامی قسم کے گیت تھے۔سب سے زیادہ مقبولیت فوک گیتوں اور خاص کر پنجابی گیتوں کو حاصل تھی کیونکہ پاپ میوزک کی تیزی،ردھم اور بلند آہنگی پنجابی گیتوں سے بہت لگا کھاتی ہے۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔اس نے کسی با اختیار شخص کے دل میں مشرقی کلاسیکی موسیقی کی محبت کا چراغ روشن کر دیا اور ایک روز ہر کارہ استاد نفاست علی خاں کے نام دعوت نامہ مع ایک معقول پیشکش کے لے کر آ گیا۔اور کچھ ہی عرصہ میں استاد نفاست علی خاں ولایت پہنچ گئے۔

انسان تنوع پسند تو ہے ہی۔پاپ میوزک سن سن کر اکتائے ہوئے پاکستانی اور بھارتی تارکینِ وطن نے استاد نفاست علی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔یورپ کے مختلف ممالک اور شہروں میں محفلیں منعقد ہونے لگیں اور نہ صرف پاکستانی،بنگلہ دیشی اور بھارتی بلکہ یورپی یونین اور سیکنڈے نیویا کے اہلِ ذوق بھی بڑی تعداد میں مہنگے ٹکٹ خرید کر ان محفلوں میں شامل ہونے لگے۔پہلے اخبارات نے ان محافل کا تفصیل سے ذکر کیا پھر نشر و اشاعت کے دوسرے ادارے اور ٹی وی چینلز متوجہ ہو گئے اور استاد نفاست علی خاں کے انٹرویوز اور گیتوں کی شہرت سی ڈیز اور کمپیوٹر کے ذریعے دور دور تک پھیل گئی اور جلد ہی پر لگا کر آسمان کی نچلی منزل یعنی امریکہ تک پہنچی اور انہیں بلاوا آ گیا۔

یوں تو بیرون ملک کے ان دوروں میں ان کوا تنا معاوضہ ملا تھا کہ وہ بقایا زندگی بڑی آسودگی کے ساتھ گزار سکتے تھے مگر امریکہ کے قیا م کے دوران میں ان کے کسی پرستار نے انہیں لاٹری کا ایک ٹکٹ گفٹ کیا جو بار آور ثابت ہوا۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹکٹ گفٹ کرنے والا دراصل فرشتہ تھا۔کیا پتہ وہ فرشتہ نہ ہو کوئی فرشتہ صفت ہو لیکن استاد نفاست علی اسے فرشتہ ہی مانتے ہیں۔بہرحال ہمارا

ایمان ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔استاد نفاست علی خاں کی لاٹری نکل آئی۔وہ ارب پتی بن چکے تھے۔

دنیا بھر کے اخبارات شوبز کے میگزینز،ریڈیو اور ٹی وی چینلز اور نشر و اشاعت کے اداروں کے نمائندے ٹیپ ریکارڈرز، مائیکروفونز اور کیمرے لے کر دوڑ پڑے۔سب سے زیادہ پوچھا جانے والا سوال تھا۔''آپ اتنی دولت کیسے خرچ کریں گے؟''

استاد اب ایک معمولی اور سادہ لوح دیہاتی گویے نہیں تھے۔بین الاقوامی شہرت کے مالک فنکار تھے اور تھوڑے سے وقت میں دولت کے بہت سے مظاہرے دیکھ اور سن چکے تھے۔دنیا بھر کے خیراتی اور فلاحی اداروں کے نمائندے اور لٹریچر آنے لگا۔دولت کے ساتھ ہی استاد نفاست علی خان کے ان گنت خیر خواہ۔خوشامدی اور مشیر بھی پیدا ہو گئے۔ان کا قیام چھوٹے سے فلیٹ کی بجائے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ہو گیا۔لباس،رہن سہن اور طرزِ خورد و نوش سب کچھ تبدیل ہو گیا۔مگر قناعت،انکساری اور حب الوطنی کے جذبے ماند نہ پڑے۔بلکہ وہ اپنی ماں اور مادر وطن کی خاک کے لئے اور بے چین ہو گئے۔

اپنے وطن کی سر زمین پر پاؤں رکھتے ہی ان کی دولت پچاس ساٹھ گنا ہو گئی۔ استقبال کرنے والوں میں فلاحی اور خیراتی اداروں،انجمنوں،جماعتوں،اخباروں،ریڈیو اور مختلف ٹی وی چینلوں کے نمائندے موجود تھے مگر انہیں اس وقت خوشگوار حیرت ہوئی جب انہوں نے ائر پورٹ پر استقبال کرنے والوں کے ہجوم میں اپنے گاؤں کے چودھری نور محمد کو بھی دھکے کھاتے اور دونوں ہاتھوں سے اپنی دستار سنبھالتے ہوئے دیکھا۔وہ گرتا پڑتا بمشکل ان سے ہاتھ ملا سکا۔

یہ خدا کی شا ن ہی تھی کہ گاؤں کے ایک معمولی اور کچے پکے مکان کے باہر، بدبو دار جوہڑ کے کنارے ایک ارب پتی شخص دیہات کے لوگوں کے درمیان،کھجوری بان کی کھردری چارپائی پر بیٹھا تھا اور اس حویلی سے آئی ہوئی میٹھی لسی پی رہا تھا جس کی طرف کبھی اسے دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔انہیں بتایا گیا کہ حویلی کی،ان کے گھر اور تالاب کی طرف کھلنے والی کھڑکی ایک عرصہ سے بند تھی کیونکہ اس کمرے میں اب کوئی نہ رہتا تھا اور اوپر کی منزل میں رہنے والی رانو کو جوہڑ کے گندے پانی سے گھن اور بدبو آتی تھی۔مگر تھوڑی دیر بعد گاؤں کی بہت سی بند کھڑکیاں کھلنے لگیں ان میں وہ خاص کھڑکی بھی شامل تھی۔

لوگوں کا خیال تھا استاد اب کسی بڑے شہر کی پوش آبادی میں بہت بڑا اور خوبصورت بنگلہ خرید کر منتقل ہو جائیں گے لیکن ان کی خوشی اور حیرت کی حد نہ رہی جب انہوں نے استاد کو یہ کہتے سنا کہ وہ اپنا شاندار بنگلہ اسی جھونپڑی کی جگہ پر تعمیر کریں گے جس میں ان کا بچپن اور اوائل عمری کی زندگی گزری تھی اور جس کی مٹی سے انہیں ماں باپ کے وجود کی خوشبو آتی تھی۔ اور حالانکہ وہ اچھی

طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ آنکھ سے نکلا ہوا آنسو،ہوا میں گم ہونے والا گیت اور ٹوٹا ہوا خواب اس سے دگنی دولت خرچ کرنے سے بھی واپس نہیں آ سکتے مگر انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ساری دولت گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کی حالت سدھارنے پر خرچ کر دیں گے کیونکہ یہ ان کے ایک دیرینہ خواب کا حصہ ہے۔اس پر خدا اور خوش ہوا اور ان کی دولت و ثروت میں اضافے کی نئی نئی سکیموں کے اسباب پیدا کئے یورو اور ڈالر کے نرخوں میں اضافہ کیا۔

اقتدار اور دولت جب آتی ہے تو بہت سی چیزیں مفت میں ساتھ آ جاتی ہیں جیسے مشورے دینے والے۔چاپلوسی کر نے اور ہاں میں ہاں ملانے والے۔ اور زکاتوں،عطیوں اور چندوں سے کیموفلاج ناموں والی ایسی بندے مار تنظیمیں جو نوجوانوں کی کھوپڑیوں سے دماغ کی جھلی نکال کر اس کی جگہ بھس بھر دیتی ہیں۔اور وہ علم اور ٹیکنالوجی کی بجائے پرانے زمانے کے ہتھیاروں اور جذبوں سے گائیڈڈ میزائلوں کا مقابلہ کرنے نکلتے اور ان کا نشانہ بن جاتے ہیں۔اس کے علاوہ چور اچکے، اٹھائی گیرے اور پولیس اور ٹیکسوں کے مختلف محکمے بھی الرٹ ہو گئے تھے۔میراثی،کنجر،ڈوم،بھانڈ اور اس قسم کی دوسری برادریوں کے حاسدین اور فاسدین اس کے علاوہ تھے۔جہاں گڑ وہاں مکھیاں،جہاں دولت وہاں ٹھگ۔استاد کو اپنی اور اپنی دولت کی حفاظت کی خاطر ضرورت محسوس ہوئی کہ پولیس،ٹیکسوں کے محکموں اور انتظامیہ سے تعلقات استوار کئے جائیں۔ حکومت اور اقتدار پسند سیاسی پارٹیاں خو د ایسے دولت مندوں کی تلاش میں رہتی تھیں جو گھوڑوں اور گدھوں کی خریداری میں خود کفیل ہوں۔چنانچہ استاد نے درجہ بدرجہ اوپر تک رسائی حاصل کر لی اور حکومتی حلقوں میں اوپر تک بار پا گئے۔

یوں بھی جس کے گھر دانے،اس کے کملے بھی سیانے کے مصداق جسے اقتدار،اختیار اور دولت مل جائے وہ اچانک عقلِ کل بن جاتا ہے۔نابغوں کا نابغہ۔دانشوروں کا دانشور اور استادوں کا استاد۔استاد نے سب کی سنی مگر وہی کیا جو ان کے جی میں تھا۔وہ چاہتے تو پورا گاؤں خرید سکتے تھے مگر انہوں نے اتنی ہی جگہ خریدی جتنی خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے انہیں درکار تھی۔اس پر خلقِ خدا اور گاؤں والے ان سے بہت خوش ہوئے۔

انفراسٹرکچر اور تعمیر ات کے کام کا آغاز ہوا تو چند ہی روز میں گاؤں کی کایا پلٹ گئی۔وہاں بینکوں کی شاخیں اور انشورنس کمپنیوں کے دفاتر قائم ہو گئے۔تعمیرات اور پلاننگ کے ماہرین،ڈیزائنرز، ایڈوائزرز، ایڈورٹائزرز،ڈیکوریٹرز اور ٹھیکیدار جمع ہو گئے۔ان کے طعام کے لئے موبائل ریستوران آنے لگے اور قیام کے لئے شاندار ہوٹل تعمیر ہونے لگے اور دن رات ٹرک،ٹرالے،ریڑھے،پانی کے ٹینکرز اور نرسریوں اور باغبانی کے ماہرین کی گاڑیاں آنے جانے لگیں۔بنگلے کی تعمیر کے ساتھ ہی گندے جوہڑ کو جھیل اور فواروں میں تبدیل کرنے،ملحقہ جنگل کو صاف کر کے وہاں طرح طرح کے درخت،پودے اور جھاڑیاں (Shrubs) لگانے،گاؤں کو آنے

والی سڑک کو پختہ اور دو رویہ کرنے اور سکول، کالج، ہسپتال اور عورتوں بچوں کے فلاحی مراکز قائم کرنے کا کام ایک ساتھ شرو ع ہو گیا۔

استاد نے تیس چالیس برس پہلے سوتے یا جاگتے میں جو خواب دیکھا تھا آہستہ آہستہ اس کی تعبیر متشکل ہونے لگی۔ ایک خوبصورت باغ میں سنگ مرمر کا ایک چبوترا جس کے چاروں طرف ایسے درخت لگائے گئے تھے جن سے چاندنی راتوں میں چاندی کی پتیوں جیسے پھول گرتے تھے۔بڑے سائز کے اگے اگائے سرو،صندل،یوکلپٹس اور آم کے پیڑ دوپہروں کو بھی باغ میں بہار کا سماں پیدا کئے رکھتے۔فواروں کی پھوار کے مینار جیسے آسمان کو چھوتے۔سنگِ سیاہ،سرخ اور مر مر لگی روشوں کے ساتھ پانی کی کیاریاں اور گل بوٹے جن میں بطخیں تیر رہی تھیں اور رنگین برقی قمقمے روشن تھے۔پتہ نہیں یہ مناظر جنت کی شبیہ تھے، سورگ کا عکس تھے یا یورپ اور امریکہ کے فردوس بر روئے زمیں کے ریپلیکا یا محض ان کے تخلیقی ذہن کی اختراع۔مگر آرکیٹکٹس نے ان کے خوابوں اور تصورات کو کاغذوں اور نقشوں پر اور انجینئروں نے زمین پر منتقل کر دیا۔ ظاہر ہے اس میں کچھ وقت لگ گیا۔شائد ایک جگ بیت گیا۔

یوں تو مختلف لوکل اور فارن میوزک اور ریکارڈنگ کمپنیوں کی طرف سے استاد کو سرود، ستار، پیانو، گیٹار، سکیسوفون اور کئی قسم کے نئے نئے آلاتِموسیقی تحفے میں ملے تھے مگر اتنے بڑے محل کی ڈیکوریشن کے لئے یہ سب بھی ناکافی ثابت ہوئے اور انہیں بعض چیزیں مقامی مارکیٹوں سے خریدنا پڑیں۔انہوں نے آ بائی گھر میں موجود طبلہ،ہارمونیم اور سارنگی جو باہر سے لائے گئے سازوں کے مقابلے میں بہت ہی پرانے اور معمولی معلوم ہوتے تھے خیرات کر دئیے اور ان کے بد لے پیرس اور لندن میں نئے اور خوبصورت سازوں اور ان پر ہاتھی دانت اور سونے کی نقش گری کے آرڈرز بھجوا دئیے۔

پولیس اور ضلعی حکام ہی نہیں بلکہ کمشنر بھی استاد کی خوشنودی کے لئے کوشاں رہتا کیونکہ ان کی صوبے کے وزیر اعلیٰ اور دوسرے اہم وزراء سے ذاتی دوستیاں قائم ہو چکی تھیں۔استاد کے منہ سے جو بات نکلتی اس کی کسی ایریا کمانڈر کے فرمان کی طرح تعمیل ہوتی۔بلکہ وزیر اعلیٰ نے سُر کمپلیکس کی افتتاحی تقریب میں شرکت کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔لوگ اب انہیں اسمبلی یا وزارت پر متمکن دیکھنا چاہتے تھے کیوں کہ انہوں نے گاؤں اور اس کے لوگوں کو سہولتیں اور ضروریات فراہم کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ان کی وجہ سے لوگوں کو گھر بیٹھے روز گار کے اتنے مواقع میسر تھے کہ کہیں باہر جانے کی ضرور ت ہی نہ رہی تھی۔

آخرکار خدا خدا کر کے وہ دن آ پہنچا جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا،بڑی تعداد میں دعوت نامے چھپوائے گئے اور نہ صرف ملک بھر کے سازندوں،موسیقاروں اور مغنیوں کو بلکہ پڑوسی اور دوسرے ممالک سے بھی خاص خاص لوگوں کو شرکت کے لئے بلایا گیا۔شامیانے لگ گئے۔دیگیں چڑھ گئیں۔ہر طرف زرق برق ملبوسات اور رنگین آنچل لہرانے لگے اور سُر کمپلیکس کے چار سو روشنیاں اور

خوشبوئیں پھیل گئیں۔نشر و اشاعت کے اداروں کے نمائندے جمع ہو گئے۔کولڈ ڈرنکس کی مختلف کمپنیوں نے اپنی مشینیں نصب کر لیں اور ایک بین الاقوامی میلے کا سا سماں پیدا ہو گیا۔

افتتاح کے روز جب وزیر، امیر اور سفیر تشریف لا چکے تو ان گنت کیمروں اور ریکارڈنگ مشینوں کے درمیان استاد نفاست علی خان اپنی جگہ سے اٹھے۔انہوں نے اس تقریب کے لئے رنگین،چمکیلی اور ریشمی پوشاک خاص طور پر پیرس سے تیار کروائی تھی۔استاد کے لئے یہ تقریب اس لئے بھی اہم تھی کہ اس میں رانو کی پھوپھی پہلی بار کھلے عام ان کے سامنے بیٹھ کر ان کے نغمے سننے آئی تھی۔محبت اگر سچی ہو تو وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ انہیں آج بھی یاد تھا جس روز اس کی برات آئی اور شامیانے لگے تھے اس روز د ن بھر وہ کوئلیا مت کر پکار۔۔۔گاتے رہے تھے۔ وہ منظر انہیں اب تک یاد تھا جب تالاب کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے دو آنکھیں دکھائی دی تھیں پھر کچھ آنسو تالاب کے پانی میں شامل ہو گئے تھے اور انہیں لگا تھا جیسے تالاب کا سارا پانی معطر ہو گیا ہو

وہ سنگِ مر مر کے چبوترے کی طرف چلے تو تماشائیوں اور مہمانوں کی ایک بڑی تعداد نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ فضا میں کبوتر،غبارے اور بارود کے سرخ چمکتے موتی بکھیرتی ہوائیاں چھوڑی گئیں۔وہ پیرس سے سل کر آیا ہوا زرق برق لباس زیبِ تن کئے پہلی بار چبوترے پر براجمان ہوئے۔تو سارا باغ تالیوں سے گونج اٹھا۔مگر ابھی تالیوں کا شور نہ تھما تھا کہ رانو کی لکھی ہوئی اس کی پھوپھی کی فرمائشی چٹ آ گئی۔

کوئلیا مت کر پکار

خود انہیں یہ گیت اور راگ بہت مرغوب تھا اور شائد ہر اداس روح کو پسند ہو اور پھر ان کی محبت کی پسند۔مگر ان کے سامنے صوبے کا سب سے بڑا حاکم موجود تھا۔آدابِ محفل کا تقاضہ تھا سو انہوں نے سب سے پہلے راگ درباری گانے کا فیصلہ کر لیا اور سازندوں کو اس کا اشارہ بھی دے دیا۔ولایت سے آنے کے بعد وہ پہلی بار گانے کے لئے بیٹھے تھے۔سازندوں نے ساز چھیڑ ا اور سر ملانے لگے۔ استاد نے گانے کے لئے لب کھولے۔دو ایک بار کھنکار کر گلا صاف کیا۔لیکن برسوں کی جمی ہوئی دھول صاف نہ ہوئی۔ پھر وہ ذرا زور سے کھنکارے اور دوبارہ سر چھیڑا مگر لوگوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ان کے گلے سے گانے کی بجائے رونے سے مشابہ آواز برآمد ہو رہی تھی۔

***

تیسرا شخص

دفتر کی سیڑھیوں کے چوالیس زینوں میں سے کم از کم بائیس پر پاؤں رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ اس کا جی چاہتا تھا وہ ایک ہی جست میں ساری سیڑھیاں پھلانگ جائے۔ اس کا تو یہ بھی جی چاہا تھا کہ آج اسے بس کا انتظار نہ کرنا پڑے کوئی موٹر سوار لفٹ دے دے اور وہ پلک جھپکنے سے پہلے گھر پہنچ جائے اور اپنی بیوی کو خوشخبری سنائے کہ کئی سالوں کے بقایا جات کا فائل ایک ایک کر کے سارے زینے عبور کر گیا ہے اور اب آخری منزل یعنی جنرل منیجر کے میز تک پہنچ گیا ہے۔

چار سال کے عرصے میں وہ لاکھوں زینے چڑھا تھا مگر فائل سیکشن انچارج سے جنرل منیجر تک سات زینے نہ چڑھ سکا تھا۔۔۔ ہاں پچھلے سال۔۔۔ کئی سالوں کے بعد فائل چھٹے زینے یعنی اسٹنٹ منیجر تک رسائی حاصل کر سکا تھا پھر ایسا پھسلا کہ پورے ایک برس تک چلنے پھرنے سے معذور رہا۔۔۔ اس نے ان چار سالوں میں اپنے اس جائز حق کے لئے کیا کی اجتن نہیں کئے تھے۔۔۔ سفارشیں رشوتیں۔۔۔ منتیں۔

لیکن خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں اس کے بقایا جات کی منظوری کا فائل سارے زینے طے کر کے منزل پر پہنچ ہی گئے۔ اب اس کے سارتے دکھ درد دور ہو جائیں گا۔ اس عید پر وہ اپنے لئے نئے کپڑے سلوائے گا۔ دوستوں سے کیا ہوا مٹھائی کھلانے اور فلم دکھانے کا وعدہ بھی نبھائے گا پھر بھی اس کے پاس کچھ نہ کچھ رقم بچ جائے گی وہ بینک میں سیونگ اکاؤنٹ کھول لے گا انسان کو کڑے وقت کے لئے کجھ نہ کچھ بچا کر ضرور رکھنا چاہئے۔

مین گیٹ کے قریب اسے ایک دوست مل گیا جس نے اسے مبارک باد دی۔ اس نے جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اس کا منہ موتیوں سے بھر دے مگر اس کی کی پھٹی پرانی پتلون کی جیب میں صرف چالیس پیسے تھے۔

دوست سے رخصت ہو کر وہ بس سٹا پ کی طرف چل دیا۔ اسے گھر پہنچنے کی بڑی جلدی تھی اگر جان پہچان کے لوگ نہ ہوتے تو وہ بھاگنے لگتا۔

بس سٹاپ پر بڑی تیز دھوپ تھی۔ جھلسا دینے والی لو چل رہی تھی وہ سوچنے لگا اگر اسلام آباد میں اس شدت کی گرمی تھی ت نہ جانے بے چارے لاہور، خانیوال اور ملتان کے لوگوں کا کیا حال ہو گا؟

بس سٹاپ پر کھڑے کھڑے اس نے مارگلہ کی پہاڑیوں پر بادل کے بڑے بڑے ٹکڑے دیکھے جو شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف رواں تھے--- نہ جانے بادل کے یہ ٹکڑے کب یہاں پہنچیں گے---؟ اس نے بس سٹاپ پر نوجوان طلباء طالبات اور دفتر کے لوگوں کو دھوپ میں جھلستے دیکھا تو اس کا جی چاہا خود بادل کا بڑا سا ٹکڑا بن جائے اور ان سب پر سایہ کر دے۔

اسی لمحے ڈبل ڈیکر آ گئی۔ گرمی اور پیاس کے ستائے ہوئے لوگ بس پر ٹوٹ پڑے لیکن وہ خلاف معمول پر سکون کھڑا رہا۔ وہ عموماً مستورات والے دروازے سے سوار ہو جاتا تھا۔ اور لڑ جھگڑ کر کسی نہ کسی طرح سیٹ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا اور اگرچہ آج اسے کہیں زیادہ جلدی تھی مگر اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو اسے روک رہی ہے۔

بس چلی گئی تو وہ دوسری بس اور بادل کے ٹکڑے کا انتظار کرنے لگا۔ بس سٹاپ پر پھر رش ہو گیا ا تھا۔ اسے برقعہ پوش خواتین پر بڑا ترس آیا جو گرمی سے بے حال ہو رہی تھیں۔ اس نے پھر بادل کے ٹکڑے کا جائزہ لیا۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا بس سٹاپ کے قریب آ گیا تھا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی طمانیت حاصل ہوئی کہ ابھی ابھی بادل کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا سورج اور بس سٹاپ کے درمیان آ جائے گا۔ اور چند لمحوں کے لئے دھوپ اور گرمی کی شدت کم ہو جائے گی۔

کھڑے کھڑے اس کی نظر اپنے دفتر کی عمارت پر پڑی کل تک یہ عمارت بوسیدہ اور بد وضع معلوم ہوتی تھی شاید اس وجہ سے کہ باہر کی دیواروں پر رنگ و روغن کی چمک ماند پڑ گئی تھی مگر آج اسے خیال آ رہا تھا کہ جس طرح جوانی ڈھلنے اور کنپٹیوں کے بال سفید ہو جانے پر آدمی مدبر اور معزز معلوم ہونے لگتا ہے اسی طرح رنگ و روغن کی چمک ماند پڑ جانے پر دفتر کی عمارت زیادہ پر شکوہ اور عظیم معلوم ہونے لگی ہے۔

دفتر کی عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی نظریں زینہ پر رک گئیں۔ گیارہ زینے فی منزل کے حساب سے وہ ہر روز چوالیس زینے چڑھتا اور اترتا تھا اسے اس دفتر میں کام کرتے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ اس حساب سے اس نے اب تک نہ جانے کتنے لاکھ زینے عبور کئے تھے اگر یہ سب زینے ایک ہی سمت اور بلندی کی طرف جاتے تو۔؟ چاند اور ستاروں کا خیال آتے ہی وہ مسکرا دیا پھر اسے جنرل منیجر نے دستخط کرنے کے لئے قلم اٹھایا مگر اس نے اپنے فائل کی طرف بڑھا ہوا جنرل منیجر کا ہاتھ روک دیا۔ اگر اتنی جلدی دستخط ہو گئے تو خاک مزا ائے گا! اور پھر ابھی نہی جانے بس کب آئے اور اب تو بادل کے ٹکڑے نے آ کر بس سٹاپ پر چند لمحوں کے لئے سایہ بھی تو کر دیا ہے۔

اس نے جنرل منیجر کے ہاتھ سے گھنٹی کا بٹن دبا کر چپڑاسی کو بلایا اور اسے چائے لانے کا حکم دیا۔ جنرل منیجر صاحب تھکے ہوئے تھے۔ کرسی کی پشت پر گردن رکھ کر اور آنکھیں موند کر آرام کرنے لگے--- ایک بار اسے خیال آیا کہ وہ

انہیں جگا دے اپنے کاغذات پر منظوری کے دستخط کر والے، مگر جنرل منیجر پر اسے بڑا پیار آیا، بے چارے تھک گئے تھے اور پھر ابھی نہ جانے بس کب آئے، دستخطوں کا کیا ہے وہ تو لمحہ بھر میں ہو جائیں گے۔ اس نے سوچا کیوں نہ چائے آنے اور دستخط ہونے تک وہ اپنی ضرورتوں کا جائزہ لے لے۔

سب سے پہلے اس نے قرض ادا کیا۔

پھر نئے کپڑے خریدے۔

گھر کی بہت سی چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔

دو تین مہینے کے لئے راشن خرید کر رکھ لیا۔

اب بھی اس کے پاس کافی رقم تھی۔ اس نے بیوی کو چار سو روپے زیور کے لئے دینے کا وعدہ کیا تھا مگر اب سونا مہنگا ہو گیا تھا۔ اس نے چار سو روپے بیوی کے ہاتھ پر رکھ کر دیکھے۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کی خوبصورت میں خلوص و محبت کی چمک بڑھ گئی تھی وہ دیر تک اس چمک سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا مگر ای لمحے بس آ گئی۔

لوگ بس پر ٹوٹ پڑے مگر وہ بت بنا کھڑا رہا۔ بس بھر گئی اور چلنے لگی تو اس نے دیکھا اس کے لٹکنے کے لئے پائیدان پر تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ وہ بھاگ کر پائیدان پر کھڑا ہو گیا۔

اگلے بس سٹاپ پر جب کنڈیکٹر اس کے قریب آیا اس نے حسب معمول دس پیسے کا سکہ جیب سے نکالا لیکن اچانک اس کے اندر کسی نے سرگوشی کی۔ وہ کچھ صاف نہ سن سکا مگر اسے احساس ہو گیا کہ اس کے اور کنڈیکٹر کے علاوہ ایک تیسرا شخص بھی دیکھ رہا ہے۔ اس نے چوبیس پیسے اور نکالے۔ ایک عرصہ بعد ٹکٹ کے پورے پیسے دیتے اور ٹکٹ لیتے ہوئے اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ مگر وہ آج مطمئن اور خوش تھا۔

***

تھوہر کا کانٹا

میں، ماموں جان اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں

میں، میں ہوں جس کے باپ نے خود کشی کر لی تھی یا شاید اُسے زہر دے دیا گیا تھا (بعض لوگوں کا یہی خیال ہے)

اور ماموں جان۔۔ اگرچہ میرے ماموں جان ہیں لیکن وہ میری اس ماں کے سگے یا سوتیلے بھائی نہیں ہیں جس نے حلالہ کرنے کے لئے مولوی عبدالصمد سے نکاح کر لیا اور پھر انہی کے پاس رہنے لگی۔ اس کا کہنا ہے کہ جب وہ طلاق لینا نہیں چاہتی تھی اُسے طلاق مل گئی اور جب وہ طلاق لینا چاہتی ہے تو اُس طلاق نہیں مل رہی۔مگر لوگوں کا خیال ہے کہ میرا باپ جس نے اسے طلاق دی تھی کمزور ار بیمار شخص تھا لوگ تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں ان خیال ہے کہ میرا باپ مرتے دم تک یہی کہتا رہا کہ طلاق نہیں ہوئی تھی اور وہ کفارہ ادا کر کے رجوع کر سکتا تھا۔ماں بھی یہی کہتی تھی مگر کچھ لوگوں نے گواہی دی کہ انہوں نے طلاق کے الفاظ تین بار سُنے تھے بعض دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ گواہی دینے والوں میں سے کوئی بھی موقع پر موجود نہ تھا۔

مجھے اپنی ماں سے شدید نفرت ہے اور اپنے باپ سے بھی۔ اس نے میری ماں کو اس وقت طلاق دی جب میں اس کے بطن میں تھا اس طرح اس نے مجھے بھی طلاق دے دی تھی۔ اگر ماموں جان کا سہارا نہ ہوتا تو میں پرورش نہ پا سکتا۔ ماموں جان نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں نے ابھی ہوش نہیں سنبھالا تھا۔وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس گھر میں اُٹھ آئے جہاں طلاق سے پہلے میرا باپ اور میری ماں ہنسی خوشی رہتے تھے اور جہاں انہوں نے میری داغ بیل ڈالی تھی۔

ماموں جان کے علاوہ ایک تیسرا شخص (اسے شخص کہنا گناہ ہے) بھی ہمارے ساتھ رہتا ہے اور صاف رہتا ہی نہیں مجھے پریشان بھی کرتا رہتا ہے۔ اگر ماموں جاں کا سایہ سر پر نہ ہوتا تو وہ مجھے تباہ کر دیتا کیونکہ وہ۔۔۔ وہی ہے جس نے میرے باپ کے منہ سے طلاق کے الفاظ نکلوائے جس نے میری ماں سے میرے باپ کو زہر دلوایا اور جس نے میرے باپ کے باپ کو جنت سے نکلوایا تھا۔

وہ اعتراف نہیں کرتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ماموں جا ن سے بے حد ڈرتا ہے لیکن مجھے ناسمجھ جان کر ہر وقت دق کرتا رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے ماموں جان کی تربیت کی وجہ سے میں اسے خوب پہچانتا ہوں اور اس کی باتوں میں نہیں آتا لیکن کئی

طرح کی دعائیں مانگنے اور وظائف کرنے کے باوجود وہ ہمارے گھر کو چھوڑ کر نہیں جاتا۔ جب ماموں جان گھر پر ہوں تو وہ میرے اندر اور بھی دبک کر بیٹھ جاتا ہے میں ہمہ وقت اس پر لعنت بھیجتا رہتا ہوں اور اللہ سے اس کی پناہ مانگتا ہوں لیکن وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور میری عبادتوں اور ریاضتوں میں خلل ڈالتا ہے وہ مجھے نہایت دلکش اور بظاہر مضبوط دلیلوں سے قائل کر کے اپنی راہ پر لگانا چاہتا ہے اور تو اور اس نے مجھے ماموں جان کے خلاف بھڑکانے اور ان کے لئے میرے دل میں شک ڈالنے کی بھی بہت کوشش کی ہے۔ کہتا ہے کہ انہوں نے خدانخواستہ میری زمینوں اور جائداد کی وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر میری سرپرستی قبول کی ہے اور وہ اس پر اسی طرح قابض رہیں گے مگر میں ماموں کو بہت قریب سے جانتا ہوں وہ نہایت نیک اور اللہ سے ڈرنے والے شخص ہیں انہوں نے میری خاطر اتنی بڑی قربانی دی ہے اور اپنے گھر بار سے دور رہ کر اتنے عرصہ سے میری پرورش اور تربیت کر رہے ہیں خدا کا شکر ہے کہ ان کی وجہ سے میرا ایمان پختہ ہے ورنہ اس مردود نے تو کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی تاہم میں اس سے خوفزدہ رہتا ہوں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

کبھی کبھی ماموں جان بتائی ہوئی دعاؤں اور وظیفوں کے طفیل وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلا بھی جاتا ہے مگر پھر دعاؤں اور وظائف کا اثر کم ہوتے ہی کسی نازک موقع پر دوبارہ آ دھمکتا ہے اور میرے دل و دماغ میں اپنی شر انگیزیاں شروع کر دیتا ہے۔ میں اس سے بحث و تکرار نہیں کرنا چاہتا اکثر اکی باتوں کا جواب نہیں دیتا چپ چاپ اپنی اس راہ پر جو مستقیم ہے اور ان کی راہ ہے جن پر اللہ نے اپنی رحمتیں اور نوازشیں کیں چلتا رہتا ہوں مگر وہ اپنی ناپاک کاروائیاں جاری رکھتا ہے اور کئی کئی روز تک میرے دل کے تالاب میں گمراہی کی مچھلی پکڑنے کے لئے کانٹا ڈالے بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی جب میں اس سے زیادہ عاجز آ جاتا ہوں تو ماموں جان سے شکایت کرتا ہوں وہ کچھ پڑھ کر پھونکتے ہیں تو وہ میرا اندر ہی نہیں گھر بھی خالی کر کے چلا جاتا ہے مگر جونہی میں اکیلا ہوتا ہوں وہ کہیں نہ کہیں سے آ دھمکتا ہے اور مجھے تنگ کرنے لگتا ہے میں کہتا ہوں

’’میں پناہ مانگتا ہون اللہ کے شیطان مردود سے‘‘

’’وہ قہقہہ لگاتا اور بڑی ڈھٹائی سے کہتا ہے

’’تمہاری دعا قبول نہیں ہو سکتی ‘‘

’’کیوں نہیں ہو سکتی‘‘

’’اس لئے کہ میں تمہارے اندر موجود ہوں ‘‘

’’تم دفعان کیوں نہیں ہو جاتے؟‘‘

’’اس لئے کہ تم نے خود مجھے اپنے اندر پناہ دے رکھی ہے‘‘

’’میں نے تمہیں پناہ نہیں دی۔ تم زبردستی میرے اندر گھُس بیٹھتے ہو۔۔ دفعان ہو جاؤ۔۔۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں مردود‘‘

’’تم مجھے رّد نہیں کر سکتے‘‘

’’کیوں نہیں کر سکتا؟‘‘

’’اس لئے کہ تم خود طلاق یافتہ ہو۔تمہیں باپ نے پیدا ہونے سے پہلے عاق کر دیا تھا‘‘

’’میں اپنے باپ کی جائز اولاد۔۔۔ اس کا وارث ہوں ‘‘

’’تمہارے باپ کو تمہارے جائز ہونے میں شبہ تھا اسی لئے اس نے تمہاری ماں کو طلاق دی۔ اسی لئے اس نے تمہیں کالعدم قرار دے دیا تھا‘‘

’’میں کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ میں ہوں ‘‘

’’تم نہیں ہو اس لئے کہ تم کالعدم قرار دئیے جا چکے ہو‘‘

’’لاحول ولا‘‘

’’ہا ہا ہا‘‘

’’ماموں جان۔۔۔ ماموں جان‘‘ میں مدد کے لئے پکارتا ہوں

’’تمہارے ماموں جان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے‘‘

’’اگر ایسا ہے تو ان کے قریب پھٹک کر دیکھو‘‘

وہ ہنستا ہے۔۔۔ ہنستا چلا جاتا ہے پھر کہتا ہے

’’بیوقوف۔۔۔ میں ان کے اندر بھی موجود ہوں ‘‘

’’یہ جھوٹ ہے‘‘

’’میں ہر کسی کے اندر موجود ہوں ‘‘

’’بکواس بند کرو‘‘

’’میں بکواس کرتا رہوں گا اور تم سنتے رہو گے۔ تم اگر سماعت سے محروم ہو جاؤ تب بھی تمہیں میری آواز سنائی دیتی رہے گی۔‘‘

’’تم واقعی مردود ہو۔۔۔ لعین ہو‘‘

اگر اس دوران ماموں جان آ جائیں تو وہ اچانک غائب ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات ماموں جان کی موجودگی میں بھی آ دھمکتا ہے اور گفتگو کے دوران مجھے لقمے دے کر بھڑ کاتا رہتا ہے۔ میرے ذہن میں عجیب و غریب سوالات اُٹھاتا اور ان کے اُلٹے سیدھے جوابات سجھاتا ہے میں اس سے مکمل نجات چاہتا ہوں۔ ماموں جان سے کئی بار تقاضا کر چکا ہوں کہ وہ مجھے کوئی وظیفہ بتائیں جس کے پڑھنے میں اُس سے ہمیشہ کے لئے گلو خلاصی حاصل کر سکوں مگر وہ کہتے ہیں کہ اس کے لئے وظیفوں کے علاوہ قوت مدافعت پید ا کرنا ضروری ہے اور شاید میری قوت مدافعت کا امتحان لینے کے لئے ہی انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو اپنے پاس بلا لیا ہے ان کی بڑی بیٹی قوتِمدافعت کا بہتر ین امتحان ہے ماموں اور ممانی کی خواہش ہے کہ میں اس سے عقد کر لوں لیکن مجھے عورت کے وجود سے نفرت ہے وہ شیطان کے بہکاوے میں آسانی سے آ جاتی ہے اس نے ہمیں جنت سے محروم کیا اس نے میرے باپ کو زہر دیا اور حلالہ کرنے کے بہانے مولوی عبدالصمد سے نکاح کر کے انہی کے پاس رہنے لگی اسی کے گناہوں کی پاداش میں ہو۔۔۔ مجھ سے چمٹا رہتا ہے۔

ایک روز میں نے ماموں جان سے اپنے خیالات کا اظہار کی اور کہا

’’عرب کے قدیم لوگ ٹھیک ہی کرتے تھے لڑکیوں کو پید ا ہوتے ہی زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے۔‘‘

ٌٌ؎؎کیا بکتے ہو‘‘ انہوں نے ڈانٹ کر کہا ’’یہ درست ہے کہ عورت نے نیک بندوں کو جنم دینا کم کر دیا ہے اور معاشرہ برے اور بدکار لوگوں سے بھر گیا ہے لیکن بد قسمتی سے اکیلا مرد خواہ وہ کتنا ہی صالح کیوں نہ ہو ایک بچہ پید ا کرنے سے قاصر ہے اگر عورت کے وجود کو ختم کر دیا گیا تو زمین اللہ کے بندوں سے بالکل خالی ہو جائے گی۔

’’مگر گناہ سے تو پاک ہو جائے گی‘‘

’’لا حول ولا‘‘ وہ خفا ہو کر بولے ’’تمہاری سوچ شیطانی ہے‘‘

تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں خود نہیں بول رہا مجھ پر کوئی دوسرا اثر انداز ہو رہا ہے میں نے لا حول پڑھی اور ماموں جان سے معافی چاہی مگر عورت کے بارے میں میرے دل میں جو نفرت ہے وہ کبھی کم نہ ہوئی بلکہ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ جب تک انسان دنیا میں ہے اس کا سامنا گناہ اور گناہ کی ترغیب دینے والی اشیاء سے ہوتا رہے گا اور وہ اس کا ارتکاب کرتا رہا گا کیوں نہ سِرے سے انسان ہی کا خاتمہ کر دیا جائی۔

’’یہی میں نے اللہ میاں سے کہا تھا‘‘ وہ لقمہ دیتا ہے ’’جس پر وہ بگڑ گئے‘‘

’’ماموں جان سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں تو وہ خفا ہو کر کہتے ہیں

’’لا حول ولاقوۃ۔۔۔ تم پھر بہک جاتے ہو‘‘

’’میں خود نہیں بہکتا مجھے بہکا دیا جاتا ہے‘‘ میں اعتراف کرتا ہوں۔ ماموں جان کچھ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور میں اس کی چنگل سے نکل جاتا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعض موقعوں پر جب اُسے موجود ہونا چاہئے وہ سِرے سے کہیں غائب ہو جاتا ہے مثلاً جب ماموں اور ممانی کہیں چلے جاتے ہیں اور ان کی بڑی بیٹی میرے پاس گھر میں اکیلی رہ جاتی ہے اور مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے یا جب کبھی وہ رات کو بھول کر مجھ سے ٹکرا جاتی ہے۔

چند روز ہوئے وہ دروازہ بند کئے بغیر میرے غسل خانے میں نہا رہی تھی مجھے معلوم نہیں تھا میں حسب معمولی تولیہ لے کر غسل خانے میں داخل ہوا تو میرے اوسان خطا ہو گئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھ سے کوئی خطا نہیں ہوئی میں اُلٹے پاؤں باہر آ گیا اور اپنی مضبوط قوتِمد افعت پر خود کو داد دیتا رہا وہ مجھے ایسی چھوٹی چھوٹی رعائتیں دیتا رہتا ہے لیکن مضبوط قوتِمدافعت کے باوجود مستقل طور پر میرا پیچھا نہیں چھوڑتا، ہاں پرسوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔

میں گھر میں اکیلا تھا وہ سب لوگ کہیں گئے ہوئے تھے کہ وہ میرے اندر سے نکل کر اور متشکل ہو سامنے آ گیا۔ ا س نے ایک ادھیڑ عمر کی مگر خوبصورت عورت کا روپ اختیار کر رکھا تھا، میں نے پہلی نظر میں اسے کوئی بھکارن جانا اور اسے کچھ دینا چاہتا مگر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی

’’تو کب بالغ ہو گے؟‘‘

’’کیا تم مجھے نابالغ سمجھتی ہو‘‘ میں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا‘‘ اور اگر میں بالغ ہو جاؤں تو تمہیں اس سے کیا؟،

کہنے لگی

’’میں تمہاری ماں ہوں ‘‘

’’تم۔۔۔ تم۔۔۔؟‘‘ میں غصے اور نفرت سے کھول اُٹھا اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

’’ہاں۔۔۔ میں تمہاری ماں۔ ایک ظالم اور شیطان شخص نے میرے اور تمہارے باپ کے درمیان غلط فہمی اور نفرت کا بیج بویا، پھر سازش کے تحت تیسرے شخص کے عقد میں دے دیا اور تمہارے باپ کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالا۔ اب مجھے تمہاری زندگی خطرے میں نظر آتی ہے۔ تم خود کو اور اسے پہچانو۔‘‘

خدا کا شکر ہے کہ میری پرورش ماموں جیسے نیک آدمی کے ہاتھوں ہوئی ہے ورنہ وہ مجھے میری ماں کے روپ میں ورغلانے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں نے اس پر لاحول پڑھی اور دھکے دے کر گھر سے نکال دیا اور آج تیسرا روز ہے کہ وہ پلٹ کر نہیں آیا لیکن جاتے جاتے کم بخت میرے ذہن میں شک کے تھوہر کا کانٹا سا بو گیا ہے۔

***

ٹائم از اوور

کیا کہا کتنے برس؟

برس نہیں دن ہوں گے !

آپ کو غلطی لگی ہے سر!!

ابھی ابھی تو میں پنگھوڑے میں لیٹا منہ سے بوتل لگائے بڑے مزے سے دودھ پی رہا تھا۔

اور وہ عورت جس کے بطن سے میں نے جنم لیا ابھی ابھی یہاں تھی۔

آپ میری بات پر یقین کیجئے۔ میں بالکل سچ کہتا ہوں۔ میں نے ابھی چند روز ہوئے زندگی کی ابتداء کی ہے یقیناً آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ مہربانی کر کے ذرا پڑتال کر لیجئے۔ وقت کے سلسلے میں ہمیشہ مجھ سے نا انصافی ہوتی رہی ہے۔مجھے یاد ہے ایک بار میں امتحان کا پرچہ دے رہا تھا اور ابھی میں نے اپنا رول نمبر ہی لکھا تھا کہ ممتحن کی گرجدار آواز سنائی دی۔

''ہاف دی ٹائم از اوور۔''

اس کے بعد مارے گھبراہٹ کے میں کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اب پھر!!

غالباً آپ نے وہ سب ماہ و سال بھی میرے کھاتے میں ڈال دئیے ہیں جنہیں میں نے خود نہیں گزارا بلکہ وہ مجھے روندتے اور کچلتے ہوئے گزرے ہیں لیکن آپ کو دیکھنا ہو گا کہ ان میں کتنے شب و روز میرے حصے میں آئے اور کتنے ایسے تھے جنہیں میں نے خود کو کرائے پر چڑھا کر بسر کیا۔

جناب عالی! جن شب و روز نے مجھے زندگی میں کوئی لذت یا خوشی نہیں دی انہیں میرے کھاتے میں ڈالنا ہرگز درست نہیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ سب شب و روز جو ایک جیسے تھے اور ان گنت تھے انہیں ایک ہی شمار کیا جائے اور ان سب

برسوں کو بھی میری عمر کے اکاؤنٹ میں شمار نہ کیا جائے جو میں نے لوگوں اور چیزوں کے نام یاد کرنے میں صرف کئے۔ یہ چیونٹی ہے۔ وہ بادل ہے یہ پنکھا ہے وہ تختی ہے۔ پھر مجھے الف سے انار اور ب سے بکری رٹنے پر لگا دیا گیا۔ حالانکہ جب انار اور بکری موجود تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ انار کو بکری اور بکری کو انار کہا جا سکتا لیکن میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی ساری چیزوں کے نام رکھ دئیے گئے تھے اور میرے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ میں ان ناموں اور اصولوں کو ازبر کروں اور ان سے سر مو ادھر ادھر نہ ہوں۔

انار اور بکری کے بعد بھی برسوں مجھے لوگوں اور چیزوں کے نام یاد کرنا پڑتے اور میرے قیمتی دن، مہینے اور سال بکریوں، گھوڑوں، تختیوں اور بادلوں کی نذر ہو گئے۔ اسی طرح ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے سب کی شکلیں ایک جیسی تھیں بہت تھوڑا تھوڑا فرق تھا اور بظاہر یہی لگتا تھا کہ ایک ہی آدمی بھیس بدل کر ہر جگہ گھومتا پھرتا ہے۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ ایک جتنے قد و قامت کے باوجود بعض چھوٹے اور بعض بڑے تھے اور ان کے الگ الگ نام،ذاتیں اور فرقے تھے اور مجھے ذاتوں،فرقوں اور چھوٹے بڑے کے فرق کے ساتھ یہ سب نام یاد کرنا پڑے۔نہ صرف نام بلکہ ناموں کے ہجے، ہجوں کی مخصوص شکلیں اور آوازیں۔ زیریں،زبریں، پیشیں !!

مجھے نہایت افسوس ہے میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔

میرے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی گئی ہے یہاں تک کہ میرے پیدا ہونے میں بھی میرا عندیہ معلوم نہیں کیا گیا۔سارے فیصلے مجھ پر ہمیشہ ٹھونسے گئے ورنہ اگر میری اپنی پسند اور میری مرضی کو دخل ہوتا تو میں خود فیصلہ کرتا کہ میں کس صدی ملک اور شہر میں اور کن لوگوں کے درمیان پیدا ہونا چاہتا ہوں لیکن والدین کے انتخاب سے لے کر رنگ، نسل عقیدے اور نام تک کے انتخاب میں میرا اپنا کوئی چوائس نہ تھا۔ میرا قد بت،ناک نقشہ اور آواز جس کی وجہ سے بعد میں کئی طرح کی پیچیدگیاں اور مشکلیں پیدا ہوئیں مجھے وراثت میں ملے۔اس میں میری مرضی اور پسند بالکل شامل نہیں تھی۔میں جس گھر میں پیدا ہوا اس سے بہتر اور روشن گھر اور بھی موجود تھے۔ میرے والدین سے بہتر لوگ میرے والدین ہو سکتے تھے۔ اگر میں منہ میں سونے یا چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوتا تو مجھے بہت سے کام کئے کرائے مل جاتے اور میرا بہت سا وقت بچ جاتا لیکن مجھے رشتہ دار بھی بنے بنائے ملے۔یہ باہر سے اجلا اندر سے کالا آدمی میرا ماموں ہے۔یہ حاسد اور حریص شخص میرا چچا ہے۔ یہ بد زبان عورت میری پھوپھی ہے، یہ خواجہ سگ پرست کے بھائیوں جیسا آدمی میرا بھائی ہے اور یہ لوند مسودا خصم خدائی عورت میری خالہ ہے۔ ان سب کا کام میرے راستے میں روڑے اٹکانا، میری کامیابیوں پر حسد کرنا اور ناکامیوں پر بغلیں بجانا تھا۔ میں زندگی بھر نیکیوں کی گٹھڑیاں اٹھائے ہر ایک دروازے پر دستکیں دیتا رہا مگر مجھے نفرت اور حسد کے سوا کچھ نہ ملا۔

مجھے اپنے محدود اور مخصوص ماحول سے دوستوں کا انتخاب کرنا پڑا۔ میں انہیں باری باری سالہا سال تک آزماتا رہا اور ناکامی کا منہ دیکھتا رہا۔ وہ مصیبت کے وقت

کام آنے کے لئے مجھے ہر خوشی سے محروم رکھنے اور اپنے احسانات کے بوجھ سے کچلنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے زندگی کا بہت سا حصہ انہیں آزمانے پر صرف کر دیا، آخر اتنے بڑے نقصان کی کچھ تو تلافی ہونی چاہیے۔

ماحول کے انتخاب میں بھی میری پسند شامل نہیں تھی۔ میں جس گلی میں چلتا وہ آگے جا کر بند ہو جاتی۔ سارے راستے گھوم پھر کر واپس آ جاتے۔میں نے اپنے ماحول کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اتنا تنگ اور سخت تھا کہ میں بار بار اس کی خلاف ورزی کے جرم میں پکڑا جاتا اور تنہائی کے زنداں میں ڈال دیا جاتا۔ ادھر میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی ساری اچھی اور خوبصورت چیزوں پر لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مجھے جو چیز بھی پسند آتی اس پر پہلے سے کسی اور کے نام کی مہر لگی ہوتی۔ میں جس سکول میں پڑھنا چاہتا تھا اس میں مجھے داخلہ نہ ملا۔ میں جو پیشہ اختیار کرنا چاہتا تھا اس میں میرے لئے گنجائش نہ نکلی۔ میں جو چیز ایجاد کرنا چاہتا تھا وہ لوگوں نے میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ایجاد کر لی تھی۔ میں جو کچھ سوچتا،وہ کہیں نہ کہیں پہلے سے سوچا جا چکا ہوتا۔ یہاں تک کہ مجھے جو لڑکی پسند آئی وہ بھی وہ نہ تھی،جسے دیکھ کر مجھے اپنے پیدا ہونے والے بچوں کی صورتیں نظر آنے اور قلقاریاں سنائی دینے لگتی تھیں۔ ہم ایئر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے خوبصورت کیبن میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں سامنے رکھے گھنٹوں باتیں کرتے۔ وہ بہت کم کھاتی تھی۔ میرا جی چاہتا کہ وہ میری منگائی ہوئی ساری چیزیں چٹ کر جائے میرا تو یہ بھی جی چاہتا میں خود چائے کی پیالی میں حل ہو کر گھونٹ گھونٹ اس کے حلق سے اتر جاؤں۔ سات برس بعد ایک روز کہنے لگی:

''آپ بہت اچھے ہیں بالکل امجد کی طرح پر لطف باتیں کرتے ہیں۔وہ اگلے ماہ امریکہ سے ہمیشہ کے لئے لوٹ رہا ہے۔ آپ ہماری شادی پر آئیں گے نا۔''

میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی شادی امجد سے اور میری اس کی بجائے عذرا سے ہو گئی اور اس کے بچے مجھے ماموں ماموں کہہ کر پکارنے لگے۔ تاہم میرا خیال تھا میں نے عذرا سے شادی کر کے ایک ہی چھلانگ میں اپنے بہت سے مسائل حل کر لئے ہیں اور واقعی میرے بہت سے مسائل حل ہو بھی ہو گئے لیکن ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا کیوں عذرا! تم اپنا بیان بھی نہیں دو گی؟

''کیوں نہیں ڈارلنگ !میں تم سے شرمندہ ہوں۔ کاش میں تمہیں وہ سارے برس لوٹا سکتی جو تم نے میری حراست میں گزارے لیکن یقین کرو ڈیئر میں بے حد مجبور تھی۔ تم اتنے اچھے تھے کہ مجھے ہر وقت تمہارے چوری ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں خوشبوؤں میں بسی زیور تعلیم کی بجائے سونے کے زیورات سے لدی پھندی اور لاکھوں کے جہیز میں لپٹی لپٹائی تمہاری بانہوں میں آئی تھی تو تم کتنے خوش تھے تم نے اس رات راشدہ کی ساری فاحشہ یادوں کو کمرے سے باہر نکال دیا تھا اور ایک بار بھی باہر جھانک کر نہیں دیکھا تھا لیکن شک کی چیونٹیاں میرے بدن پر برابر کاٹتی رہیں جس روز دیگیں چڑھیں اور قورمے اور بریانی کی اشتہا انگیز مہک ننگے بدن گلیوں میں پھرنے لگی تو تم نہایت مسرور اور

مطمئن تھے کہ تمہارے ذہن سے بھاگے ہوئے تصورات، گلی گلی بھیک مانگتے اور لوگوں کی جیبیں کاٹتے آوارہ گرد بچوں کی طرح گھر لوٹ آئے تھے لیکن مجھے لگتا تھا کہ ماضی کی یادیں تمہارے چاروں طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھی رہتی ہیں اور تمہیں ایک لمحہ کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتیں۔''

''میں بے حد شرمندہ ہوں ڈارلنگ کہ شادی کے چند ہی دنوں بعد ایک ایک کر کے میرے وجود سے فالتو اور مصنوعی چھلکے اترنے لگے اور میرے اندر سے چیختی چلاتی بات بات پر روٹھتی۔ الزام تراشیاں کرتی۔ طعنے مہنے دیتی اور اپنے میکے کی امارت و ثروت کی دھونس جماتی اصلی اور خالص عذرا نکل آئی تھی۔''

''مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تمہیں بچوں کی شدید خواہش تھی لیکن میں نے تم سے چھپایا کہ شادی سے پہلے میرا ایک ایسا آپریشن ہو چکا تھا کہ اب میں ماں نہیں بن سکتی تھی۔آئی ایم سوری میں نے تمہیں کئی برس دھوکے میں رکھا۔تم نفلی نمازیں،دعائیں اور وظیفے پڑھتے،ڈاکٹروں حکیموں کا علاج اور پیروں فقیروں کے تعویذ گنڈے کرتے کراتے رہے۔ اور میں تمہیں کئی برس جھوٹی تسلیاں دیتی اور ٹالتی رہی مگر بالآخر مجھے اصل بات بتانا ہی پڑی،جس کے بعد تم اداس ہی نہیں ناراض بھی رہنے لگے اور تمہاری اداسی اور ناراضی دیکھ کر مجھے تمہارے بھاگ جانے اور چوری ہو جانے کا خوف اور زیادہ لگنے لگا تھا اور حالانکہ میں نے تمہارے گلے میں جہیز کا طوق اور پاؤں میں بھاری حق مہر کی بیڑیاں ڈال رکھی تھیں اور ایجاب و قبول کے الفاظ کی کھونٹیاں گاڑ کر تمہارے چاروں طرف اپنے وجود کا خیمہ مضبوطی سے گاڑ لیا ہوا تھا۔ پھر بھی مجھے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ تم میری حراست سے فرار نہ ہو جاؤ۔''

می لارڈ !آپ نے سنا،میں برسوں عذرا کی قید میں رہا ہوں۔ اگر اسیری کے ان برسوں کو میری عمر سے منہا نہ کیا گیا تو یہ بہت بڑی نا انصافی ہو گی۔ ہاں یہ درست ہے کہ فرار ہونے کے لئے چور راستے بھی ہوتے ہیں اور میں ہر رات عذرا کے پہلو میں اپنے جسم کی کینچلی چھوڑ کر فرار ہو جاتا لیکن میں کہیں دور نہیں جاتا تھا۔ وہ ماں بیٹا مجھے پروجیکٹر کی سلائیڈ کی طرح اپنے بیڈ روم کی دیوار پر نظر آ جاتے تھے۔

جب کبھی میں تنہا ہوتا یا عذرا محو خواب ہوتی۔ وہ عورت مجھے اپنے کم سن بچے کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑی نظر آتی۔ وہ ایک ایسا نغمہ تھی جس میں بیک وقت کیف و انبساط اور رنج و محن کے جذبات پیدا کرنے کی تاثیر تھی۔ اسے دیکھ کر میں کبھی خوشی کے ترو تازہ ٹھنڈے میٹھے پانیوں میں غوطے لگاتا کبھی اداسیوں کے لق و دق صحرا میں پیاس کے مارے ایڑیاں رگڑتا۔ کبھی کبھی میں اٹھ کر دیوار کے پاس چلا جاتا تو بچہ مجھے دیکھ کر ماں کی گود میں ہمکنے اور قلقاریاں مارنے لگتا۔ پھر جب میں بچے کو پیار کر رہا ہوتا وہ عورت پاس ہی کھڑی ہم دونوں کو مامتا اور محبت سے لبریز نظروں سے دیکھتی اور اپنی پھٹی پرانی اوڑھنی سے خوشی کے آنسو پونچھتی۔ اس کا تار تار لباس اور جسم پر جا بجا خراشوں کے نشان ویرانے کی صعوبتوں کی غمازی کرتے پھر دور سے کسی خونخوار درندے کی آواز سنائی دیتی

تو وہ خوف زدہ ہو کر مجھ سے لپٹ جاتی۔ اسی لمحے عذرا کی چیخ جیسی آواز گھر بھر میں گونجتی اور میرے ہونٹ جو ابھی ابھی محبت کے زمزم سے تر ہوتے اچانک خشک ہو جاتے اور منہ میں ریت بھر جاتی۔

اس عورت کو دیکھ کر میرا جی چاہتا کاش میں اس کے بطن سے جنم لے سکتا۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ شاید وہ عورت میری اصلی ماں تھی میں جس کے بطن سے جنم نہیں لے سکا تھا۔ اور وہ بچہ شاید میں خود تھا جو پیدا نہ ہو سکا۔آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ عذرا کی معیت میں گزارے ہوئے مہ و سال کسی طرح بھی میرے اپنے نہیں تھے اور انہیں میرے حساب میں ہرگز شمار نہیں کرنا چاہیے۔ سوائے ان چند لمحوں کے جب جب میں نے اس کے پہلو میں لیٹے لیٹے ٹیلے پر کھڑی عورت کے کم سن اور خوبصورت بچے کو پیار کیا۔

اور آپ کو اس بات کا اندازہ بھی ہو گا کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ساری اچھی جگہوں، خوبصورت آبادیوں اور برمحل شاپنگ سنٹروں کی الاٹ منٹیں ہو چکی تھیں اور لوگوں نے ہر جگہ اپنے اپنے نام کی تختیاں آویزاں کر رکھی تھیں۔ مجھے جو مکان بھی رہنے کے لئے پسند آتا وہ کسی دوسرے کی ملکیت ہوتا۔ مجھے ہمیشہ اپنی مرضی اور پسند کے خلاف کام کرنا پڑتا۔ میں ہر روز ایسے افسروں کی شکلیں دیکھتا، ان کے احکامات بجا لانے کی اذیتیں اٹھاتا جن کی صورتوں سے مجھے گھن آتی تھی-۔ میں اپنے جائز حقوق کے لئے آواز اٹھاتا تو مجھے بتایا جاتا کہ مجھے میری صلاحیتوں کے مطابق معاوضہ ملتا ہے لیکن میرے ذہن میں ہر وقت یہ سوال کلبلاتا رہتا کہ مجھے بہتر صلاحیتیں کیوں ودیعت نہیں کی گئیں۔

عالی جناب !مجھے ایسے لوگوں کے درمیان زندگی کے قیمتی دن بسر کرنا پڑے جو کسی نہ کسی چیز کے مالک بننا اور سب کچھ سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ جس کے ہاتھ جو چیز آ جاتی وہ اس پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا۔ایسے اژدر زمین کے ہر ٹکڑے پر، ہر دفتر اور ہر کارخانے میں پھنکارتے پھرتے تھے۔ دکانوں، مکانوں، ہوٹلوں، ریستورانوں، اخباروں، بسوں، کاروں، یہاں تک کہ درختوں اور ان کے سایوں پر بھی ملکیت کی مہر اور کسی نہ کسی سانپ کا پہرا تھا۔ ہوا، پانی اور روشنی پر بھی قبضہ ہو چکا تھا اور راشن مقرر ہو چکا تھا۔ شہر میں خوشیوں، آسانیوں اور زندگی کی سہولتوں کا قحط نہیں تھا لیکن سب پر ملکیت کی مہر لگی ہوئی تھی اور یہ سب ایسے لوگوں کے قبضے میں تھیں جو شاید زیادہ انسان تھے۔ غلامی، ذلت اور اذیت کے ان برسوں کو میرے حساب میں ڈالنا قطعاً قرین انصاف نہیں۔

’’دی ٹائم از اوور۔‘‘

نہیں پلیز۔ آپ کو یقیناً مغالطہ ہوا ہے ابھی تو میں نے زندگی کے پرچے کی ابتداء کی ہے۔ ابھی تو میں نے صرف چند سطریں لکھی ہیں۔ اگر آپ نے اپنے اعلان کی تصحیح نہ کی تو مارے گھبراہٹ کے میں کچھ نہ لکھ سکوں گا اور پاس مارکس بھی حاصل نہ کر سکوں گا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک بار پھر سے وقت اور پرچے کی ابتداء کی

جائے۔ ویسے بھی ٹیڑھی میڑھی اور ٹوٹی پھوٹی چندسطریں جو میں نے گھبراہٹ میں اب تک گھسیٹی ہیں۔ ان کے ہجے تک درست نہیں۔ آئی ایم ویری سوری سر، میں اب تک رف کرتا رہا ہوں، اگر مجھے ایک بار اور نئی کاپی دے دی جائے تو میں اسی پرچے کو نہایت صاف اور خوشخط لکھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا ایک اور موقع ملنا چاہیے۔ صرف ایک بار اور نئی کاپی دے دیجئے۔

صرف ایک چانس اور۔۔ پلیز!!

''دی ٹائم از اوور۔۔ ٹائم از اوور۔''

* * *

وقت سمندر

قلعہ نما عالی شان عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی میرے قدم رک جاتے ہیں۔ میں اس منظر کی تاب نہیں لا سکتا اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں مگر پھر آنکھیں کھولتا ہوں تو کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون سا وقت اور مقام ہے۔

دن ہے نہ رات۔۔

اندھیرا ہے نہ اجالا۔۔

طلوع ہے نہ غروب۔۔

موت ہے نہ حیات۔

شاید اس کے بین بین کوئی کیفیت یا سمے ہے یا اس سے ماورا۔۔

کچھ اندازہ نہیں ہو رہا کہ کون سا زمانہ ہے یوں لگتا ہے جیسے آگے پیچھے دائیں بائیں پانی ہی پانی ہے

بے رنگ بے بو اور بے ذائقہ پانی۔۔ جو گرم ہے نہ سرد اور جس کے حرکت کرنے یا رکے ہوئے ہونے کا بھی پتہ نہیں چل رہا مگر یقیناً وہ حرکت کر رہا ہو گا اور میں اس میں بہہ رہا ہوں گا۔ پانی کی سلطنت میں ڈوبنے یا بہنے کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ مگر میں نے تو کسی بھی مقام سے اس میں اپنی بے پتوار کشتی نہیں ڈالی پھر میں اس میں کب اور کیسے شامل ہو گیا اور اب پتہ نہیں کب تک بہتا چلا جاؤں۔ مسلسل بہتے چلے جانے کی ایک جیسی کیفیت کا تصور کر کے میں گھبرا جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں۔

’’کنارا کب آئے گا؟‘‘

’’یہاں کنارا نہیں ہوتا۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے بہت وسیع سمندر ہے اور کنارے پر پہنچنے کے لیے ابھی بہت دیر لگے گی۔‘‘

’’یہاں تمہارے سارے الفاظ بہت وسیع، سمندر، کنارا، پہنچنا، ابھی، بہت، اور دیر بے معنی ہیں۔‘‘

’’تو کیا ہمیں کہیں نہیں پہنچنا ہے؟‘‘

’’یہاں پہنچنا اور نہ پہنچنا برابر ہے۔‘‘

’’ اور اگر میں واپس جانا چاہوں ؟‘‘

’’یہاں آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں اوپر اور نیچے کا کوئی فرق نہیں۔ یہاں سمتیں ہیں اور نہ نشیب و فراز۔‘‘

’’پھر کیا ہے؟‘‘

’’ایک تسلسل، ایک دوام، ایک بے پایانی اور لا محدودیت۔‘‘

’’تو کیا ہم زمان و مکان سے ماورا کسی مقام پر ہیں ؟‘‘

’’مقامیت کا تصور یہاں عبث ہے۔‘‘

’’تو کیا میں ابدیت کے سمندر میں فنا ہو چکا؟‘‘

’’نہیں تم فنا نہیں ہوئے سمندر میں مل کر سمندر ہو گئے ہو۔‘‘

’’میں سمندر میں مل کر سمندر نہیں ہونا چاہتا۔ میں اپنی پہچان نہیں کھونا چاہتا۔‘‘

’’پہچان یہاں ایک بے معنی اصطلاح ہے اوس، بوند، جھاگ، لہر، موج، حباب اور قطرے کا الگ کوئی وجود نہیں ہوتا سب سمندر کی ہی مختلف صورتیں ہیں تم موج بھی ہو اور دریا بھی۔ قطرہ بھی ہو اور سمندر بھی۔‘‘

سمندر میں مل کر سمندر ہو جانے کے خیال سے مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتا ہوں مگر حد نظر تک پھیلے پانی میں باہر کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

مجھے اپنا سمندر یاد آتا ہے۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہم اس کے اتھلے پانیوں میں بے سدھ پڑے دھوپ چوستے اور ہوا پھانکتے رہتے تھے کہ لاکھوں برس بعد ایک روز سانس لینے کی امنگ پیدا ہوئی اور ہم عدم سے وجود میں آئے تھے۔ مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہم سمندر کی کوکھ سے نکل کر رینگتے ہوئے خشکی کی طرف چلے جاتے تھے لیکن سورج کی تمازت اور بے پانی کی ہوا سے ہمارا دم گھٹنے لگتا اور ہم واپس اس آغوش میں پناہ لیتے تھے۔ پھر ایک روز ہم باہر آئے تو ہمیں واپسی کا راستہ نہ ملا۔ شاید سمندر ہمیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ یا شوق مہم جوئی میں، جو ہماری گھٹی میں

پڑا تھا۔ ہم اس سے دور نکل آئے تھے۔ پھر ہم دلدلوں اور جھاڑیوں میں رہنے لگے تھے۔ ہم جھیلوں، تالابوں اور دریاؤں سے دور نہ جاتے تھے۔ اور آسمان بارش کی صورت میں سمندر انڈیلتا تو ہم خوشی سے ناچ اٹھتے تھے پھر نجانے ہم نے کیا کیا صورتیں بدلیں اور کیسی کیسی صعوبتیں اٹھائیں اور کہاں کہاں بھٹکتے پھرے۔ ہم اس سے دور چلے جاتے تھے لیکن اس نے ہمیں کبھی فراموش نہیں کیا۔ وہ ہر جگہ اپنی پانی سے لدی ہوائیں ہمارے لیے بھیجتا رہا۔ میدانوں، پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں میں ہم جہاں بھی گئے اس نے اپنے قیمتی تحفوں کا سلسلہ جاری رکھا اور ہماری سرپرستی کرتا رہا۔ ہمارے لیے زمین سے اناج اور سبزہ اگاتا اور درختوں کی پور پور میں نمی پہنچاتا رہا۔

مجھے یاد آتا ہے۔

میں جب کبھی اداس ہوتا اپنے اندر سے نکل کر اس کے کنارے جا بیٹھتا اور ساحل کی طرف آتی موجوں اور نظروں سے اوجھل ہوتی کشتیوں کو دیکھتا رہتا تھاپانی مجھے ہمیشہ مسحور کرتا رہا ہے اسے دیکھتے رہنے سے میری اداسی دھلنے لگتی تھی۔ اس کی عظمت اور وسعت کا تصور مجھے تقویت دیتا۔۔ وہ عظیم اور مہربان تھا۔ سینکڑوں دریا دن رات اس کے اندر منہ ڈالے اپنی طغیانیاں اگلتے رہتے تھے مگر وہ چھلکتا نہیں تھا۔ ہر خطے ہر رنگ اور ہر نسل کے پانی اس میں مل کر ایک ہو جاتے تھے۔ وہ تین چوتھائی زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کا آبی خون بادلوں، دریاؤں اور ندی نالوں کے ذریعے زمین کے سارے بدن میں گردش کرتا تھا۔ وہ ہر جگہ اور ہر مقام پر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ اور اپنے قوانین کی سختی سے پابندی کر کے ہمارے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کرتا تھا۔ ہم جہاں جاتے اس کی سطح سے بلندی کا حساب رکھتے اس کی قربت میں ڈھارس بندھتی اور نیا ولولہ پیدا ہوتا اور اس کے لمس سے مامتا کا احساس ہوتا تھا مگر یہ کیسا سمندر ہے؟

جس کا کوئی اور چھور نہیں۔

جس کا کوئی کنارا ہے نہ ساحل۔

جس کی کوئی سطح ہے نہ تہہ۔

بس ایک ہولناک خاموشی سے بہتا چلا جاتا ہے۔۔ اس کی بے پایانی دیکھ کر فنا کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں اس میں بہتے چلے جانے کی کیفیت کبھی ختم بھی ہوتی ہے یا نہیں ۔۔ میں ہیبت کے پانیوں میں ڈوبے ڈوبے پوچھتا ہوں۔

’’ہم کب تک۔۔ کتنے سال، کتنی صدیاں یونہی بہتے رہیں گے؟‘‘

’’صدیاں سال، دن اور لمحے یہ سب الفاظ اضافی ہیں ۔۔ ہونا نہ ہونا یہاں ایک ہے۔‘‘

’’پھر اس کے بعد؟‘‘

’’یہاں پھر نہیں ہوتا اور نہ پہلے اور بعد میں کوئی فرق ہے۔‘‘

’’ اور میرا ماضی، میری تاریخ۔ میری تہذیب؟‘‘

’’یہاں ماضی ہے نہ حال اور نہ مستقبل۔ تاریخ و تہذیب کا تصور اس گرداب میں لایعنی ہے‘‘

’’ اور حسن اور خوشی اور جذبے اور زندگی؟‘‘

’’سب باطل‘‘

’’ اور حرکت، محنت، عمل، ترقی؟‘‘

’’لا حاصل۔‘‘

’’یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ ایک سنگین مذاق ہے۔‘‘

’’یہی مقدر ہے۔‘‘

’’میں نہیں مانتا۔ میں اپنے پانیوں کو الگ کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تمہارے پانی؟‘‘

’’ہاں میرے پانی۔ میں انہیں پہچان سکتا ہوں۔‘‘

اور مجھے یاد آتا ہے

وہ ساحل کی ریت پر قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔ سمندر اسے ہمک ہمک کر اور میں سہم سہم کر سمندر کو دیکھتا تھا۔ میں سمندر دیکھنے آیا تھا مگر وہ مجھے دیکھنے نہیں دیتی تھی۔ بار بار سامنے آ جاتی اور اسے اپنی اوٹ میں چھپا دیتی تھی۔ وہ میرے ساتھ آئی تھی مگر سمندر کے کنارے پہنچتے ہی اتنی تبدیل ہو گئی تھی کہ لگتا تھا ابھی چھلک جائے گی

’’آؤ پانی میں اتریں۔‘‘ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پانی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ مجھے شرارت سوجھ رہی تھی

’’تم پانی میں نہ اترنا پلیز‘‘

’’کیوں کیا ہے مجھے؟‘‘

’’تمہیں تو کچھ نہیں اور نہ ہو گا سمندر میں طغیانی آ جائے گی۔‘‘

وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اس کی جگمگاتی ہنسی کی آواز سمندر کے پانی پر دور تک دکھائی دیتی رہی،پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ایک لہر آئی تھی اور ہمیں گدگدا

کر واپس چلی گئی تھی۔ یقیناً وہ لہر کسی نہ کسی صورت میں کہیں نہ کہیں اب بھی موجود ہو گی

مجھے یاد آتا ہے۔

ہم سکوٹر پر سوار پہاڑ پر جا رہے تھے کہ ہمیں بارش نے آ لیا اور ہمیں بھگو کر نیچے ندی میں اتر گئی تھی۔ بارش میں بھیگ اور دھل کر وہ اور نکھر آئی تھی اور قوس قزح بن گئی تھی۔ قوس قزح سے آلودہ پانی بھی یقیناً یہیں کہیں ہو گا اور وہ پانی بھی جو ہماری موجودگی میں دیوداروں سے گھرے آبشار سے گرتا رہا تھا اور دریا کا وہ پانی بھی جس پر میں اسے کئی برس تک فراقیہ چٹھیاں لکھتا رہا تھا

''مجھے میرے پانیوں کا حساب چاہیے''

''تم پھر بھول گئے یہ وہ سمندر نہیں ہے''

''تو پھر یہ کون سا سمندر ہے؟''

''اس کا کوئی نام نہیں لیکن اگر تم اپنی آسانی کے لیے سمندر کہنا چاہتے ہو تو سمندروں کا سمندر کہو۔ بحر بے کنار سمجھو۔''

'' اور وہ سمندر؟''

''اس بحر عظیم میں وہ ایک قطرہ ہے''

'' اور وہ قطرہ جو مجھے رخصت کرتے وقت ایک بار اس کی آنکھ سے ٹپکا تھا؟''

وہ ہنستا ہے اور ہنستا ہی چلا جاتا ہے مجھے اس کی ہنسی یاد آ جاتی ہے

''دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانے نکلے حسن انار وچوں۔''

مجھے یاد آتا ہے۔ اس نے کہا تھا جوگی تم جھوٹ کہتے ہو۔ گئے وقت کو کون واپس لا سکتا ہے اور بچھڑے ہوؤں کو ملا سکتا ہے۔ اور وہ اس وقت تک نہیں جانتی تھی کہ وہ جوگی میں خود ہوں اور وقت کی طرح سنگدل نہیں ہوں۔

پھر مجھے یاد آتا ہے۔ جب میں عزت بیگ تھا اور چناب کے کنارے بیلے میں بھینسیں چراتا تھا۔ مجھے تیرنا اور غوطہ لگانا آتا تھا اور میں تند لہروں کے منہ سے اس کے لیے مچھلی چھین لاتا تھا مگر ۔۔اس رات۔۔ اس نے منع کر دیا تھا اور حالانکہ وہ تیرنا نہیں جانتی تھی وہ طوفانی پانی میں اتر گئی تھی۔۔ اور کہتے تھے بہتا ہوا پانی اوپر اچھالتا اور رکا ہوا پانی نیچے دباتا ہے۔ لیکن اسے بہتا ہوا پانی بہا لے گیا تھا اور وقت نے مجھے ٹھہرے ہوئے پانی کا جوہڑ بنا دیا۔ جہاں سے بوند بوند بھاپ کی صورت نکل بھاگنے میں میرا پورا جنم صرف ہو گیا تھا۔

مجھے یاد آتا ہے ہزاروں لاکھوں برس پہلے ہم ایک ساتھ چلے تھے مگر ہر زمانے میں ہمیں ایک دوسرے کے قریب رہنے کے لئے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا رہا تھا۔ روحانی اور جسمانی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ زہر پھانکنے اور دریا میں کود جانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ سانپوں سے ڈسوایا اور درندوں کے آگے پھینک دیا جاتا تھا۔ قبر میں زندہ گاڑ اور دیواروں میں چن دیا جاتا تھا اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہمارے درمیان اجنبیت کی بلند دیوار اٹھا دی گئی تھی اور ہم ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے سے قاصر تھے اور ہمیں ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کے لیے اپنی قیمتی اور مختصر زندگی کے بہت سے سال ضائع کرنے پڑے تھے۔

مجھے یاد ہے ہمارے گھر کے پچھواڑے میں جامن کا ایک پیڑ تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس پر آسیب رہتا ے جو خوبصورت اور نوخیز لوگوں کو چمٹ جاتا ہے۔ ہر سال پیڑ جامنوں سے لد جاتا تھا مگر کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا۔ جامنوں کے بوجھ سے نرم لچکیلی شاخیں جھکنے لگتیں۔ ٹہنیوں سے لگی لگی جامنیں سوکھنے اور سڑنے لگتیں مگر کوئی اتارنے نہ آتا اور میں پوری بستی میں پہلا شخص تھا جس نے فیصلہ کیا تھا کہ جامن کو آسیب کے قبضہ سے واگزار کرایا جائے مگر جب میں نے اس کا پھل چکھا تو جامن کا ایک پیڑ میرے اندر اگنے لگا اور برسات سے پہلے ہی ساری ٹہنیاں ہری اور لال جامنوں سے لد گئیں

مجھے یاد آتا ہے۔

ہر سال دریا بند توڑ کر گھروں، آنگنوں، کھیتوں اور گلیوں میں آ جاتا اور جاتے ہوئے بہت کچھ اپنے ساتھ بہا لے جاتا تھا۔ سامان، اناج، مویشی اور آدمی۔ اور جب پانی اترتا تھا تو بعض کھوئی ہوئی چیزیں اچھی یا بری حالت میں مل بھی جاتی تھیں۔ مگر ایک بار دریا بستی کی سب سے قیمتی چیز بہا کر لے گیا اور قیمتی چیزیں کون واپس کرتا ہے۔ پانی اترا تو اس کی ہر جگہ تلاش ہوئی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ بستی کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی امدادی کشتی میں سوار ہو کر چلی گئی تھی مگر مجھے معلوم تھا وہ اپنے قدیم آبائی گھر چلی گئی تھی اور کسی دوسرے زمانے میں میرا انتظار کرتی تھی۔

اور موسم آتے جاتے رہے۔

جامنیں پکتی اور سڑتی رہیں۔

اور دبلی گائیں ساری فربہ گایوں کو اور سوکھے خوشے ہرے بھرے خوشوں کو کھا گئے۔

اور پھر کئی برسوں یا شاید صدیوں کے بعد جیسے کسی نے مجھے خنجر بھونک دیا۔
’’وہ زندہ ہے۔‘‘

اور میرے اندر کوئی گردان کرنے لگا۔ ’’وہ زندہ ہے میں زندہ ہوں تو زندہ ہے ہم زندہ ہیں۔‘‘

اور میں تو یہ بتانا تو ہی بھول گیا کہ کھو جانے سے پہلے اس کے حسن کا دور دور تک شہرہ تھا اور اسے قدرت کا حسین شاہکار خیال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بستی میں اس کی موجودگی میں چراغ جلانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور اسے ہر صبح پھولوں سے تولا بھی نہیں جاتا تھا۔ مگر بستی میں ساری رونق، روشنی اور چہل پہل اسی کے دم سے تھی۔

مجھے یاد آتا ہے میں اسے دیکھ کر لرز گیا تھا۔

مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ سچ مچ وہی ہے۔

اسے دیکھ کر وقت کی سفاکی اور انسان کی بے مائیگی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ میں اسے اس حال میں دیکھوں گا۔ اس کا میں نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ مجھے وہ لہلہاتے دن یاد آئے تھے جب وہ محض دیکھنے سے گلابی عنابی ہو جاتی اور چھو لینے سے اس کے جسم میں برقی رو دوڑ جاتی تھی۔ مگر اب لگتا تھا جیسے کسی نے پیچھے سے مین سوئچ بند کر دیا ہو۔

اور اس نابینا بڑھیا کی پکار سن کر یوسف گھوڑے سے اتر آیا اور اسے پہچان کر رو پڑا۔

یوسف پچھے دس زلیخا حسن کتھے اج تیرا

کہے زلیخا ہجر رڑھایا ہتھ نہ پہتا میرا

یوسف پچھے دس زلیخا کتھے لب دی لالی

کہے زلیخا جال سدھائی لاٹ فراقاں والی

یوسف پچھے دس زلیخاں زلفاں کدھر گیاں

کہے زلیخا۔۔

یوسف پچھے۔۔

وہ ایک قلعہ نما عالی شان عمارت تھی اور وہ وہیل چیئر میں پتھرائی پڑی تھی وہ بول سکتی تھی نہ سن سکتی تھی اور نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتی تھی۔

اس کی ایک آنکھ خشک تھی اور دوسری میں آنسو بس امنڈنے ہی والا تھا۔ اور تب سے۔۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ کون سا وقت اور مقام ہے۔ دن ہے نہ رات۔ اندھیرا ہے نہ اجالا۔ طلوع ہے نہ غروب۔ یوں لگتا ہے جیسے

آگے پیچھے دائیں بائیں پانی ہی پانی ہے۔ بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ پانی جو گرم ہے نہ سرد اور جس کے حرکت کرنے یا رکے ہوئے ہونے کا بھی پتہ نہیں چل رہا۔

* * *

زوال کے اسباب

کھدائی کا کام برابر جاری ہے۔

اور نت نئی چیزیں سامنے آ رہی ہیں۔

اس لئے ماہرین کسی حتمی نتیجے پر پہنچے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ مثلاً پہلے ان کاخیال تھا کہ وہ غذا کی قلت کا شکار ہو گئے تھے لیکن جب مزید کھدائی کے بعد اناج جسے بھرے ہوئے گودام دریافت ہوئے تو ماہرین شش و پنج میں پڑ گئے۔

ماہرین کی کمیٹی کے ایک ممتاز رکن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ لوٹ مار اور چوری ڈکیتی اس زمانے میں عام تھی اور گھر میں، غذائی اجناس اور خوبصورت عورتوں کو رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لئے خوبصورت عورتوں کی شکلیں بگاڑ دی جاتی تھیں یا ان کے دام وصول کر لئے جاتے تھے۔ نقدی اور غذائی اجناس کے بڑے بڑے بینک قائم ہو گئے تھے لوگ سال بھر کا غلہ ان بینکوں میں جمع کرا دیتے تھے۔ لیکن ان بینکوں کا حساب و کتاب کسی ایسی اجنبی زبان میں لکھنے کا رواج تھا جو ان لوگوں کی بولنے کی زبان سے بے حد مختلف تھی۔ بعض اوقات لکھنے والا خود بھی اپنا لکھا ہوا نہیں پڑھ سکتا تھا ا لئے غذا کے اکاؤنٹ ہولڈروں کو غذا حاصل کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتی تھیں، یہی ممتاز رکن رپورٹ میں آگے جا کر لکھتا ہے کہ اجنبی زبان کی تحریوں کو پڑھنے کے لئے بینک کے عملے کو بڑی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ انہیں موٹی موٹی لغاتیں اور امدادی کتابیں درکار ہوتی تھیں۔ جن کی مدد سے وہ متعلقہ بھی لتے تھے۔ بعض اوقات فائل میں درج تشریحوں، وضاحتوں اور منافع کی شرائط وغیرہ پڑھنے میں اتنے لگ جاتے تھے کہ اکاؤنٹ ہولڈر یا اس کا کنبہ غذا کی قلت کا شکار ہو جاتا تھا۔ رپورٹ میں اس بات کے امکان کا ذکر بھی ملا ہے کہ بینک کے گوداموں میں پڑی پڑی اجناس گل سڑ کر زہریلی ہو گئیں اور ان سب کی ہلاکت کا سبب بنیں۔

پھر کچھ ماہرین نے یہ خیال پیش کیا کہ وہ بھوک سے نہیں کسی وبائی بیماری کے نتیجے میں ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن پھر اسی بیماری سے بچاؤ کے ٹیکے اور تیر بہدف دوائیوں کے بڑے برے ڈرگ اسٹورز دریافت ہوئے تو ماہرین میں پھر اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ وبائی امراض سے بچاؤ کے ٹیکے اور تیر بہدف دوائیاں چند ایک لوگوں کے پاس نقدی ختم ہو گئی تو وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔

ان کی بے کفن لاشیں سڑتی رہیں۔ جس سے فضا میں ایک نہایت مہلک مرض کا زہر پھیل گیا اور اس وقت تک اس مہلک مرض کی دوا ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

یہ سب امور ابھی زیر بحث ہیں کہ ایک روز بات نے ماہرین کو پریشان کر دیا ہے۔ شہر کے مختلف حصوں سے حاصل کی گئی کھوپڑیوں کی لیبارٹری رپورٹ ان کے سامنے ہے اور وہ کئی روز سے نئی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ ایک ہی عہد کی ان کھوپڑیوں میں اس قدر فرق کیوں ہے۔

اگر کھوپڑیاں کھدائی کے وقت ملبے کی مختلف سطحوں (LAYERS) سے برآمد ہوئی ہوتیں تو یہ امر اس قدر حیران کن نہ ہوتا مگر صورت حال اس کسے بالکل مختلف ہے۔ یہاں تک کہ ان دو کھوپڑیوں کے درمیان بھی نشوونما اور ارتقاء کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے جو گودام کے ایک دروازے کے اندر اور باہر سے بیک وقت برآمد ہوئی ہیں۔

رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی زندگی کے ارتقاء کے ابتدائی دور سے لے کر زوال کے دن تک ہر صدی کے لوگ اس شہر میں ایک ساتھ زندہ تھے۔ اڑن کھٹولہ قسم کی چیز کے قریب سے جو کھوپڑی حاصل کی گئی ہے اس کے اور گدھا گاڑی کے قریب سے ملنے والی کھوپڑی میں ارتقائی لحاظ سے صدیوں کا بعد ہے حالانکہ رپورٹ سے صاف ظاہر ہے کہ گدھا گاڑی والے انسان کی موت ارن کھٹولہ قسم کی چیز گرنے ار ٹکرانے سے ہوئی تھی۔

تو کیا وہ سب ذہنی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہوئے بھی جسمانی طور پر ایک ہی عہد کے لوگ تھے؟ ماہرین کی کمیٹی کے سربراہ کا خیال ہے کہ اسی ایک نکتے سے شہر کے زوال کے اسباب کا صحیح صحیح کھوج لگانے میں کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

***

تشکر: محمد حمید شاہد جن سے ان پیج فائل فراہم ہوئی

ان پیج سے تبدیلی، تدوین اور ای بک کی تشکیل: اعجاز عبید